جولائی ـ ستمبر ۲۰۱۴

اُردو ادب میں عالمی معیار کا تحقیقی و تخلیقی مجلّہ

سہ ماہی

الاقرباءٔ
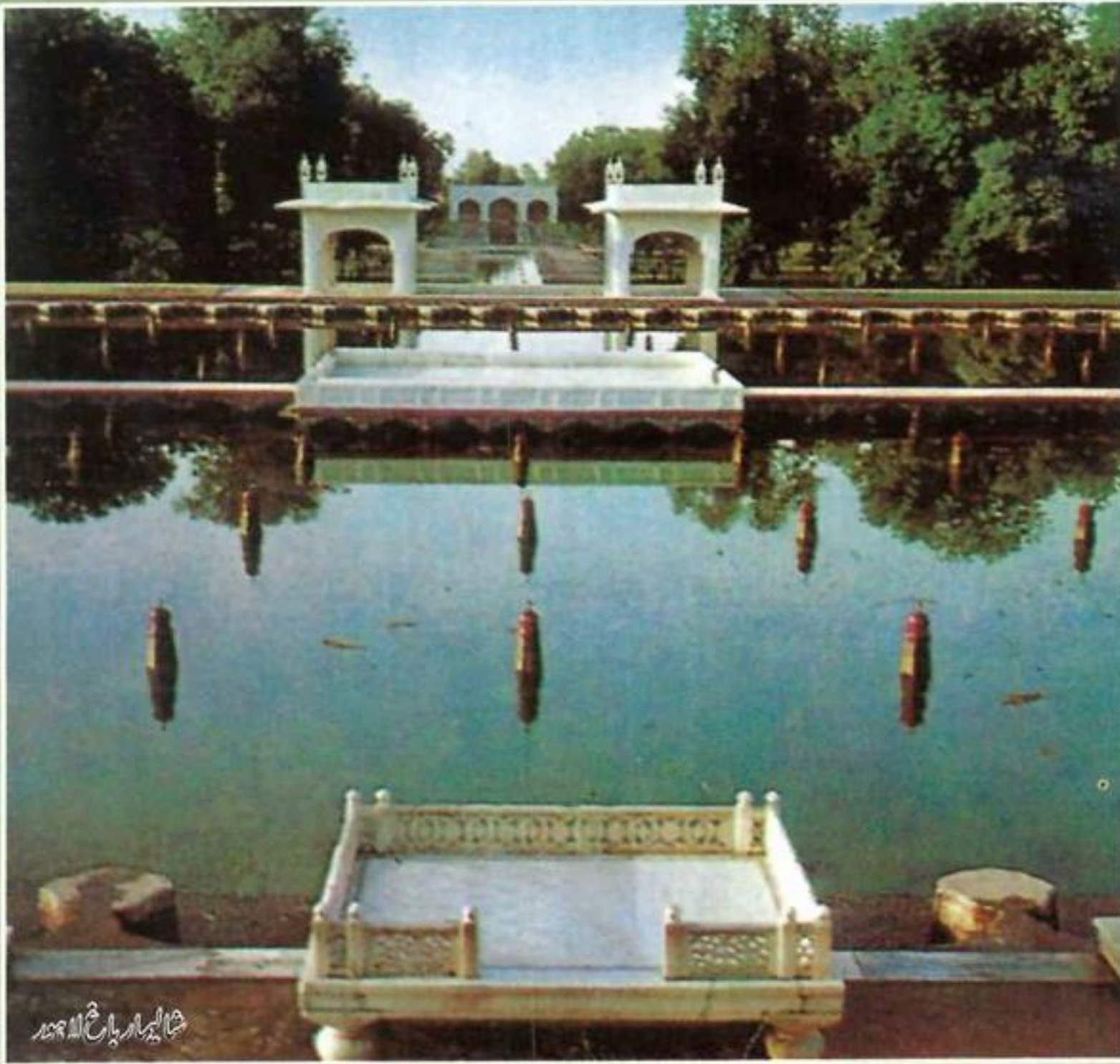
اسلام آباد

(اداریہ ص ۶)

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

سہ ماہی **الاقرباء** اسلام آباد

(تہذیب و معاشرت، علم و ادب اور تعلیم و ثقافت کی اعلیٰ قدروں کا نقیب)

جلد نمبر ۱۷ شمارہ نمبر ۳ جولائی۔ستمبر ۲۰۱۴ء

الاقرباء فاؤنڈیشن، اسلام آباد

مکان نمبر ۴۶۴، سٹریٹ نمبر ۵۸، آئی ۸/۳، اسلام آباد (پاکستان)

Ph.051-4442686 Fax 051-2221670

website www.alaqreba.com

E-mail alaqreba@hotmail.com

بیرسٹر سلیم قریشی

2-A Barclay Chamber, Barclay Road, Leytonstone
London, E-11. 3 DG(U.K.)
Phone (0208)5582289, Fax (0208)5583849
Email: Barqureshi@ hotmail.co.uk

محمد اویس جعفری

3202, 140th street, SE
Mill Creek WA 98012- 46(USA)
Phone: (001) 425-385-8666
E-mail: Jafreyomi@gmail.com

زرِ تعاون

فی شمارہ	۲۵۰ روپے
سالانہ (مع محصول ڈاک)	۱۰۰۰ روپے
بیرون ملک فی شمارہ (مع محصول ڈاک)	۱۰ / ڈالر ۷/ پاؤنڈ
بیرون ملک سالانہ (مع محصول ڈاک)	۴۰ /ڈالر ۳۰/ پاؤنڈ

کوائف نامہ

شمارہ	جولائی۔ستمبر ۲۰۱۴ء
کمپوزنگ	محمد انور چوہدری
طابع	ضیاء پرنٹرز، اسلام آباد
ناشر	سیّد ناصرالدین

مندرجات

نمبر شمار	عنوان	مصنف	صفحہ
	قومی ورثہ اور قومی تشخص ۔۔ بین الاقوامی تناظر میں	ادارہ	۶
	مضامین و مقالات		
۱	اُرخان کی فتوحات (سلطنت عثمانیہ)	محمد طارق غازی	۱۰
۲	اُردو زبان کے رسم الخط کے مسائل	پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اَر	۳۴
۳	علی سردار جعفری کی غزلیہ شاعری	پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد	۴۷
۴	اردو ادب کے اولین نقاد ۔ مولانا باقر آگاہ ویلوری	ڈاکٹر جاوید حبیب	۵۸
۵	ابوالطاہر فدا حسین فدا ۔۔ ایک ممتاز تاریخ گو	سید انتخاب علی کمال	۶۶
۶	نیساں اکبر آبادی کی تاریخ گوئی	ڈاکٹر ابرار عبدالسلام	۸۲
	اقبالیات		
۷	فلسفۂ مغرب اور اقبال	پروفیسر سیدہ نغمہ زیدی	۱۰۰
۸	اقبال کی متصوفانہ فکر	ڈاکٹر مظہر حامد	۱۱۲

یادِ رفتگاں

۹	محسن بھوپالی	پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر علی رانا	۱۲۱
۱۰	پروفیسر انیتا غلام علی	پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر علی رانا	۱۲۴
۱۱	محسن احسان کی غزل کا فکری و فنی جائزہ	ڈاکٹر قاسم جلال	۱۳۱
۱۲	شہریار کی غزل	سرور عالم راز سرور	۱۵۰
۱۳	احمد فراز ۔ انسانی رویوں کا نبض شناس شاعر	محمد فیصل مقبول عجز	۱۶۱

انشائیہ ۔ افسانہ ۔ کہانی

۱۴	جنرل فوبیا (انشائیہ)	سلیم زاہد صدیقی	۱۶۸
۱۵	اکیلا آدمی (افسانہ)	آصف الرحمٰن طارق	۱۷۴
۱۶	خالہ شبو (افسانہ)	شمع سیّد	۱۸۲
۱۷	گنّے کے کھیت (کہانی)	ڈاکٹر احمد اعجاز الدین رحمت علی	۱۸۸

متفرقات

۱۸	رپورٹ الفرو ایشین رائٹرز کانفرنس	ڈاکٹر عالیہ امام	۲۰۶

۱۹ حمد و نعت ۲۰۸

محمد اویس جعفری۔ خواجہ شفیق احمد فاروقی۔ شفق ہاشمی۔ ماہر اجمیری۔
رشید آفریں۔

۲۰ غزل ۲۱۳

محمد طارق غازی۔ مضطر اکبر آبادی۔ محشر زیدی۔ پرتو روہیلہ۔ مشکور حسین یاد۔
عقیل دانش۔ صابر عظیم آبادی۔ ڈاکٹر سید قاسم جلال۔ شفق ہاشمی۔ حسن عسکری کاظمی
کرامت بخاری۔ سلیم زاہد صدیقی۔ فیصل مقبول عجز

۲۱ نظم ۲۲۷

ڈاکٹر سید قاسم جلال۔ شفق ہاشمی۔ پروین شیر۔ اویس جعفری۔ اویس الحسن

۲۲ رباعی ۲۳۳

صابر عظیم آبادی

۲۳ نقد و نظر ۲۳۴

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا۔ سیّد منصور عاقل۔

۲۴ **مراسلات** ۲۷۰

بیرسٹر سلیم قریشی۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد اسلم زاہد۔ قاضی محمد بشیر۔ محمد طارق غازی۔
سیدہ نغمہ زیدی۔ عثمانہ اختر جمال۔ نزہت اختر حنیف۔ کرامت بخاری۔
فرخ جمال ملیح آبادی۔ ڈاکٹر مظہر حامد۔ محمد فیصل مقبول عجز۔ صابر عظیم آبادی۔
نوید سروش۔ ڈاکٹر احمد اعجاز الدین رحمت علی۔ شمع سیّد

خبرنامہ الاقرباء فاؤنڈیشن

۲۵	احوال وکوائف	شہلا احمد	۲۸۹
۲۶	گھریلو چٹکلے	بیگم طیبہ آفتاب	۲۹۵

قومی ورثہ اور قومی تشخص ۔ بین الاقوامی تناظر میں

بانیٔ پاکستان حضرت قائداعظمؒ نے قوم سے اپنے ایک خطاب میں فرمایا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے مملکتِ پاکستان کو لامحدود وسائل سے نوازا ہے انھیں بروئے کار لانا قوم کا اولین فرض ہے۔ دوسری تقاریر میں بھی، منجملہ دیگر، بابائے قوم نے جن اہم ترین امور پر توجہ مرکوز فرمائی اُن میں نومولود مملکتِ اسلامیہ کی نظریاتی اساس۔ تہذیب وتمدن وثقافت نیز قومی زبان اور ملک کے مخصوص جغرافیائی محل وقوع کے طفیل قدرت نے جس تاریخی ورثے کی امانت قوم کو سونپی تھی وہ سب قومی تشخص کے اجزائے ترکیبی کے طور پر ان کے پیش نظر تھے۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد وجود میں آنے والے بین الاقوامی ادارے یعنی 'انجمن اقوام متحدہ' کا پاکستان کو بحیثیت ایک آزاد وخود مختار مملکت رکن بننے کا اعزاز حاصل ہوا۔ یہ ادارہ اس اعتبار سے اپنی پیشرو تنظیم ''لیگ آف نیشنز'' سے مختلف اور ممتاز حیثیت کا حامل ہے کہ اس کے بنیادی مقاصد، بلکہ فرائض' میں حقوقِ انسانی کا تحفظ اور رکن ممالک کے مشترکہ تہذیبی وثقافتی اساس کے استحکام اور فروغ و ارتقاء سے متعلق معاہدوں (Conventions and covenants) کا وسیع المقاصد نظامِ کار موجود ہے جس پر عمل درآمد کے لیے عالمی ادارہ متعلقہ ممالک کو امداد واعانت مہیا کرنے کا پابند ہے۔

چنانچہ اس ضمن میں عالمی ورثہ کمیٹی (World Heritage Committee) تشکیل دی گئی جو اکیس (۲۱) ممالک کے اراکین پر مشتمل ہے جنھوں نے عالمی ورثہ کنونشن ۱۹۷۲ء (World Heritage Convention 1972) پر دستخط کیے ہیں۔ لہٰذا ایسے ممالک کو استحقاق حاصل ہے کہ وہ اپنے ایسے مقامات کو جو قومی ورثہ کی حیثیت رکھتے ہیں اُنھیں عالمی ورثہ کی فہرست میں شامل کرا سکتے ہیں۔ فہرست میں شامل ہونے کے بعد وہ ملک بین الاقوامی امداد و

اعانت اور تحفظ کے حقدار بن جاتے ہیں جس کے نتیجہ میں، دیگر فوائد کے علاوہ، سیاحت کو بھی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ ہمیں علم نہیں کہ پاکستان نے ۱۹۷۲ء کے کنونشن پر دستخط کیے ہیں یا نہیں لیکن اس موضوع کی طرف ہماری توجہ مبذول کرانے کا سبب ذرائع ابلاغ کے توسط سے ہم تک پہنچنے والی وہ خبر بنی کہ گذشتہ ماہِ جون ۲۰۱۴ء کو دوحہ (قطر) میں عالمی ورثہ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا جس میں شاہراہِ ریشم کے چین، قازقستان و کرغزستان سیکشن کو عالمی ورثہ کے طور پر فہرست میں شامل کرنے کی منظوری دی گئی۔ یہ فیصلہ تینوں متعلقہ ممالک کی درخواست پر کیا گیا جو شاہراہِ ریشم کے پانچ ہزار کلومیٹر طویل حصہ پر نافذ العمل ہوگا۔ لہٰذا اس شاہراہ پر واقع جن اہم مقامات کو عالمی ورثہ قرار دیا گیا اُن میں بائیس مقامات چین میں، آٹھ قازقسان میں اور تین کرغزستان میں واقع ہیں چنانچہ عالمی ورثہ میں شمولیت کے بعد یہ مقامات تاریخی حیثیت اختیار کر لیں گے اور عالمی ادارہ ان کے تحفظ کا ذمہ دار ہوگا۔

شاہراہِ ریشم کو 'شاہراہِ دوستی' سمجھا جاتا ہے اور اس شاہراہ سے وابستہ ممالک میں پاکستان کو ایک نہایت اہم مقام حاصل ہے۔ ایسی صورت میں ہمیں یقین ہے کہ ہماری وزارتِ خارجہ کے اربابِ خبر مذکورہ کمیٹی کی رکنیت کی اہم ضرورت و اہمیت سے بے خبر نہیں ہوں گے اور پاکستان یہ رکنیت حاصل کر چکا ہوگا لیکن ہمیں تعجب اور افسوس اس امر پر ہے کہ پاکستان میں بے شمار تاریخی مقامات ایسے ہیں جنھیں عالمی ورثہ قرار دیا جا سکتا ہے جس کے نتیجہ میں نہ صرف شاہراہوں کے نظام میں وسعت پیدا ہو سکتی ہے بلکہ سیاحت کا شعبہ زرِ مبادلہ کے بے پناہ حصول کا ذریعہ بن سکتا ہے اور ہمارا قومی تشخص عالمی سطح پر مزید توجہ اور احترام حاصل کر سکتا ہے۔ وطنِ عزیز میں تاریخی اعتبار سے ایسے پُرشکوہ مقامات کی کمی نہیں جو عالمی ورثے کی قدر و قیمت کو دوچند کر سکتے ہیں۔ کیا موئنجو ڈرو۔ ہڑپہ۔ ٹیکسلا۔ بدھ عہد کے آثارِ قدیمہ۔ تخت بھائی۔ قلعۂ لاہور۔ شالیمار باغ لاہور۔ مکلی اور ٹھٹھہ کی تاریخی عمارات اور قلعۂ رہتاس وغیرہ ایسے مقامات نہیں جو عالمی ورثہ کے معیار پر پُورے نہ اُترتے ہوں۔ یہی نہیں بلکہ بین الاقوامی تناظر میں پاکستان کے واجب التعظیم

تشخص کے ضامن ہیں۔

یہ بھی درست ہے کہ پاکستان میں وفاقی اور صوبائی سطح پر ایسے ادارے موجود ہیں جن کے فرائض میں قومی ورثہ کا تحفظ اور داشت و پرداخت شامل ہے۔ محکمہ آثارِ قدیمہ جو عجائب گھروں (Museums) کو قومی ورثہ سے متعلق نادر و تاریخی اشیاء سے آراستہ کرنے کا ذمہ دار ہے، پاکستان نیشنل کونسل آف دی آرٹس، نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹس جس کے دائرۂ کار میں ڈرامہ۔ موسیقی اور رقص شامل ہیں، لوک ورثہ کا ادارہ جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہے کہ عوامی اور روایتی ورثہ پر تحقیقاتی عمل کے ذریعہ مقامی تہذیب و ثقافت کے نادیدہ گوشوں کو منظرِ عام پر لائے اور وفاقی وزارتِ اطلاعات و نشریات جو قومی ورثہ کی وزارت بھی ہے اُس کے فرائض میں شامل ہے کہ وہ متعلقہ محکموں کو با مقصد و بامعنی رہنمائی مہیا کرے بلکہ عالمی سطح پر بھی پاکستان کی قومی شناخت کے عوامل و عناصر کو متعارف کرائے۔ مقام افسوس ہے کہ ملک میں ان اداروں کا ایک باقاعدہ نظام کار موجود ہونے کے باوجود پاکستان کو اقوامِ عالم میں اپنے تاریخی ورثہ کی کثیر الجہتی اور ثروت و عظمت کے باوجود وہ پہچان حاصل نہیں ہوسکی جو اس کا حق تھا البتہ تفننِ طبع اور ضیافتِ نظر کے لیے صرف مقامی سطح پر رقص و سرُود کی محفلوں میں تو دادِ عیش دی جاتی رہی ہے لیکن مملکتِ اسلامیہ میں موجود عالمی معیار کے ورثہ کو متعارف کرانے کی سنجیدہ کوششیں تاحال نظر نہیں آئیں۔ اس ناقابلِ درگزر کوتاہی کی ذمہ داری تمام تر متعلقہ وزارت پر عائد ہوتی ہے جس کے اربابِ خبر کی خبر لینا نہایت ضروری ہے کہ اگر پاکستان اب تک عالمی ورثہ کی باوقار کمیٹی کا اب تک رکن نہیں بنا ہے تو کیوں؟ اور اگر پاکستان عالمی ورثہ کنونشن ۱۹۷۲ء کے اُن اراکین میں شامل ہے جنھوں نے دستخط کیے ہیں تو وفاقی وزارت وضاحت کرے کہ اُس نے پاکستان کے منفرد و نادر تاریخی ورثہ کو عالمی سطح پر متعارف کرانے کے لیے کیا اقدامات کیے ؟

پاکستان کے آئین میں اٹھارویں ترمیم کے ذریعہ اختیارات کے سیلِ رواں کا رُخ جس طرح صوبوں کی طرف موڑا گیا ہے اُس کے نتیجہ میں ہمارے نظامِ تعلیم سے قومی وحدتِ فکر ختم ہو کر

رہ گئی ہے اُس کے دلخراش شواہد تو سامنے آچکے ہیں لیکن قومی ورثہ کے حوالے سے بااختیار صوبائی اداروں کی کیا کارکردگی ہے۔ وہ نظر نہیں آئی۔ اس کے برخلاف اگر صورتِ حال کا جائزہ لیا جائے تو ہمارے آثار قدیمہ مجرمانہ عدمِ توجہی کے باعث روبہ زوال دکھائی دیتے ہیں

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

مکتبہ اتحادالمصنفین کی مطبوعات

نمبر شمار	نام کتاب	موضوع	مصنف/مولف	سال اشاعت	قیمت
۱	برگ سبز	ادبی تحقیق	سیّد منصور عاقل	۱۹۹۲ء	۲۰۰ روپے
	مکتب داغ کے قادرالکلام شاعر سید عبدالوحید فدا گلاوٹھی کے فکروفن پر تنقیدی جائزے				
۲	دبستان قابل۔ سوانح۔ انتخاب کلام		قابل گلاوٹھوی مرتبہ سید منصور عاقل	۲۰۰۰ء	۵۰۰ روپے
۳۔	گلاوٹھی		سیّد منصور عاقل	۱۹۹۸ء	۲۵۰ روپے
	جنگ آزادی ۱۸۵۷ء میں انگریزی استعمار کے خلاف سادات گلاوٹھی کا مزاحمتی کردار)				
۴	حرف محرمانہ	شخصیت۔ فکروفن	سید منصور عاقل	۱۹۹۵ء	۲۰۰ روپے
۵	گہوارۂ سخن	شعری مجموعہ	سید منصور عاقل	۱۹۹۳ء	۲۰۰ روپے
۶	حرف بہ حرف			۱۹۸۲ء	
۷	حرفِ ناتمام	ادبی صحافت	سید منصور عاقل	زیرطبع	
۸	نقدونظر	انتقادیات	سید منصور عاقل	زیرطبع	
۹	سیّد منصور عاقل کی ادبی خدمات	مقالہ ایم۔ فل	تحسین فاطمہ	زیرطبع	

ملنے کا پتہ: مکان نمبر ۱۰۲ سٹریٹ نمبر ۱۱۰ G-11/3 اسلام آباد (پاکستان)

محمد طارق غازی۔ کینیڈا

اُرخان کی فتوحات

(۱۳۲۶_۱۳۵۹)

سلطنت بنی امیہ کے بعد تاریخ عالم کی تمام مسلم حکومتوں میں سلطنت عثمانیہ کی تاریخ کا مطالعہ بہت مختلف نظر کا تقاضہ کرتا ہے یہ سلطنت پہلے دن سے اپنی سیاست اور حکمت عملی میں دیگر مسلم سلطنتوں سے الگ تھی اس لیے وہ اصول جو دیگر مسلم حکومتوں کی تاریخ کے مطالعہ میں درست نتائج دیتے ہیں، سلطنت عثمانیہ کے معاملہ میں غلط فہمیاں پیدا کرنے کا باعث ہو سکتے ہیں اور ایسا ہی ہوا بھی ہے کیونکہ عام مؤرخین نے اس سلطنت کو بھی دیگر مسلم حکومتوں پر قیاس کر کے تجزیے مرتب کئے اور غلط فہمیوں کا شکار ہوئے اور انہیں علمی دنیا میں اور اس کی راہ سے تاریخ کے طالب علموں اور عوام میں رائج بھی کر دیا۔

مسلم تاریخ میں تین ادوار خاصے یکساں ہوئے ہیں۔ پہلا دمشق کے بنی امیہ کا دور (۱۳۲_۴۰/۷۵۰_۶۶۱)، دوسرا اندلس کے بنی امیہ کا زمانہ (۵۲۵_۹۲/۱۱۳۱_۷۱۱)، اور تیسرا سلطنت عثمانیہ (۱۳۴۱_۶۹۸/۱۹۲۳_۱۲۹۹) عیسائیوں سے گاہ بگاہ فوجی مقابلہ اور عموماً سیاسی موالات ان تینوں کی قدر مشترک ہے اور اس خصوص میں بھی بعد کی دو سلطنتوں کو نسبتاً امتیاز حاصل ہے کیونکہ ان کی رعایا کی بھاری تعداد عیسائیوں ہی پر مشتمل تھی البتہ حکمت عملی کے اعتبار سے سلطنت عثمانیہ کو مقابلتاً دونوں اموی سلطنتوں پر برتری حاصل ہے، اگرچہ فکری سطح پر وہ امویان دمشق سے قریب تر نظر آتی ہے اُمویان دمشق اسی بین الاقوامی سیاست کے اصول پر کاربند تھے جس کا نقطۂ آغاز ۸/ ۶۲۹ میں غزوہ موتہ اور سال بھر بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت میں غزوۂ تبوک تھا، اس لیے یہ کہنا درست ہے کہ سلطنت عثمانیہ نے عیسائیوں کے معاملہ میں اسی حکمت

عملی کا احیاء کیا تھا جو ۱۳۲ھ/ ۷۵۰ء کے اس خاندانی یا قبائلی انقلاب میں سیاسی دفتر سے تقریباً محو ہوگئی تھی جو بنی اُمیہ دمشق کے خاتمہ اور بنی عباس بغداد کے آغاز کا عنوان تھا اسی پس منظر میں سلطنت عثمانیہ منفرد تھی۔

ابلاغیہ کے بنائے ہوئے موجودہ معاشرہ میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ غیر ملکوں پر فوج کشی اور ان کی فتوحات پرانے زمانہ کی ظالم حکومتوں کا طریقہ تھا اور عالمی امن اور جنگ و جدال سے اجتناب کے اس زمانہ میں جب اقوام متحدہ کا دارہ ملکوں کے سروں پر بیٹھا ہے بین الاقوامی سرحدوں کی خلاف ورزی کرنا یا ان سرحدوں کو توڑ کر مقامی سیاسی سرداری کو بدل ڈالنا ایک جرم ہے یہ اسی قسم کی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ اس عہد میں ہر قسم کے جرائم ختم ہو گئے اور پولیس کا وجود صرف ناواقف اور اجنبی لوگوں کو راستہ بتانے کے لیے رہ گیا ہے جنگیں آج بھی ہوتی ہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اب جنگوں کی شدت اور ان سے ہونیوالے جانی اور مادی، بلکہ نفسیاتی نقصانات کی شرح پرانے زمانہ کے مقابلہ میں سیکڑوں اور ہزاروں نہیں لاکھوں گنا بڑھ چکی ہے البتہ ان نقصانات پر تاسف کرنے کا رواج اب ختم ہوگیا ہے اور مرگ انبوہ پر سالانہ جشن منانے کی روایت مستحکم ہوگئی ہے قدیم دور میں فوجی فتوحات پر جشن منایا جاتا تھا مگر اس کے طریقے اور اسباب ذرا مختلف ہوتے تھے پھر یہ جشن بھی مختلف فاتحین مختلف انداز میں مناتے تھے۔

دینی تبلیغی نقطۂ نظر کا فرق

عام ترک اس لحاظ سے بھی ایک امتیازی شان رکھتے تھے کہ کسی فتح کے موقعہ پر وہ زمین کے سینے پر یادگاروں کے زخم لگانے کے بجائے اپنے معبود کی بارگاہ میں سربسجدہ ہو جاتے تھے عثمانی ترکوں کی جنگوں کی سیاست اور فلسفہ دیگر قوموں کی جنگوں سے الگ تھا۔

عثمانی ترکوں کی بڑی خوبی یہ تھی کہ بہت سے دیگر مسلم بادشاہوں کے برعکس ان کی فتوحات کا ایک اہم مقصد اللہ کی بات کو دنیا کے زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانا تھا جس کا حکم اللہ کی کتاب اور اس کے آخری رسول کی تعلیمات میں موجود تھا یہ ایک عمرانی مسئلہ تھا جو عقیدہ کی اساس پر مرتب ہوا تھا۔

یورپ کے معاملہ میں عثمانی ترک اسلامی تبلیغی اصول پر عمل کر رہے تھے جو مقابلتاً دیگر ادیان کے تبلیغی دائرۂ عمل میں بہت مختلف انداز میں سامنے آتا ہے اس سے قطع نظر کہ دیگر، بالخصوص آسمانی مذاہب، میں آخرت کا کیا تصور ہے، اسلام میں قیامت اور اس دن ہونے والے سوال جواب نیز عدل کا ایک بہت واضح عقیدہ پایا جاتا ہے اس دن اسلامی عقیدہ کے مطابق جب تمام انسان اللہ کی بارہ گاہ میں پیش ہوں گے اور ان سب سے دین، معبود کی وحدانیت، رسولوں پر اور آخری رسولؐ پر ایمان وغیرہ کے بارے میں سوال کیا جائے گا تو ان سب لوگوں کا ایک عمومی جواب ہوگا کہ ان معاملات میں انہیں کچھ واقفیت نہیں ہے اور وہ خاص طور سے اپنے ہم عصر مسلمانوں کو الزام دیں گے کہ انہوں نے رسم وراہ رکھنے کے باوجود انہیں یہ سب نہیں بتایا تھا، اور اگر ان امور سے واقف مسلمان یہ سب باتیں انہیں بتاتے تو وہ ضرور ان باتوں کو قبول کر لیتے۔ چنانچہ میدان حشر کا یہی امکانی مکالمہ اسلامی اصول تبلیغ کی بنیاد ہے اور اسی لیے ایک عمرانی اصول کے طور پر تمام انسانوں تک یہ حقائق پہنچا دینا مسلمانوں کی اجتماعی اور انفرادی ذمہ داری ہے۔

عثمانی ترک اجتماعی طور پر یہی کام کر رہے تھے ان کے دور میں اجتماعی رابطہ کے ذرائع محدود تھے مسلمان تاجروں، سیاحوں اور صوفیوں نے اس سلسلہ میں بہت کام کیا تھا اور دنیا کے بہت سے خطوں میں ان کی مساعی سے معاشرتی اور اعتقادی انقلابات آئے تھے لیکن ان انقلابات کے مثبت نتائج کی ایک بنیادی شرط مخاطب کے مزاج میں پذیرائی اور ان امور پر معقول انداز میں غور وفکر کی صلاحیت بھی تھی جنوب مشرقی جزائر، شمال مشرقی چین، ماوراء النہر، خراسان و فارس، شمال مشرقی اور جنوب مشرقی افریقہ کے باشندوں، نیز ہندوستان میں معاشرہ کے مظلوم طبقات کے مزاجوں میں ایسی صلاحیت زیادہ تھی جنوبی ایشیا کے مظلوم طبقات میں یہ تعلیمات زیادہ پسند کی گئیں ان ملکوں میں بڑی تعداد نے مسلمانوں کی پیش کردہ تعلیمات کو بلا جبر اور بغیر زبردستی کے قبول کر لیا تھا تاہم یہ بھی حقیقت واقعہ ہے کہ ان علاقوں کے باشندوں کی بڑی تعداد اپنے آبائی دین پر قائم رہی اور کسی مقامی مسلم حکومت نے ان سے کوئی تعارض نہیں کیا، کیونکہ حق بات کو لوگوں تک پہنچا دینے کے بعد یہ بھی اسلامی اصول تبلیغ کا ایک ناقابل ترمیم اور ناقابل تنسیخ قرآنی قانون ہے

دین میں جبر اور شخصی آزادی کے اصول

ان حقائق کی روشنی میں واضح ہو جاتا ہے کہ اگر کسی قسم کا جبر یا مادی لالچ کا کوئی عنصر اسلامی تعلیمات کو پھیلانے میں استعمال کیا جاتا تو چین، تھائیلینڈ، برما، ہندوستان، مشرقی اور جنوب مشرقی افریقہ ہی نہیں شمالی عرب (عراق شام و فلسطین) مصر، مراکش، زیریں صحارا افریقی ممالک کے باشندوں میں بدھ مت، ہندومت، عیسائیت، یہودیت، اور مقامی اساطیری عقیدوں کے باقی رہ جانے کا کوئی جواز نہیں رہتا متوازی خط پر سوچنے کی بات یہ ہے کہ سینٹ پیٹر (متوفی ۶۷ عیسوی) اور سینٹ پال (متوفی ۶۷ تقریباً) کے قیام روم سے قسطنطین اعظم (۲۹۴۔۳۶۱ قبل ہجرت/ ۲۷۲۔۳۳۷ء) سے پہلے کے دور تک تو یورپ میں عیسائی ظلم وستم کا نشانہ رہے مگر قسطنطین کے بعد وہ یورپ جو مقامی اساطیر کو دین سمجھتا آرہا تھا، اچانک سارے کا سارا کیسے اور کیوں عیسائی ہو گیا تھا ہندوستان کے دراوڑ جو ماضی بعید میں آریہ حملہ آوروں کے خلاف سیاسی مزاحمت سے کبھی بھی دست کش نہیں ہوئے تھے وہ شمال سے جنوب تک سب کے سب آریائی عقیدہ کے ماننے والے کیسے بن گئے تھے؟ شمالی اور جنوبی امریکہ، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے وہ مذاہب کہاں لاپتہ ہو گئے جو وہاں پندرھویں اور سولہویں صدیوں میں رائج تھے ہسپانیہ کی حالیہ تاریخ میں مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد وہاں سیاست (شاہ فرڈننڈ، ملکہ ازابیلا) اور کلیسا (کارڈینل خیمینیث اور کارڈینل تلاویرا) (Xemines and Talavera) نے مل جل کر جس طرح مسلمانوں اور یہودیوں کو جبراً عیسائی بنایا تھا وہ نہ صرف دنیا کی یادداشت سے محو نہیں ہو گیا بلکہ اس تاریخ سے پردہ اٹھا دیتا ہے جسے بڑے جتن سے چھپایا بھی جاتا ہے۔

بہر حال دنیا میں مذہب کی جبری تبدیلی کی بہت سی داستانیں تاریخ میں موجود ہیں جن میں پوری پوری قوموں کو کسی خاص دین کو قبول کرنے پر سیاسی استبداد، معاشیاتی لالچ اور فریب کارانہ تعلیمات کے ذریعہ مجبور کیا گیا اور آج بڑے بڑے جغرافیائی خطے کسی خاص مذہب سے منسوب ہیں سوال کیا جا سکتا ہے کہ ایسا ہی مسلمانوں کے معاملہ میں دنیا کے بیشتر علاقوں میں کیوں نہ ہو سکا

تھا، جہاں تقریباً ڈیڑھ ہزار سال سے ہندو، بودھ، یہودی، عیسائی، بہائی، بدستور موجود ہیں اور بلا روک ٹوک اپنے اپنے طریقوں پر اپنے اپنے خداؤں کی عبادت کرتے ہیں۔

اگر بالفرض ہندوستان کی دس فی صدی ہندو، جین اور بودھ آبادی مسلم بادشاہوں کے جبر سے مسلمان بنالی گئی تھی تو باقی ۹۰ فیصدی پر یہی حربہ کیوں کارگر نہیں ہوا اور ان جابر مسلمانوں نے انہیں غیر مسلم رہنے کی اجازت کیوں دے دی تھی اور اگر دوسری جانب ان ۹۰ فیصدی لوگوں کے ہندو، بودھ اور جین رہنے پر ان بادشاہوں کو کوئی اعتراض نہیں تھا تو صرف دس فی صدی افراد کے خلاف زیادتی کرنے کی انہیں کیا ضرورت تھی، اور ان دس فیصدی افراد سے ان حکومتوں کو کونسی لازوال طاقت حاصل ہو گئی تھی، نیز وہ دس فی صدی لوگ کیوں مسلمان رہ گئے، حالانکہ ان جبراً مسلمان کئے جانے والوں کے پاس دلیل تھی کہ جب ان کے اہل خاندان اور اہل معاشرہ بدستور اپنے آبائی مذہب پر قائم تھے تو وہ بھی پرانے دین پر لوٹنے کا حق رکھتے تھے یہی سوال سلطنت عثمانیہ کی یورپی عیسائی مقبوضات، یونان، بلغاریہ، سربیا، رومانیہ، ہنگری وغیرہ کے بارے میں بھی پوچھا جائے گا تو ان لاجواب سوالوں کا جواب یہی ہے جو لوگ ان خطوں میں مسلمان ہوئے تھے وہ کسی تلوار کی مار اور کسی بادشاہ کے جبر سے نہیں اپنی آزادرائے کے نتیجہ میں مسلمان ہوئے تھے اور اپنی آزادرائے کی بناپر اب تک اسلام سے وابستہ ہیں۔

اس کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ اسلام کے علاوہ کسی دین کی یہ تعلیم نہیں کہ جب ہدایت صاف صاف سامنے رکھ دی گئی تو دین کے معاملہ میں اب کسی انسان پر کوئی جبر نہیں ہے (۱) یعنی آدمی میں سوجھ بوجھ بھلے بڑے کی پہچان، اپنے مفادات کا احساس سب خلقی اور فطری طور پر موجود ہے تو اس اہم اعتقادی معاملہ کو ہر فرد کی شخصی آزادی پر چھوڑ دیا جائے جس کا ذمہ دار ہر شخص خود ہوتا ہے لیکن قیامت کے دن کے سوال جواب اور امکانی الزامات کا سدباب کرنے کے لیے ضروری ہوا کہ ہدایت کی بات کو دنیا میں ہر فرد کے سامنے ضرور پیش کر دیا جائے ویسے بھی قاعدہ کی بات ہے کہ جب تک ردو قبول کے لیے متبادل صورتیں سامنے نہ رکھی جائیں شخصی آزادی کا تصور پیدا

نہیں ہوتا اسلامی طرز دعوت اور دیگر تبلیغی مذاہب کے طریقہ تبلیغ میں یہی بنیادی فرق ہے اور اسی لیے دین کے معاملہ میں فرد کی آزادی کو قانونی اصول کے طور پر برتنے والے مسلمانوں پر الزامات عائد کرنے کی رسم عالمی ہے جب کہ تشدد یا لالچ کے ذرائع اختیار کر کے لوگوں کے عقائد بدلنے والوں اور شخصی آزادی کے خلاف کام کرنے والوں کے دامن دھلے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

باقی دنیا کی اس فضا سے قطع نظر یورپ میں عثمانی ترکوں کا فوجی عمل اسی تبلیغی حکمت کا ایک باب تھا اور اس حقیقت کو سمجھے بغیر ان کی تاریخ کا مکمل فہم ممکن ہی نہیں ہے۔

یونانی لاطینی آویزش کے مختلف پہلو

اس تبلیغی حکمت عملی کے ساتھ سیاسی افادہ پسندی کے تقاضے بھی عثمانی ترکوں کے حوصلے بڑھا رہے تھے ان کے سامنے آگے بڑھنے کا ایک ہی راستہ تھا مغرب کی سمت بیزنطئم کے انحطاط سے جو خلا پیدا ہو رہا تھا اسے پُر کرنے کے اور بھی چند امیدوار تھے یا ہو سکتے تھے سربیا، مقدونیہ اور بلغاریہ کی نوآزاد حکومتیں بھی یہ خلا پُر کر سکتی تھیں۔ دور مغربی یورپ کی مقدس رومن امپائر، فرانس اور صلیبی لڑاکے مہیا کرنیوالے برطانیہ جیسی پرانی اور ابھرتی ہوئی طاقتیں بھی قسمت آزمائی کر سکتی تھیں۔ اٹلی میں قائم جینوا اور وینس کی تاجر ریاستیں بھی میدان میں تھیں ان دونوں ریاستوں اور مغربی یورپ نے مل کر ہی تو بیزنطئم کے بے دین اور تھوڈوکس عقیدہ والوں کے خلاف بھی ایک صلیبی جنگ لڑی تھی اور انجئین کے علاقہ میں اپنی تجارتی نوآبادیاں بھی قائم کر لی تھیں مگر پھر ان میں کوئی بھی اس کام کے لیے آگے نہ بڑھا۔ یا کسی نے وہ صلاحیت ظاہر نہ کی جو ایک ہزار سال پرانی ایک سلطنت کے ملبہ کے اوپر ایک نئی عمارت اٹھانے کے لیے ضروری تھی میدان تو سب ہی کے لیے کھلا ہوا تھا سیاست داں بھی ہر جگہ موجود تھے اور فوجی سالاروں سے بھی یورپ خالی نہیں ہو گیا تھا ان کی مالیات بھی بیزنطئم کے مقابلہ میں مضبوط تھیں پھر کوئی تو وجہ ہو گی کہ ان سب کو پیچھے چھوڑتے ہوئے ایک ایشیائی اور مسلم طاقت میدان مار لے گئی، اگر چہ یہ بات آج تک یورپ کے لئے نہایت تکلیف کی ہے۔

اکثر معاملات میں عثمانی اور یورپی کم و بیش برابر کی طاقتیں تھے لیکن فراست اور دوراندیشی

منصوبہ بندی اور فوجی طاقت کے درست جگہ درست استعمال میں کوئی بھی حریف ابتدائی دور کے عثمانیوں کی برابری نہیں کرتا تھا یہی وجہ ہے کہ وہی اس خلا کو پُر کر رہے تھے جو بیزنطنم کی کمزوری اور مستقل پسپائی سے پیدا ہو رہا تھا۔

بیزنطینی شہنشاہیت کئی قسم کے عوارض کا شکار تھی تقریباً ایک ہزار سال سے قائم یہ بوڑھی شہنشاہیت سیاسی مقصد اور نصب العین سے خالی ہو چکی تھی صدیوں سے اس میں انتقال اقتدار کا کوئی نظم نہیں تھا اور حکمراں قیصروں کے خلاف سازشوں کی روایت تھی نیز ایک بادشاہ کی موت کے بعد شہزادوں اور امراء میں خون ریز رسہ کشی عام تھی ان باہمی آویزشوں کی وجہ سے کسی حکمراں کو عوام کی حالت زار کی خبر ہوتی تھی نہ اس سے دلچسپی تھی اس کے نتیجہ میں عوامی بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہوا اور طالع آزما سرداروں اور صوبیداروں کی سرکردگی میں رفتہ رفتہ قومیتی صوبے نہ صرف خود مختار ہوتے چلے گئے بلکہ بلغاریہ، مقدونیہ اور سربیا وغیرہ کے نئے حکمران بزنطینی علاقوں پر فوج کشی کر کے اس سلطنت کو سیاسی دفاعی اور اقتصادی طور پر مزید کمزور کرتے رہے۔

یونان اور اٹلی کی تہذیبی خلیج

تیسری وجہ اٹلی اور یوناں کی تہذیبی آویزش کی تھی یورپ کی پہلی بلکہ قدیم دور میں واحد تہذیب یونان کی تھی وہ تہذیب سیاسی طور پر اختراعی تھی جہاں سے شہری جمہوریتوں کا تصور ملا تھا اور پیریکلیس جیسے سیاست داں پیدا ہوئے تھے لیکن اس کے ساتھ یونان نے فلسفہ، ریاضی اور طب میں بھی غیر معمولی ترقی کی تھی تاہم وہ تہذیب طویل مدت زندہ نہ رہ سکی روم نے اس کا چربہ اٹھایا اور یونانی دیومالا کے دیوتاؤں اور دیویوں کے لاطینی نام رکھ کر اس یونانی مذہب کو لاطینی چولا پہنا کر یہ تاثر دیا کہ وہ لاطینی یا رومی تہذیب تھی یونانی اسی لیے رومیوں کو محض نقال اور خود سے کمتر سمجھتے رہے اور بالآخر رومی سلطنت میں تقسیم پیدا کر کے اول اول ازمید (نیکومیڈیا) میں اور پھر قسطنطنیہ میں مرکوز نئی رومی سلطنت قائم کر بیٹھے یہ عداوت ایک ہزار سال تک باقی رہی اور مختلف جہتوں سے سامنے آتی رہی۔

عیسائی دنیا کا اعتقادی افتراق

اس نزاع کا ایک اور پہلو یونان اور اٹلی کے مابین شدید جذباتی اعتقادی افتراق بھی تھا ابتدا میں حضرت عیسیٰ کے مخالف اور بعد میں پیرو، سینٹ پال کے اصرار پر حضرت عیسیٰ کے حواری سینٹ پیٹر بھی فلسطین اور پھر یونان کو چھوڑ کر بت پرست لاطینی شہنشاہیت کے مرکز روم میں جا بسے تھے دونوں شخصوں کے درمیان خاصا اعتقادی فرق تھا لیکن آخر کار سینٹ پال کے اعتقادی اور اطلاقی نظریات کو سینٹ پیٹر اور خود حضرت عیسیٰ کے اور خود اپنے ہم قوم یہودیوں کو چھوڑ کے اپنے مذہب کا مرکز لادین اور مشرک یورپی بادشاہوں کے دارالحکومت روم کو بنایا تھا اور وہاں کے بہت سے مقامی اعتقادات کے ساتھ سمجھوتے کر کے اپنا فرقہ پیدا کیا اور اسے روایت پسند (کیتھلک) کا نام دیا یونانیوں نے اسے اپنے ساتھ بے وفائی اور زیادتی تصور کیا سینٹ پال کے دینی عقائد سے انہیں ایک درجہ میں اختلاف رہا جو مغربی اور مشرقی گرجاؤں کے مابین ایک ناقابل عبور اعتقادی خلیج کی صورت میں سامنے آیا رومی چرچ خود بھی اس باہمی نفرت سے بری نہ تھا اور یونانی راسخ العقیدہ (اورتھوڈوکس) چرچ کو بے دین سمجھتا رہا یہاں تک کہ لاطینی اور فرانسیسی پادریوں نیز اطالوی تاجروں نے چوتھی صلیبی جنگ (۱۲۰۲ـ۱۲۰۴) کا رخ بدل کر قسطنطنیہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی، عارضی طور پر مشرقی رومی سلطنت کو ختم کر کے وہاں ایک لاطینی سلطنت قائم کر دی تھی چوتھی صلیبی جنگ مشرقی رومی سلطنت کا تابوت بن گئی تھی (۲)

چوتھی صلیبی جنگ میں بیزنطینی سلطنت کی شکست کا سب سے بڑا نقصان اس کے حوصلوں کی پستی کی صورت میں سامنے آیا تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ قیصر ہرقل عظیم کے دور حکومت (۶۱۰ـ۶۴۱) کے بعد بیزنطیم کے مقدر میں عقلمند اور حوصلہ مند بادشاہ نہیں رہ گئے تھے پست ہمت اور کم عقل لوگ سازشیں اور اکثر اپنے پیشرو کو قتل کر کے تخت پر بیٹھ جاتے تھے شہنشاہیت برائے نام باقی تھی، اس کے ممالک محروسہ تقریباً سب ہی ہاتھ سے نکل چکے تھے اور ماضی کی وہ عظیم شہنشاہیت قسطنطنیہ کے اطراف ایک چھوٹی سی یونانی جاگیر سے زیادہ کچھ نہیں رہ گئی تھی قیصر کا لقب اختیار کرنے والے

افراد بہت معمولی درجہ کے آدمی ہوتے تھے جن کے پاس علم و فراست تو بہت دور کی بات ہے ہنگامی معاملات کا فہم بھی باقی نہیں رہا تھا رعایا کی خود اعتمادی بالکل ختم ہوگئی تھی عام لوگ اقتصادی بدحالی اور بدترین غربت و افلاس کا شکار تھے قیادت سے محرومی کی وجہ سے عوام کی عام زبانت مٹ گئی تھی اور کوئی تہذیبی امتیاز باقی نہیں رہا تھا وہ اپنے مسائل کا ادراک کرنے سے قاصر ہو چکے تھے ان کے سامنے ان ہمہ جہتی معاشرتی امراض کا کوئی علاج نہ تھا خود اعتمادی کے فقدان نے بادشاہ اور رعایا دونوں کو انبوہی نفسیات کا شکار کر دیا تھا مستقل بے اعتمادی اور مسلسل انحطاط نے ان کے سامنے زوال کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا۔

اُرخان کو یورپ کی یہی میراث ملی تھی یہی میراث قسطنطنیہ کے مغرب میں واقع بادشاہوں کو بھی ملی تھی سوال اس میراث کو رد کر دینے یا اسے قبول کر کے حالات کو بدل ڈالنے کی صلاحیت کے اظہار کا تھا اسی فیصلہ پر مستقبل کی تکوین کا انحصار تھا۔

اُرخان کی یورپی سیاست کا آغاز

اناطولیہ کے علاقہ میں بروصہ کا شہر اسی سال عثمانی قبضہ میں آیا تھا جس سال اُرخان تخت نشین ہوا تھا اس اقدام کے پیش نظر بیزنطینی حکومت نے یہ اندازہ لگانے میں غلطی نہیں کی تھی کہ بروصہ کے بعد اُرخان کے اگلے نشانے نکومیڈیا (Nicomedia ازمید) اور نیقیا (Nicea ازنیک) ہوں گے اُرخان کو تخت حکومت پر بیٹھے ابھی تین ہی سال ہوئے تھے کہ بیزنطینی قیصر انڈرونیکس ثالث پیلا لوگس کی سیاسی غلطی نے مستقبل کے اندیشہ کو حال کا خطرہ بنا دیا بلغاریہ کے زار مائکل ششمن نے ۱۳۲۷ء میں اچانک بیزنطینی سرحد پر تھریس کے علاقہ میں فوج کشی کی اور اڈریانوپل (اَدرنہ) کی دیواروں تک پہنچ گیا بیزنطی سپہ سالار ''عظیم خانہ زاد'' جان کانتا کوزینس (بعد میں قیصر جان چہارم) نے مقابلہ کیا بلغاروی زار کو زمین کے مقابلہ میں مال سے زیادہ دلچسپی تھی چنانچہ وہ مذاکرات کے بعد امن بحال کر کے اس علاقہ سے واپس چلا گیا۔ یہ اتفاقی بات نہیں تھی بلغاریہ اور سربیا بیزنطینی سربراہی سے نکل چکے تھے اور اس کے لیے مستقل فوجی عذاب بنے

ہوئے تھے ان اقدامات میں اس علاقہ کے لوگوں کی اجتماعی نفسیات کو زیادہ دخل تھا جس کا شکار کئی صدیوں بعد خود سلطنت عثمانیہ بھی ہوئی۔

مغرب کی سمت میں بیزنطینی حکومت مسلسل پسپا ہو رہی تھی ایسی صورت میں بیزنطینی حکومت کے لیے مناسب تھا کہ وہ ترکوں کو اپنا حلیف بناتی جو بعد میں قیصر جان چہارم نے کیا بھی اس کے برعکس، انڈرونیکس ثالث اپنے خیال میں نیقیا (ازنیک) کو بچانے کی خاطر نکل کھڑا ہوا اُرخان اس قلعہ کا محاصرہ کئے ہوئے تھا قیصریت کی حالت یہ ہو چکی تھی کہ انڈرونیکس ثالث دارالحکومت قسطنطنیہ سے ۲،۰۰۰ سے زیادہ کی نفری لے کر نہ نکل سکا اور تھریس کے محروسہ علاقوں سے اس سے بھی کم فوج مہیا ہو سکی فوج کو عظیم خانہ زاد جان کانٹا کوزینس کی کمان میں دے کر وہ ۱۰۔۱۱ جون ۱۳۲۹ء کو نیکومیڈیا (ازنیک) کے مغرب میں پیلیکانن (موجودہ ملیاس) کے میدان میں اترا۔ اُرخان کی کمان میں ۸،۰۰۰ کے قریب فوجی تھے۔

اُرخان کا بڑا بھائی اور وزیراعظم علاء الدین خان ابھی عثمانی حکومت اور فوجوں کی تنظیم نو میں مشغول تھا اس لیے اُرخان نے اس محاذ پر کسی بڑی اور فیصلہ کن لڑائی سے گریز کیا اگرچہ اس کی فوج تقریباً دوگنی تھی مسئلہ نئے مفتوحہ علاقہ میں عثمانی طرز کی حکومت اور اقتصادی، زرعی، اماراتی اصلاحات کا تھا جس کے لیے نئی عثمانی حکومت ابھی تیاری کے مرحلہ میں تھی چنانچہ اُرخان نے بیزنطینی فوج کے ساتھ چھوٹی جھڑپوں پر اکتفا کیا اور فوج کے بڑے حصہ کے ساتھ اس نے رفتہ رفتہ کوہستانی علاقہ کی جانب پسپائی اختیار کی اس نے ایک چھوٹی فوج کے مقابلہ میں اپنی نفری کو ضائع کرنے یا تھکانے کے بجائے محفوظ رکھنے کو ترجیح دی اور صرف قدر اندازوں کے ذریعہ مزاحمتی نوعیت کا مقابلہ جاری رکھا تیر اندازی کی ایک جھڑپ میں قیصر انڈرونیکس ثالث زخمی ہوا اور میدان چھوڑ کر ''بڑی عجلت میں'' قسطنطنیہ بھاگ گیا اس کے ساتھ فوج کا بڑا حصہ بھی فرار ہو گیا البتہ باقی ماندہ بیزنطی فوج نے پھر بھی حوصلہ کا ثبوت دیا اور پیچھا کرنے والی ترک فوج سے کچھ دیر مقابلہ جاری رکھا لیکن وہ باحوصلہ فوج بھی جنگ کی تاب نہ لا سکی اور میدان چھوڑ گئی۔

مفرور قیصر کے مقابلہ میں اس کی بچی کچھی فوج اور ازنیک کے باشندوں کا یہ کارنامہ یقیناً قابل ذکر ہے کہ ان کی حکمت عملی نے سیاسی تعطل پیدا کردیا اور اُرخان کو فوری فوجی یا سیاسی کامیابی حاصل نہ ہوسکی۔ تاہم باقی ماندہ بیزنطینی فوج کے پسپا ہونے کے بعد اُرخان کے لئے میدان خالی تھا اس نے ازنیک کا محاصرہ تنگ کردیا شہر کے لوگوں نے مزید دو سال تک بہادری سے مقابلہ کیا لیکن جب قسطنطنیہ میں بیٹھے ہوئے قیصر کی طرف سے کسی امداد اور کمک سے مایوس ہوگئے تو ۷۳۱ھ/۱۳۳۱ء میں شہر نے ہتھیار ڈال دیئے (۳) البتہ ۱۳۲۹ء کی اس مہم میں اُرخان بالکل ناکام بھی نہیں ہوا اس نے اناطولیہ میں نواحی علاقہ پر توجہ کی اور گملیق (Civitot) کا قلعہ اور بحیرہ مار مورہ کے تقریباً سارے جنوبی ساحل کو اپنی قلمرو میں شامل کرلیا (۴) اس واقعہ کے سات سال بعد ازمید بھی فتح ہوگیا۔

ازمید کا محاصرہ اور فتح

ازنیک کی فتح کے بعد اُرخان ے اناطولیہ میں تیسرے بڑے بیزنطی شہر ازمید کا محاصرہ سخت کردیا آئندہ دو سال ازمید والوں کے لیے نہایت سختی کے تھے مگر ان کا قلعہ اتنا مضبوط تھا اور ان کے حوصلے اتنے بلند تھے کہ وہ طویل مدت تک محاصرہ کی سختی کو جھیل سکتے تھے تاہم قیصر انڈرونیکس ثالث کے لیے یہ صورت حال اطمینان بخش نہیں تھی اس نے سلطان اُرخان سے ملاقات کی درخواست کی۔ سیاسی اعتبار سے اُرخان کے لیے یہ درخواست اہم تھی دونوں حکمرانوں کے درمیان ۱۳۳۳ء میں ملاقات ہوئی اس سے پہلا تأثر یہ باہر گیا کہ اگر بیزنطی حاکم کمزور نہیں ہے تو بھی ترک سلطان بہت طاقت ور ہے یہ حقیقت ملاقات کے بعد زیادہ واضح طور پر سامنے آگئی سیاسی مذاکرات کے نتیجہ میں بیزنطینی حاکم عثمانی سلطنت کو سالانہ خراج ادا کرنے پر رضامند ہوگیا اور اس کے عوض میں اس نے اناطولیہ میں اپنے بچے کچھے علاقہ پر بیزنطینی تسلط برقرار رکھنے کی اجازت حاصل کرلی مغربی مؤرخین نے بیزنطینی حاکم کے لیے اس ملاقات کو ''توہین آمیز'' قرار دیا ہے (۵)

قسطنطین اعظم کے ابتدائی زمانہ میں یہی ازمید مشرقی رومی سلطنت کا پہلا پایہ تخت تھا قسطنطین نے ۳۲۴ء میں حکومت کا مرکز اناطولیہ سے یوربی ساحل پر نئے شہر بیزنطئم میں منتقل کر دیا اور اپنے نام پر اس شہر کا نیا نام قسطنطنیہ رکھا ادار لحکومت کی اس منتقلی کے باوجود نیکومیڈیا کو سیاسی اور قتصادی اہمیت حاصل رہی اس شہر کی فتح سے جہاں ترکوں کے حوصلے بلند ہوئے وہاں چاروں طرف سے سمٹتی ہوئی بیزنطی حکومت کی روز افزوں کمزوری کا راز ایک بار پھر فاش ہوگیا۔

حقیقت یہ ہے کہ قیصر انڈرونیکس ثالث سے معاہدہ کے باجود اُرخان اناطولیہ میں ان بیزنطینی مقبوضات سے دستبردار نہیں ہوا تھا جہاں عثمانی فوجیں برسوں سے گھیرا ڈالے بیٹھی تھیں بروصہ اور ازنیک کی فتح کے بعد ازمید کی سیاسی اور دفاعی اہمیت نا قابل انکار تھی بروصہ اور ازنیک کے بعد ازمید کا حاصل کرنا عثمانی سلطنت کے لیے نہ صرف مستقبل کے منصوبوں کے نقطہ نظر سے ضروری تھا بلکہ خود اس نئی سلطنت کی بقا کا مطالبہ بھی تھا ان تینوں شہروں کی بڑی جغرافیائی اہمیت تھی ان پر قبضہ رکھنے والا اناطولیہ کا حاکم رہ سکتا تھا اور اس کے لیے یورپ میں پیش قدمی کا راستہ بھی کھل جاتا تھا یہ تین شہر یورپ کی سمت سے کسی بھی فوجی اقدام کو روکنے کے لیے ضروری دفاعی دیوار مہیا کرتے تھے ان تینون شہروں پر قبضہ کے بعد بیزنطینی حکومت کی مدت عمر کے دن انگلیوں پر گنے جاسکتے تھے۔ یہی ہوا بھی ازمید کی فتح کے بعد اُرخان کے بیٹے سلیمان پاشا نے نہ صرف یورپ میں قدم رکھا بلکہ وہاں عثمانیوں کے قدم بھی جمادئے۔ چنانچہ اُرخان کے لیے ان علاقوں سے دستبرداری کا سوال ہی نہیں تھا ایسا خیال کرنا بھی عثمانی خاندان کی تاریخ کو بھی ویسا ہی بنا دیتا جیسی ان دیگر ترک بیلیقوں کے قائدین نے مرتب کی تھی جو بحیرہ ایجئین اور بحیرہ مارمورا کے ساحلوں پر بیٹھے تھے اور وہاں سے یورپ میں دخل اندازی بھی کرتے تھے مگر ان ترکوں کے پاس اپنے ساحلوں کو محفوظ رکھنے والے قلعے نہیں تھے۔

ازمید کے قلعہ بند فوجی اور شہری طویل مدت تک محاصرہ کو برداشت کرنے کی طاقت تو رکھتے تھے مگر کسی محاصرہ کو اٹھانے کے لیے محض فوجی طاقت کافی نہیں ہوتی اس کے لیے سیاسی طاقت بھی

ضروری ہے اور فوجی طاقت کا مسلسل اظہار اس سے بھی زیادہ ضروری ہے ازمید میں محصور بیزنطینی فوجیں عموماً لڑائی سے گریز کر رہی تھیں محاصرہ کی مدت کے دوران فریقین میں بھاری معرکوں کے ذکر سے تاریخ خالی ہے یہی وجہ ہے کہ طویل مدت کے محاصرے قلعہ بند بیزنطینی فوجوں اور شہروں کے عوام کے لیے زیادہ حوصلہ شکن ثابت ہو رہے تھے۔

ابھی جنگوں میں بارود کا استعمال شروع نہیں ہوا تھا تاہم اُرخان اور علاء الدین خان کی سیاسی، فوجی اور انتظامی فراست نے یہ انتظام کر دیا تھا کہ اُرخان اپنے مفتوحہ علاقوں میں بھاری نفری کے ذریعہ امن و امان قائم رکھے اور ان خطوں کی اقتصادی ترقی کے پہلے سے مرتب منصوبوں پر عمل کے راستے کھولتا جائے۔ دوسری طرف اس کے پاس اتنی فوج بھی تھی کہ قلعہ بند شہروں کی دیواروں کے نیچے سے طویل مدتوں تک ضروری تعداد میں افواج ہر وقت موجود رہیں قلعہ ازمید کے اطراف ترک فوجوں نے ناکہ بندی کر رکھی تھی اس کا اضافی فائدہ یہ ہوا کہ شہر سے باہر کے علاقوں میں اقتصادی بہتری نمایاں طور پر نظر آنے لگی اس کے علاوہ شہری امن اور ترقی کے مظاہر بھی قلعہ بند لوگوں سے بھی چھپے ہوئے نہیں تھے ان تمام باتوں کے مجموعی اثرات نے محاصرہ کے شکار بیزنطینی فوجیوں کے حوصلے پست کر دیئے اور آخر کار جب انہیں یقین ہو گیا کہ قسطنطنیہ سے کسی قسم کی کوئی فوجی کمک اور مالیاتی یا اقتصادی مدد انہیں کبھی حاصل نہ ہو گی تو ۱۳۲۷ء میں وہ عثمانیوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہو گئے (۶)

کریسی بیلیق کے فوجی اقدامات

اناطولیہ میں سلجوقی فراست کی یادگار گیارہ دیگر ترک بیلیقوں میں سے چند اسی راہ پر چل رہی تھیں جس پر ابتدائی عثمانی حکمراں دادِ فراست و دادِ شجاعت دے رہے تھے کریسی، سروخان اور آئیدن کی بیلیقیں بحیرۂ ایجئن کے اناطولی ساحل پر شمالاً جنوباً واقع تھیں ریاست آئیدن کے حاکم عمر بے اور سروخان کے عساکر عثمانیوں سے پہلے ہی تھریس کے علاقے میں اہلِ یورپ سے جرأت آزما ہو چکے تھے اگرچہ ان کی سیاست دوررس نتائج دینے والی نہیں تھی۔

کریسی کی ریاست بھی عثمانی ریاست کی طرح قسطنطنیہ سے بہت قریب تھی اور چودھویں صدی کی چوتھی دہائی میں اس کی فوجوں نے اناطولیہ میں بحیرۂ ایجئین کے شمالی ساحل پر بحیرہ مارمورہ سے خلیج اور میدتک کے علاقہ پر قبضہ کرلیا تھا اس طرح بحری سرحد پر کریسی کو عثمانیوں پر فوقیت حاصل ہوگئی عثمانیوں کو یورپ میں داخل ہونے کے لیے پہلے قسطنطنیہ سے ٹکرانا ضروری تھا، جب کہ کریسی کی فوجیں درۂ دانیال سے گزر کر آسانی سے یورپ میں داخل ہوسکتی تھیں بیزنطینی حکومت مغرب میں واقع دشمن عیسائی ریاستوں سے پہلے ہی پریشان تھی کہ ادھر درۂ دانیال کی آبی گزرگاہ پر کریسی قبضہ سے بلقان میں اس کی باقی ماندہ مقبوضات کو ایک نیا خطرہ لاحق ہوگیا تھا اسی دہائی میں کریسی کی فوجیں دوبارہ سمندر عبور کرکے یورپی علاقہ تھریس میں داخل ہوچکی تھیں اس کو بنیاد بنا کر ۱۳۴۲ء میں ایک نئی صلیبی فوج قسطنطنیہ کی مدد کے لیے نکلی اور اس نے ترک بیلقی بحری بیڑہ کو تباہ کردیا اور سمرنا (ازمیر) میں آئیدن کے حاکم عمربے کی فوجی بندرگاہ اور قلعہ کو آگ لگا دی اس طرح قسطنطنیہ کو لاحق خطرہ کچھ عرصہ کے لیے رفع ہوگیا(۷)

تاریخ کے ان نشیب وفراز نے کریسی بیلیق کو اتنا فائدہ نہیں پہنچایا جتنا چند سال بعد عثمانی سلطنت کو حاصل ہوا۔ اناطولیہ میں ریاست کے مقام کو پہنچنے والی چند ترک بیلیقوں میں کریسی بھی تھی اور عثمانیوں کی طرح وہ بھی یورپ میں ان نشانوں کوتا کے ہوئے تھی جن کی خاطر سلجوقیوں نے وہ سرحدی نظام قائم کیا تھا تاہم گزرتے وقت کے ساتھ اس نظام کی کڑیوں میں باہمی ربط ختم ہوگیا تھا اور رقابت اور آویزش پیدا ہوگئی تھی وقت اور بخت کی بات تھی کہ یہ ٹکراؤ ترکوں کی قوت کو ختم کرنے کا سبب نہ بنا اس کی ایک بڑی وجہ عثمانی قیادت کی فراست تھی کریسی کی ریاست میں ۱۳۴۵ء میں جانشینی کے مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوا عثمانیوں نے اس موقعہ پر فوری اقدام کیا اور کریسی میں پیدا ہو جانے والی سیاسی بے یقینی کی اس کیفیت کو ختم کرکے اس ترک ریاست کو اپنے زیراثر لے لیا اس طرح عثمانیوں کو درۂ دانیال کی راہ سے بھی تھریس میں داخل ہونے کی سہولت مل گئی اس عثمانی حکمت عملی کو کریسی کی افواج کی تائید حاصل تھی بیلیق کے قیام کے وقت ہی سے ان افواج

کے سامنے ایک واضح مقصد تھا اور کریسی کے فوجی سالار جانتے تھے کہ عثمانی ریاست اسی مقصد کی تکمیل کے لیے سرگرم تھی چناچہ کریسی کی ترک افواج کے جوش وجذبہ کے ساتھ ان کا تجربہ اور وقت کے تقاضوں کا درست فہم بھی عثمانیوں کے کام آیا (۸)

قسطنطنیہ میں سیاسی خلفشار کا آغاز

پانچواں عشرہ شروع ہوتے ہی بیزنطینی سلطنت انتشار کا شکار ہوگئی قیصر انڈرونیکس ثالث کا انتقال ۱۵ جون ۱۳۴۱ء کو ہوا اس کی موت کے بعد سات سال تک بیزنطیم میں تخت کے دعوے داروں کی سازشوں نے خلفشار برقرار رکھا۔ یہ صورت دیکھ کر لاطینی افواج نے پیش قدمی کی قیصر نے ترک بیلیقوں سے مدد طلب کی آئیدن کے امیر عمر بے اور ترک ریاست سروخان کے امیر کی بحری فوجوں نے ایجئن میں لاطینی حملوں سے قسطنطنیہ کے دفاع میں مدد کی۔ چنانچہ جب انڈرونیکس ثالث کا انتقال ہوا تو عمر بے نے اس کے کمسن بیٹے جان پنجم پلیلوگس کو تخت کا وارث اور اس کے اتالیق جان ششم کانٹا کوزینس کا جائز حکمراں تسلیم کرلیا بیزنطینی حکومت کے لیے یہ دور شدید سیاسی ابتری کا تھا حکومت کمزور اور حکمراں بے اثر اور بے شعور تھے ان کو دوست دشمن میں تمیز باقی نہیں رہی تھی وہ کبھی ترکوں سے مدد لیتے اور کبھی لاطینیوں سے اور ہر معاملہ میں مستقل زک اٹھاتے عمر بے نے عظیم خانہ زاد جان ششم کی حمایت کے عنوان سے بلقان میں قدم جمانے شروع کیے تو قیصر نے یورپ سے صلیبی مدد مانگ لی اس امداد نے آئیدن کے امیر عمر بے کی پیشرفت کو تو متاثر کردیا مگر بیزنطینی علاقوں میں لاطینیوں کے بڑھتے ہوئے اثرات سے فرقہ وارانہ مخاصمت کا اندیشہ بڑھ گیا اس نئی بے یقینی کو دور کرنے کے لیے جان ششم کانٹا کوزینس نے اُرخان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور ۱۳۴۴ء میں اپنی بیٹی تھیوڈورا کی شادی اس سے کردی اس شادی نے اُرخان کو بیزنطینی سیاست اور تھریس کی جنگوں میں راست مداخلت کا جواز مہیا کردیا (۹)

اٹلی میں وینس اور جینوا کی دو تاجر شہری ریاستوں کے مابین بحر اسود اور ایجئن پر تسلط اور اس کے ذریعہ یورپ اور مغربی ایشیا کے خام مال، پوستین، ریشم، مصالوں، جواہرات اور موتیوں کی

تجارت پر قبضہ کرنے کے لیے رسہ کشی ہورہی تھی ان کا جھگڑا ۱۳۵۵۔۱۳۵۱ء کے دوران بڑھ گیا تھا اطالوی ریاستوں کی اس مخاصمت میں اُرخان جینوا کا حامی تھا اسی اثنا میں سربیا اور بلغاریہ کے اتحاد نے بلقان میں بیزنطینی مقبوضات پر ۱۳۵۲ء میں نیا حملہ کردیا رشتہ داری کا لحاظ کرتے ہوئے اُرخان نے اپنے بڑے بیٹے سلیمان کو جان کانٹا کوزینس کی مدد کے لیے اڈریانوپل (ادرنہ) بھیجا اس مہم کے دوران سلیمان نے صرف ۴۰ ترک سپاہیوں کی مدد سے یورپ کی سمت میں خاکنائے گیلیپو لی کے مشرق میں ریاست وینس کے مقبوضہ ایک قلعہ پر تسلط حاصل کرلیا جان کانٹا کوزینس کو توقع تھی کہ سلیمان وہ قلعہ بیزنطینی حکومت کے حوالہ کردے گا اس کی شکایت پر اُرخان نے بیٹے کو وہ قلعہ چھوڑنے کی ہدایت بھی کی مگر سلیمان اپنی محنت کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔

مزید برآں کریسی کی ریاست اب سلطنت عثمانیہ کی ایک سنجق (صوبہ) بن چکی تھی اور وہاں کی ترک سپاہ کو یورپی محاذوں کا تجربہ تھا ان کا مستقل اصرار تھا کہ عثمانیوں کو یورپ میں پیش رفت کرنی چاہیئے چنانچہ سلیمان نے کریسی سے مزید فوج منگوا کر قلعہ پر قبضہ مستحکم کرنے کے علاوہ گیلیپو لی کا بھی محاصرہ کرلیا اتفاقاً یکم اور ۲ مارچ ۱۳۵۴ء کی درمیانی شب میں گیلیپو لی میں زلزلہ آیا اور قلعہ کی فصیل کا ایک حصہ منہدم ہوگیا سلیمان نے وقت ضائع کیئے بغیر غازی فاضل اور عضدی بے جیسے سالاروں کی معیت میں گیلیپو لی پر قبضہ کرلیا فصیل کی فوراً مرمت کروائی اور بحیرہ مارمورا میں ریاست وینس کے مفادات کو مزید نقصان پہنچایا (۱۰)

سقوط گیلیپو لی سے یورپ میں بے چینی

یورپی ساحل پر گیلیپو لی کے اہم قلعہ کا عیسائیوں کے ہاتھ سے نکل جانا معمولی واقعہ نہیں تھا اس سے نہ صرف بیزنطینی ریاست بلکہ مغربی عیسائی دنیا میں عام بے چینی پیدا ہوئی بیزنطینی حکمران کو اپنی حکومت کا زوال ہی نہیں خاتمہ سامنے دکھائی دینے لگا تھا اور وہ اس درجہ پریشان اور بدحواس ہوا کہ بیزنطینی ریاست کو کسی بھی طاقتور یورپی عیسائی سلطنت کی ماتحتی میں دینے میں اسے تامل نہیں رہا تھا اسی کے ساتھ اور تھوڈوکس اور کیتھلک گرجاؤں کے اعتقادی اتحاد کی بات بھی کی جانے لگی تھی (۱۱)

یہ الگ بات ہے کہ اس نوعیت کی بات بیزنطینی حاکم کا محض ایک ہنگامی سیاسی نعرہ تھا اورتھوڈوکس عیسائیوں کے دل کی آواز نہیں تھی دونوں گرجاؤں کے اتحاد کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا کیونکہ یہ طے تھا کہ نااہل حکمرانوں کی پیدا کی ہوئی سیاسی اتھل پتھل کے باجود عام اور تھوڈوکس عیسائی اپنا عقیدہ بدلنے کو ہرگز تیار نہ تھے شائد اسی احتمال کے پیش نظر رومی پوپ کی جانب سے امداد کا وعدہ وفا نہ ہوا چنانچہ گیلیپولی کی فتح کے بعد جو بے چینی یورپ اور بیزنطیم میں پیدا ہوئی وہ فقط ایک ایسے ذہنی انتشار کی کیفیت تھی جس میں سوچنے والوں کے سامنے نہ تو کوئی راہ فرار ہوتی ہے اور نہ اس صورت حال سے نپٹنے کا کوئی منصوبہ۔ اصولی طور پر یہ منصوبہ خود قسطنطنیہ میں ہونا چاہیئے تھا جس پر یورپ کو متحد کیا جاتا مگر وہاں کسی قسم کا سیاسی یا فوجی منصوبہ ہوتا تو وہ صورت حال ہی پیدا نہ ہوتی اناطولیہ میں نصف صدی سے موجود ترک بیلیقیں اور عثمانی سلطنت کے متواتر فوجی اقدامات قسطنطنیہ سے چھپے ہوئے نہیں تھے مگر وہاں کے حکمراں اور امراء میں حالات کا فہم مفقود تھا۔

اناطولیہ میں عثمانی توسیعات اور استحکام

اسی دوران اُرخان نے اناطولیہ میں حکومت کی توسیع کا کام جاری رکھا اور کئی شہر اپنی قلم رو میں شامل کر لیے انگور (انقرہ) تب ایک اخی قبیلہ کے زیر تسلط تھا وہ ایک کمزور بیلق تھی اُرخان نے اسے بھی سلطنت میں شامل کر لیا۔ جس کے نتیجہ میں سلطنت عثمانیہ کے قدم اناطولیہ کے قلب میں مضبوط ہوئے بظاہر نظر آتا ہے کہ عثمانیوں نے آئیدن، کریسی اور انقرہ کی اخی بیلیقوں پر فوجی اقدام کے ذریعہ قبضہ کیا ہوگا لیکن معاملہ فوج کشی اور برادر کشی کا نہیں تھا مسئلہ قیادت مہیا کرنے کا تھا سلجوقی عہد ہی سے ان تمام بیلیقوں کے قیام کا بنیادی مقصد ایک ہی تھا اور اس اعتبار سے ان کے مابین کوئی غیر معمولی سیاسی رقابت نہیں تھی چنانچہ ایک فطری نظام کے ماتحت ان میں سے جو بھی مستقبل کی قیادت مہیا کرتا اس کے لیے دیگر معاصر بیلیقوں کو اپنی سلطنت میں جذب کرنا ہی مقدر تھا اور یوں ضم ہو جانے والی بیلیقوں کی قیادت، سپاہ اور ترک عوام کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا بلکہ وہ سب ایک ہی مقصد کے حصول کے لیے اسے قیادت کی تبدیلی سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے

تھے ان کے لیے یہ ایسا ہی تھا جیسے ایک بے کے انتقال کے بعد اس کے جانشین کی قیادت کا اعلان۔ اس موضوع پر کیرولائن فنکل کا یہ خیال معقول نہیں ہے کہ مسلم بیلیقوں کے انضمام کے اس عمل کا جواز عثمانیوں کے لیے کوئی سنگین مسئلہ تھا (۱۲)

تاریخی حقیقت یہ ہے کہ عثمانی حکمرانوں کی بیدار مغزی اور منصوبہ بند سیاست بھی پڑوسی بیلیقوں کو ایک بہتر اجتماعیت کی سمت متوجہ کر رہی تھیں یہ بجائے خود اناطولیہ کے ترکوں کے مثالی سیاسی شعور کی علامت تھی۔ جس خصوصیت سے اس عہد میں بھی اور بعد میں اب تک بھی ہندوستان کے سلاطین دہلی اور مغلوں کو چھوڑ کر، بیشتر مسلم سیاسی گروہ مبرا رہے اور عثمانیوں کی مانند کوئی وسیع و عریض اور طویل مدتی سیاسی نظام قائم نہ کر سکے، نہ کم از کم علاء الدین خلجی اور محمد تغلق کی طرح اس کی نیو ہی ڈال سکے۔

اُرخان کا بڑا بیٹا سلیمان ایک اولوالعزم اور باشعور کماندار تھا اور اس سے مستقبل کی امیدیں بھی وابستہ تھیں مگر باز کا شکار کھیلتے ہوئے ۱۳۵۹ء میں گھوڑے سے گر کر وہ فوت ہو گیا اسی سال اُرخان کا بھی انتقال ہو گیا اور اس کا دوسرا بیٹا مراد اول تیسرا عثمانی سلطان مقرر ہوا۔

بیزنطینی شکستوں کے اسباب

اُرخان کا دور حکومت ۱۳۵۹ء تک رہا مغربی مؤرخین تین عشروں کے دوران اس کی فتوحات کے معاشی اور دفاعی اسباب سے بحث کرتے ہیں ان کی رائے میں اصل سبب اقتصادی تھا تمام مفتوحہ علاقے اپنی معیشت کے لیے نواحی علاقوں پر انحصار کرتے تھے۔ ان علاقوں پر عثمانی قابض ہو گئے تھے ترک وہاں لوٹ مار کر کے نہیں چلے جاتے تھے، بلکہ ان علاقوں میں بس جاتے تھے بیزنطینی حکومت ان ترک نو آبادیوں کے خلاف کوئی اقدام نہیں کرتی تھی۔ چنانچہ اناطولیہ کے ان شہروں اور قلعوں کے لیے خود کو ''دشمنوں کے حوالہ'' کر دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں تھا بعض مقامات پر مقامی عیسائی آبادی دستبرداری کی شرائط کے مطابق قسطنطنیہ جانے کے بجائے اپنے شہر میں قیام، وہاں اپنی تجارت وصنعتکاری میں مشغول رہنے اور ''نئی دنیا میں کردار ادا کرنے'' کو ترجیح

دیتی تھی جس کے نتیجہ میں اُرخان کی سلطنت کی آبادی پانچ لاکھ نفوس ہو گئی تھی جو ارطغرل کے ''داستانی'' ۴۰۰ سواروں کے مقابلہ میں بھاری اضافہ تھا (۱۳)

یہ آدھی سچائیاں ہیں بیزنطینی حکومت کسی تبدیلی ہی نہیں اصلاح کو قبول کرنے سے عاری ہو چکی تھی ایک طویل مدت سے اس کے اناطولی جاگیرداروں کا گزر بسر لوٹ مار پر تھا (۱۴) اس کے نتیجہ میں ایک طرف تو مرکزی حکومت کی مالیات صفر رہ گئی اور دوسری جانب اناطولی جاگیروں میں صنعت و تجارت کسی منصوبہ بند نظام سے مربوط نہ رہ گئی تھی بیزنطینی قلعوں کے نواحی علاقے جہاں ترک آباد ہو رہے تھے اس لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ اور مرفہ الحال تھے کہ عثمانی حکومت ان کی اقتصادیات کو بنیادی اہمیت دیتی تھی یہ بات ان ترکوں کے پڑوسی بیزنطینی شہروں کی عیسائی آبادیوں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔

مثال کے طور پر ازنیک کے طویل محاصرہ کے دوران قلعہ بند شہر کی حالت نہایت خستہ ہو گئی تھی خیال کیا جاتا تھا کہ آبادی کا بڑا حصہ قسطنطنیہ منتقل ہو گیا تھا اور شہر تقریباً ویران ہو گیا تھا شہر کی ویرانی تو ابن بطوطہ کی چشم دید شہادت کی رُو سے تاریخی طور پر ثابت ہے مگر ساری آبادی کا ازنیک چھوڑ کر قسطنطنیہ چلا جانا ممکنات سے خارج ہے۔ ایک جھیل کے اندر جزیرہ میں واقع ازنیک کے فتح کے سات ماہ بعد ابن بطوطہ اس شہر میں وارد ہوا تھا اور وہیں اس نے اُرخان سے ملاقات بھی کی تھی شہر میں داخل ہونے کے واحد راستہ پر ایک وقت میں صرف ایک گھڑ سوار چل سکتا تھا ابن بطوطہ کا یہ بیان اہم ہے کہ جب اُرخان نے شہر پر قبضہ کیا تو ساری آبادی تتر بتر ہو چکی تھی اور تھوڑے سے لوگ سلطان کی خدمت میں موجود تھے (۱۵) سوال یہ ہے کہ جب لوگ قلعہ بند تھے اور عثمانی فوج نے محاصرہ بھی کر رکھا تھا تو ساری آبادی کہاں چلی گئی تھی اس صورت حال کا تجزیہ اور معقولیت پسندانہ امکانات کسی اور سمت میں اشارہ کرتے ہیں۔

نقل آبادی کے امکانات پر بحث

عثمانیوں نے بروصہ، ازنیک اور ازمید کا محاصرہ خالص فوجی قوت کے ذریعہ ہی نہیں کیا تھا

بلکہ ان قلعوں کے باہر ان نواحی علاقوں میں ترکوں کو بسا دیا تھا جن پر قلعہ بند آبادیاں اپنی اقتصادی بقا کے لیے انحصار کرتی تھیں (۱۶) ان زمینوں میں کھیتی باڑی ہوتی تھی اس بات کو ایک اور پہلو سے دیکھنا بھی ضروری ہے محصور شہر بہت مضبوط اور ناقابل تسخیر قلعوں کے اندر تھے اور اسی لیے عثمانی فوجوں کو کئی کئی برس ان کا محاصرہ کرنا پڑتا تھا اتنی مدت کسی ایک جگہ فوج کا قیام کچھ اور مطالبے بھی کرتا ہے فوجیوں کی روزمرہ کی ضروریات پوری کرنے کا کوئی مستقل انتظام ضروری تھا فریقین میں روزانہ جھڑپوں کا معمول نہیں تھا لہٰذا محاصرہ کرنیوالی عثمانی فوج قلعوں کے نواح میں معمول کی سماجی زندگی گزار رہی تھی ان کی روزانہ کی غذائی ضروریات بھی تھیں اور اس کے علاوہ بھی زندگی کی دیگر ضرورتیں تھیں ان کو پورا کرنے کا صرف سرکاری انتظام مشکل بھی تھا اور گراں بھی آسان صورت یہ تھی کہ محاصرہ کرنے والی فوج کی چھاؤنی کے قریب عام شہریوں کی بستیاں، حرفت گاہیں اور بازار ہوں جہاں سے چھاؤنیوں میں مقیم فوجیوں کو روزمرہ کی عام ضرورت کی اشیا دستیاب ہوتی رہیں اس قسم کی سہولتیں مہیا کرنے کے لیے سرکاری انتظام ہی ضروری نہیں ہوتا حقیقت یہ ہے کہ خود تاجر مزاج لوگ ہمیشہ آمدنی میں اضافہ کے نئے مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ہندوستان میں اردو جس کا مطلب ترکی زبان میں فوجی چھاؤنی ہوتا ہے ایک ایسے ہی سماجی اور فوجی عمل کے نتیجہ میں بنی تھی جس میں شہروں کے تاجر شہر سے باہر لشکرگاہ میں پھیری یا دکانیں لگا کر مقیم مسلم فوجیوں کی روزمرہ کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ یہ اندازہ کرنا چنداں دشوار نہیں کہ طویل محاصرے خود بیزنطینی شہروں کے تاجروں کو بھی آمدنی میں اضافہ کے مواقع مہیا کر رہے تھے۔ سامنے کی بات کہ ایک محصور شہر میں آبادی کی قوتِ خرید کم ہو جاتی ہے جو تاجروں کے لیے خسارہ کی بات ہوتی ہے چونکہ محصور شہروں سے حرفت کاروں اور تاجروں کا روزانہ باہر آنا خطرناک تھا اس لیے یہ طے شدہ بات ہے کہ محصور شہروں کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد قلعوں سے باہر ان کھلی بستیوں میں آباد ہو گئی تھی جہاں لازمی طور پر عثمانی فوجیوں نے اپنے خاندانوں کو بھی بلا کر بسا دیا تھا یہی وجہ تھی کہ اُرخان جب ازنیک میں داخل ہوا تو وہاں آبادی برائے نام رہ گئی تھی۔

بعد میں ازنیک ایک بڑا شہر بنا جو لوگ اس کو چھوڑ کر تتر بتر ہو گئے تھے ان کی معیشت کا کوئی احوال معلوم نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ فتح کے فوراً بعد اس شہر کی تعمیر نو میں تاخیر کی بات بھی سمجھ میں آتی ہے امن و امان کے بعد مفرور مقامی خاندان دوبارہ اپنے شہر میں واپس آئے اور ترکوں کے نئے خاندان وہاں آ کر آباد ہوئے تب ہی اس کی نئی تعمیر اور مرمت کا کام شروع ہوا تھا۔

ازنیک (اس سے پہلے بروصہ اور بعد میں ازمید) کے تاجروں کے قسطنطنیہ چلے جانے کے خلاف ایک عقلی دلیل اور ہے ان عیسائی تاجروں اور حرفت کاروں کو معلوم تھا کہ قسطنطنیہ میں ان کی معیشت کے بہتر ہونے کا امکان معدوم تھا بے شک قسطنطنیہ اس زمانہ کا بہت بڑا اور ترقی یافتہ و مہذب شہر تھا؛ بلکہ حقیقت یہ ہے اُس صدی میں پورے یورپ میں قسطنطنیہ سے زیادہ بڑا، مہذب، خوبصورت کوئی اور شہر تھا ہی نہیں مگر چوتھی صلیبی جنگ کے نتائج اور مغرب کی پڑوسی عیسائی ریاستوں کی پیہم جارحیت کی وجہ سے وہاں نہ صرف امن و امان متاثر ہو چکا تھا بلکہ صنعت و تجارت پر بھی منفی اثر پڑا تھا سیاسی قیادت کے فقدان کے سبب سے بھی اقتصادی امکانات بہت محدود ہو گئے تھے اور وہ شہر اپنی اقتصادی اہمیت یا مرکزیت کھو بیٹھا تھا۔

عثمانیوں کی رواداری کے نتائج

مفتوحہ علاقوں میں ترقی اور خوش حالی کا ایک اور اہم پہلو یہ تھا کہ دین کے اختلاف کے باوجود اسلامی روایت کے مطابق عثمانی ترک انفرادی اور حکومتی سطح پر یونانی عیسائی رعایا کے ساتھ رواداری کا سلوک کرتے تھے ان عیسائیوں کو اقتصادی امور اور نجی مذہبی زندگی میں مکمل آزادی حاصل تھی بلکہ معاشی اور فلاحی سہولتیں بھی مہیا کی جاتی تھیں ترکوں کی نئی آبادیوں میں وہ سہولتیں موجود تھیں، مفتوحہ شہروں میں بھی ان کی فراہمی کو اولین ترجیح دی جاتی تھی بیزنطینی جاگیردار اور قلعہ دار ایسی سہولتوں کے نہ وسائل رکھتے تھے اور نہ انہیں ان کا احساس تھا لیکن اُرخان کی حکومت مفتوحہ شہروں اور علاقوں کی اقتصادی ترقی کی خاطر سب سے پہلے مختلف شہروں کو جوڑنے والی شاہراہوں، دریاؤں اور نالوں پر پل، اندرون شہر سڑکیں تعمیر کرنے پر توجہ دیتی تھی تمام شاہراہوں

پر جا بجا فوجی چوکیاں تھیں جو تمام شاہراہوں کو پرامن رکھنے کا باعث تھیں اس طرح تجارت اور صنعت کا فائدہ کسی ایک بستی تک محدود رہنے کے بجائے دور دور تک پھیل جاتا تھا اور تاجروں اور صنعت کاروں کے منافع میں غیر معمولی اضافہ کا باعث ہوتا اس سے بالآخر خود ممالک محروسہ میں عام خوشحالی آتی تھی شہروں اور قلعہ بند بستیوں میں سرائیں، خانقاہیں، تعلیم گاہیں اور مدرسے ہسپتال اور تفریحی باغات اور سبزہ زار تعمیر کیے جاتے تھے ان تمام شہری سہولتوں سے ساری رعایا مستفید ہوتی تھی جن میں یونانی نژاد عیسائی بھی شامل تھے (۱۷)

مغربی مؤرخین دبی زبان سے اور اجمالی طور پر ان حقائق کا اعتراف تو کر لیتے ہیں مگر ساتھ ہی یہ وضاحت کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ سلطنت عثمانیہ اگرچہ "عیسائیوں کو برداشت" کر لیتی تھی مگر وہ تھی تو "ایک مسلم ریاست" ہی (۱۸) اول تو یہ دشنام یا جوابی معذرت کا محل نہیں ہے سلطنت عثمانیہ اپنی اصل میں اسی طرح ایک مسلم ریاست تھی جس طرح مثلاً برطانیہ آج بھی ایک عیسائی ریاست ہے اور ملک میں مسلم شہریوں کو "برداشت" تو کر لیا جاتا ہے مگر کسی مسلمان کو وزیر کا عہدہ دینے کا حوصلہ اسے مسلمانوں کے وہاں قیام کے ساٹھ سال بعد ہی ہوا کہ ایک مسلم خاتون کو صرف اس شکر گزاری میں ملک میں پہلی بار کابینہ وزیر کا درجہ دیا گیا کہ وہ دو قانون شکن برطانوی عیسائی شہریوں کو صومالیہ سے سزا کے بغیر چھڑا لائی تھی لیکن یہ حقیقت کسی مسلمان کے لیے اتنی اہم نہیں ہے جتنی یہ بات کہ آدھی صدی سے زیادہ مدت سے برطانیہ میں مسلمان صنعت و تجارت اور زندگی کے دیگر میدانوں میں عزت کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں وہاں عوام کو مہیا کی جانے والے تمام شہری اور رفاحی سہولتوں سے فائدہ اٹھا رہے ہیں اگرچہ اس رواداری کے باوجود ان کے ایسے اسکولوں کو حکومت سرکاری امداد دینے سے انکار کرتی ہے جہاں عیسائی مذہبی اداروں کے اسکولوں میں عیسائی دینی تعلیم کی طرح اسلامی تعلیم دی جاتی ہے۔

حوالے

۱ قرآن حکیم، البقرہ ۲:۲۵۶۔ دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں ہے۔ بے شک واضح ہو چکی ہدایت گمرہی کے مقابلہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی، تفسیر عثمانی، مدینۃ المنورہ ۱۹۸۹، ص ۵۴۔ جب دلائل توحید بخوبی بیان فرمادئے گئے۔ تو عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہئے نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ

۲ کنروس، لارڈ، دی اورٹومن سنچریز، لندن، ۲۰۰۲، ۳۷

۳ فنکل، کیرولائن، عثمانز ڈریم، نیویارک، ۲۰۰۷، ۱۳۔

Finkel,Caroline, Osman's Dream, New York, 2007,

۴ کنروس، لارڈ، دی اوٹومن سنچریز، نیویارک، ۲۰۰۲، ۳۲۔

Kinross, Lord, The Ottoman Centuries, New York, 2002

32 بارٹوسس، مارک دی لیٹ بازنطائن آرمی، ص ۹۱ بحوالہ وکیپیڈیا: جنگ پیلیکانن۔

Marc C Bartusis, The late Byzantine Army.p.91

انالجک، خلیل، دی اوٹومن امپائر، لندن ۱۹۷۳، ۸۔۷

Inalcik Halil, The Ottoman Empire, London,1973,7-8

۵ فنکل، حوالہ بالا، ۱۴

۶ ایضاً، فنکل، ۱۴

۷ ایضاً فنکل، ۱۴، بحوالہ ذکریادو، دی امیریٹ آف کراسی، Zachariadou,۲۲۵ The Emirate of Karasi 225 ff نجیب آبادی، اکبر شاہ خان، تاریخ اسلام، کراچی ۱۹۷۹، ۳:۳۲۶۔ انالجک، حوالہ بالا، ۹

۸ انالجک، حوالہ بالا، ۹

۹ انالجک، حوالہ بالا، ۸۔۷ فنکل، ح ب، ۱۴ نجیب آبادی، ح ب ۳:۳۲۶

۱۰ نجیب آبادی، حوالہ بالا ۳:۳۲۹ فنکل، حوالہ بالا، ۱۲۔ انالجک، حوالہ بالا، ۹

۱۱ فنکل، حوالہ بالا ۱۴، انالجک، حوالہ بالا ، ۹

۱۲ فنکل، حوالہ بالا، ۱۵

۱۳ کنر وس، حوالہ بالا، ۳۲

۱۴ تفصیل کے لیے دیکھیے باب ۲:۱۴؛ باب ۸:۴

۱۵ ابن بطوطہ/گب، ایچ۔اے آر، دی ٹریولز آف ابن بطوطہ، نئی دہلی ۲۰۰۸، ۱۳۶

۱۶ کنر وس، حوالہ بالا، ۳۲

۱۷ نجیب آبادی، حوالہ بالا ۳۲۶:۳

۱۸ کنر وس ، حوالہ بالا، ۳۳

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوق اُر (استنبول یونیورسٹی۔ ترکی)

اردو زبان کے رسم الخط کے مسائل

(ترکی کے تجربات کے حوالے سے)

رسم الخط ایک زبان کے موجود ہونے کی ظاہری علامت ہے۔ رسم الخط کے ذریعے زبان بول چال کی سرحد سے نکل کر مرقوم ہونے کے دائرے میں آتی ہے اور اسی طرح سے وہ تاریخ کے اوراق میں ثبت ہوتی ہے اور رسم الخط، انسان کو اپنا مذہب، اپنی تاریخ، اپنی تہذیب، اپنی ثقافت، اپنا ادب اور شاعری آنے والی نسلوں میں منتقل کرنے کی سہولت فراہم کرتا ہے۔ لہٰذا رسم الخط اور زبان کا بہت ہی گہرا اور اٹوٹ رشتہ ہے جس کو توڑنے کی کوششوں سے زبان کو بہت حد تک نقصان اُٹھانا پڑتا ہے۔ کچھ سالوں سے اردو زبان اور اُس کے رسم الخط سے متعلق متضاد تجاویز اور خیالات پیش کیے جاتے رہے ہیں اور اُن پر کبھی کبھار ناخوش گوار بحث و مباحثہ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جس سے کوئی نتیجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے طرف دار اصحاب کا کہنا ہے کہ اردو رسم الخط مشکل ہے، اس میں کئی حروف ایک ہی آواز کے لیے ہیں، جن سے رسم الخط کی تدریس اور تکنیکی ترقی میں رکاوٹ پیش آتی ہے، اس لیے اس رسم الخط کو بدلنا چاہئے اور جدید ترسیلی ٹیکنالوجی جس میں انٹرنیٹ، سائبر سسٹم وغیرہ ہیں، اس میں اردو آسانی کے ساتھ رومن حروف میں لکھی جا سکتی ہے۔ آخر ترکی اور ازبکستان کے تجربات سے ثابت ہوا کہ زبان ترکی اور ازبک کا رسم الخط رومن اور روسی کرنے سے زبان ختم نہیں ہوئی بلکہ زبان کی ترقی ہوئی۔ مزید برآں ہندوستان میں کچھ اصحاب یہ بھی فرماتے ہیں کہ اردو رسم الخط دیوناگری میں تبدیل کرنے سے بھارت میں قومی یک جہتی بڑھ سکتی ہے (۱)

اس طرح کے اور خیالات جو اردو رسم الخط کی تبدیلی کے حق میں پیش کیے جاتے ہیں اُن سے ظاہر ہے کہ اردو کے عربی۔ فارسی سے ماخوذ رسم الخط کے طرفداروں میں ایک سخت قسم کا ردعمل

پیدا ہوتا ہے جس کا مختلف موقعوں پر مختلف اصحاب کی زبانی بیان ہوتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر معروف دانشور ڈاکٹر فتح فرمان پوری کو لیجیے وہ اپنی تصنیف ''اردو زبان وادب'' میں اس سلسلے میں فرماتے ہیں:

''زبان اور رسم الخط دو الگ الگ چیزیں نہیں ہیں، اُن میں جسم وروح کا تعلق ہے اور وہ ایک دوسرے سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتے، کسی نے صحیح کہا ہے کہ رسم الخط کو کسی زبان کا محض لباس سمجھنا غلطی ہے، لباس کو اتار کر پھینکا جا سکتا ہے، بدلا جا سکتا ہے، رسم الخط زبان کا لباس نہیں بلکہ اُس کی جلد کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے اُسے زبان سے الگ کرنے کا نتیجہ زبان کی تباہی کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا (۲)

اور پھر فتح پوری صاحب یوں کہتے ہیں:

''اس طرح کی اور کئی باتیں اردو رسم الخط کی خصوصیات میں شمار کی جا سکتی ہیں، لیکن اُن اوصاف کے باوجود بعض حضرات اردو رسم الخط کو جامع اور مکمل نہیں سمجھتے۔ اُن کے خیال میں ناگری (ہندی) اور رومن (انگریزی) رسم الخط زیادہ کارآمد اور سہل الحصول ہیں، بعض حلقوں کی طرف سے یہ آواز بھی اُٹھائی جاتی ہے کہ اردو رسم الخط قابلِ اصلاح ہے اور جب تک اُس میں مناسب اصلاحات نہیں کی جائیں گی اردو کی مقبولیت واشاعت محدود ہی رہے گی۔ بعض کا یہاں تک خیال ہے کہ اردو رسم الخط سرے سے ناقص ہے اور جب تک اُسے نہ بدلا جائے گا اردو کی ترقی کے امکانات روشن نہ ہوں گے۔ یہ باتیں غیروں کی طرف سے نہیں خود اُن لوگوں کی طرف سے کہی جاتی ہیں جو اردو ہی لکھتے پڑھتے اور بولتے ہیں۔ اس لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ اُن کی باتوں پر توجہ دی جائے۔ اگر یہ باتیں سچ ہیں تو انھیں قبول کر لیا جائے اور غلط فہمی یا اردو دشمنی کا نتیجہ ہیں تو اُن کی پُرزور تردید کی جائے۔'' (۳)

ڈاکٹر فرمان فتح پوری صاحب کی باتوں سے ہی یہ علم ہوتا ہے کہ اردو رسم الخط کا مسئلہ اب ایک احساساتی اور جذباتی مسئلہ بن گیا ہے اور اب اس موضوع سے متعلق جتنے بھی پہلو ہیں وہ

جذبات کے تحت پرکھے جائیں گے۔ اس موضوع میں آگے بڑھنے سے قبل اسلام آباد سے نکلنے والے موقر سہ ماہی ''الاقرباء'' کے ادارے کی جانب سے تحریر شدہ ''رسم الخط کے مباحث اور اردو کی تہذیبی شناخت'' کے عنوان سے اداریہ کی چند سطور یہاں درج کروں گا تا کہ اردو رسم الخط کی تبدیلی کا مسئلہ کیا رنگ پکڑنے لگا ہے وہ آشکار ہو جائے۔ اداریہ میں بتایا جاتا ہے:

''۔۔۔تاریخ کے ہر دور میں اردو کے ہاتھوں شکست کھانے والے حاسد و فاسد عناصر اردو کی تہذیبی شناخت کو مسخ کرنے پر تل گئے ہیں جس کا اظہار لاطینی یا رومن رسم الخط کی متبادل تجاویز کی شکل میں کیا جا رہا ہے۔ یہ تجاویز جو نصف صدی قبل بھی منظر عام پر لائی گئی تھیں اور جنھیں مسترد کر دیا گیا تھا، تدبر باختگی کی بدترین مثال ہیں کیونکہ اب نہ انٹرنیٹ اردو سے نا آشنا ہے اور نہ سیلولر نیٹ ورک۔ اردو نستعلیق ٹائپ مروّج ہونے کے بعد سے انٹرنیٹ پر اسکین شدہ اردو ترسیلات اور سیل فونز پر اردو پیغامات ایک معمول بن چکے ہیں لیکن بہانا بنایا جا رہا ہے اُن تارکینِ وطن کو جو اردو سے دُور اور انگریزی سے قریب آتے جا رہے ہیں۔ یہ حیلہ تراشی ہی بدنیتی کی مظہر ہے کہ بیرون ملک اردو میں زبان و ادب کے حق میں جو فضا پروان چڑھ رہی ہے اُس کا ثبوت کثرت سے منعقد ہونے والے مشاعروں اور دیگر تقریبات سے ملتا ہے۔ اردو صحافت کو بھی جو مغربی دنیا میں جو فروغ حاصل ہوا ہے وہ قابل رشک ہے۔ انگلینڈ اور امریکہ کے متعدد شہروں سے جن میں لندن اور شکاگو سرفہرست ہیں درجنوں کثیر الاشاعت اردو اخبار و رسائل باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں البتہ نئی نسل کے ایسے افراد رومن رسم الخط کا سہارا لینے پر مجبور ہو سکتے ہیں جو اپنی ولادت سے سنِ شعور کو پہنچنے تک مغربی معاشرہ کا حصہ بنے رہے ہیں اور جنھیں اردو زبان کی لطافت اور فصاحت و بلاغت سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ اپنی غیر ملکی معاشرتی، فکری اور تعلیمی نشوونما کے باعث۔ ع، خ۔ کھ، س۔ ص۔ ث، د۔ ڈ اور ت۔ ٹ۔ ط کے املا میں لطیف و بلیغ فرق کو سمجھنے سے قاصر ہیں اور اِن حروف کے متبادل انگریزی حروف کے استعمال سے وہ اردو زبان کی

تہذیبی شناخت سے بھی اس حد تک نابلد ہو چکے ہیں کہ وہ ''خر'' اور ''کھر'' کے لیے انگریزی زبان میں یک ہی املا یعنی 'Khar' '' پر قانع ہیں۔''

ان سطور سے بھی یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اردو رسم الخط کی تبدیلی کے خواہش مند افراد حاسد، فاسد اور اردو دشمن ہیں ایک اجنبی ہونے کی حیثیت سے میں اس وضاحت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکوں گا کہ وہ حاسد، فاسد اور اردو دشمن ہیں ویسے بھی میرے لیے اردو کے رسم الخط کی تبدیلی کے خواہش مندوں کے دلوں میں کیا نیت ہے اور اُن کا در پردہ کوئی مقصد بھی ہے؟ اُس کا اندازہ لگانا ناممکن ہے مگر میں یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ اب یہ مسئلہ احساساتی موضوع بن ہی گیا ہے اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا اور اس کے بعد بھی یہ مسئلہ کئی کانفرنسوں اور سیمناروں کا موضوع بنتا جائے گا۔

دراصل اردو رسم الخط کی تبدیلی پر آج تک اتنا زیادہ بحث و مباحثہ ہوا ہے کہ اب اس موضوع میں کوئی نئی بات کہنے کی گنجائش نہیں رہی ہے۔ اس لیے میں بھی اس موضوع کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کروں گا، مگر جہاں تک مجھے اندازہ ہے کانفرنس ☆ کے منتظمین نے مجھے یہ موضوع دیتے ہوئے اس بات کو بھی مد نظر رکھا ہوگا کہ مجھ سے یعنی ایک ترک سے، ترکی میں رسم الخط کی تبدیلی کے اسباب و نتائج کیا تھے اور اُن کے اردو رسم الخط کے مستقبل کے مسائل سے کس طرح تعلق قائم کیا جا سکتا ہے؟ اور اردو بولنے والے نوجوان یا نئی نسلیں ترکی کے تجربات سے کیا سبق حاصل کر سکتی ہیں؟

میں یہاں ترکی میں رسم الخط کی تبدیلی کے بارے میں کچھ تشریحات دیتے ہوئے پھر اردو کے رسم الخط کی جانب آنا چاہوں گا۔ ترکی میں عربی رسم الخط کی مشکلات کو دُور کرنے کی تحریکیں عثمانیوں کے آخری عہد میں شروع ہوئی تھیں۔ معروف دانشور اور معلم مُنیف پاشا نے عثمانی زبان کے رسم الخط کی تبدیلی کے لیے اُس عہد کے بادشاہ سلطان عبدالعزیز کی خدمت میں عرضداشتیں لکھی تھیں۔ پھر پہلی جنگ عظیم سے قبل انور پاشا نے عربی حروف کو الگ الگ لکھ کر

☆ اُس کانفرنس کی طرف اشارہ جس میں فاضل مقالہ نگار نے زیر نظر تحریر پیش فرمائی (ادارہ)

پڑھنے لکھنے میں آسانی پیدا کرنے کی تحریک شروع کی تھی اُن کے خیال میں بالخصوص ہاتھ کی لکھائی سے ارسال ہونے والے احکامات سے عسکریہ میں کبھی کبھار غلط فہمیاں پیدا ہو جاتی تھیں جن کی وجہ سے فوج کو مختلف مشکلات کا سامنے کرنا پڑتا تھا۔ لہٰذا عربی حروف کو سرے سے ختم نہ بھی کریں کم از کم اُن میں اصلاح کی گنجائش ہے اس طرح سے فوج میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد بھی بڑھ جائے گی

ان معلومات سے یہ امر ظاہر ہو جاتا ہے کہ عثمانیوں کے آخری دور میں عثمانی رسم الخط میں یعنی عربی حروف کو تبدیل کرنے کی تحریکیں پہلے سے موجود ہیں اور جمہوریہ ترکیہ کے بانی مصطفیٰ کمال اتاترک نے بھی ترکی حروف کو تبدیل کرنے کا اقدام کیا۔ اُس زمانے کے اکثر مغربی تعلیم یافتہ ترک نوجوان بلکہ نوجوان ترک افسروں کے ذہنوں میں یہ خیال تھا کہ اس رسم الخط کو یا ترقی دینا چاہیئے یا سرے سے بدل دینا چاہیئے۔ اتاترک اس رسم الخط کو سرے سے تبدیل کرنے کے خواہش مندوں کی صف میں تھے۔

۱۹۲۳ء میں ازمیر (سمرنا) اقتصادی کانفرنس میں اس سلسلے میں اقدام کیا گیا تھا مگر اُس کانفرنس کے صدر قاظم قرہ بکر پاشا جو کہ اسلامی خیالات کے مالک تھے نے اس کی اجازت نہیں دی۔ اُس کے بعد ۱۹۲۴ء میں خلافت کے خاتمے کے بعد ۱۹۲۸ء میں رسم الخط کی تبدیلی کی باری آئی تھی۔ اتاترک کے اشارے پر ۸ جنوری ۱۹۲۸ء کو محمود اسعد نے ترک اوجاغی (انجمن ترک، ترکی کی ایک قوم پرست تنظیم) کے ہال میں ترکی رسم الخط کی تبدیلی کی ضرورت کے بارے میں ایک لیکچر دیا۔ پھر ۸ فروری ۱۹۲۸ء کو پہلی بار استنبول میں خطبۂ جمعہ ترکی زبان میں دلوایا گیا جو اُس وقت تک عربی زبان میں دیا جاتا تھا۔ ۲۴ مئی ۱۹۲۸ء کو رومن گنتیوں کو ترک گنتی بنایا گیا۔ ۲۸ جون کو ترکی حروف کی تبدیلی جسے ترکی میں ''انقلابی حروف'' کہتے تھے کے آغاز کے لیے جو انجمن منعقد ہوئی اُس میں اس نقلاب کو کتنے عرصے میں عملی جامہ پہنانا ہے اُس پر بحث ومباحثہ ہوا، اُس وقت کے وزیراعظم عصمت پاشا نے اس کے لیے سات سال کی ضرورت پر زور دیا مگر صدر مصطفیٰ کمال پاشا نے ان تمام تبدیلیوں کو صرف چھ ماہ میں کرنے کا حکم دیا۔

۱۹ اگست ۱۹۲۸ء کو استنبول خلق ریسٹورینٹ میں اپنی کی ہوئی تقریر میں مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے کہا:

''نئے ترک رسم الخط کو تیزی سے سیکھنا چاہئے۔ اس کو ایک قوم پرستی یا ایک وطن پرستی کی ذمہ داری مان لینا چاہئے۔ نئے ترکی رسم الخط کو ہر ترک شہری کو، ہر مرد اور عورت کو، ہر قلی اور ہر کرسی بنانے والے تک کو سکھا دینا ہم پر فرض ہے۔ اس فرض پر عمل پیرا ہوتے ہوئے یہ امر ذہن نشین کیجئے کہ اگر اس قوم کے دس یا بیس فی صد کو پڑھنا لکھنا آجائے اور اسی فی صد ان پڑھ رہے تو یہ کتنی شرم کی بات ہے۔''

اُسی دن سے ایک طرف مصطفیٰ کمال پاشا نے اپنے دولت کدہ میں ایک تختہ سیاہ لگا کر مختلف لوگوں کو اُدھر بلا کر انھیں نئے رسم الخط کی تعلیم دینے کی سرگرمیاں شروع کرائیں اور دوسری جانب وزیر اعظم عصمت ان ادنو اور دوسرے پارلیمنٹ ممبروں نے اپنے اپنے علاقوں میں جا کر اس انقلابی تحریک میں معلم کی حیثیت سے حصہ لیا۔ یکم نومبر ۱۹۲۸ء کو مصطفیٰ کمال پاشا نے ترکی پارلیمنٹ کی افتتاحیہ تقریر میں یوں کہا:

''اس عظیم قوم کو اُس کی سعی اور کوششوں کو ضائع کر کے لاوارث چھوڑنے والے بنجر راستے سے ہٹا کر آسان پڑھنے لکھنے کی چابی دینا لازمی ہے۔''

اُسی دن یعنی یکم نومبر ۱۹۲۸ء کو ترکی میں 'رسم الخط کی تبدیلی کا قانون' اتفاق رائے سے قبول کیا گیا اور سرعت کے ساتھ اُس پر عمل ہوا اور ترکی میں ''انقلابِ رسم الخط'' کامیابی کے ساتھ مختصر سی مدّت میں نافذ کیا گیا۔ (۵)

یہ مسئلے کا ایک پہلو ہے جو اس کے تاریخی سلسلے کا بیان گر ہے اس کے دو اور پہلو ہیں جنھیں ہمیں یہاں پیش کرنا ہے وہ ہیں اس رسم الخطی انقلاب کے اسباب اور نتائج کیونکہ ان کا اردو رسم الخط سے بھی تعلق ہے۔

میرے خیال میں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ اُس زمانے میں ترکی انقلاب کے

بانیوں کے ذہنوں میں ایک عام خیال یہ تھا کہ عثمانی سلطنت کے زوال کا سبب، پے در پے آنے والی شکستوں کی وجہ اور ملک کو خراب و پریشاں کر دینے والی طاقت اُس عہد کا خلیفہ، اُس کے آس پاس مجتمع مذہبی لیڈر اور صوفیا ہیں۔ سلطان یا خلیفۂ مومنین کی اُن کی نظر میں کوئی بھی اہمیت نہیں تھی کیونکہ اُن کی نظر میں خلیفہ کا کوئی بھی مقدس مقام نہیں تھا۔ اُن کے لیے خلیفہ صرف ایک مخالف طاقت کا لقب تھا جو ترکی فوج کے نوجوان افسر اور سیاسی آزادی کے خواہش مند تعلیم یافتہ نسل کو سخت نگرانی میں رکھ کر جیلوں میں بھیجتی تھی۔ یعنی خلیفہ اُن کی نظر میں ایک مہلک دشمن تھا، ایک قابلِ احترام مقدس شخصیت نہیں۔ پھر علمائے دین بھی اُن کے مخالف تھے جو خلیفہ کے ہر حکم کی اندھا دھند تعمیل کرتے تھے یہاں تک کہ جنگ آزادی کے دوران شیخ الاسلام نے اجنبی طاقتوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے والے آزادی خواہوں کے لیڈر بالخصوص مصطفیٰ کمال پاشا کی موت کا فتویٰ جاری کیا تھا اوپر سے صوفی شیخ و مرشد اور پیر جو صدیوں سے ترکی کے لوگوں کے جاہل رہنے کے اصل مجرم سمجھے جاتے تھے اُن میں سے اکثر آزادی کی جنگ کے مخالف تھے۔

مزید برآں بالخصوص سعودی عرب اور عثمانی سلطنت کے دوسرے عربی علاقوں میں اور البانیہ میں ترک فوج اور عام ترک آبادی کے ساتھ جو ظلم و ستم ہوا تھا اور ملک واپس آنے کی کوشش کرنے والی ترکی فوج کے سپاہی اپنے مسلمان عرب بھائیوں کے ہاتھوں بے دردی سے شہید کیے گئے تھے اس بات نے اُس زمانے کے ترک افسروں کے دلوں میں اسلامی اخوت اور برادری کے خیالات کو نیست و نابود کر رکھا تھا۔ یہ کیسے مسلمان بھائی تھے اور یہ کیسا اسلام تھا جو مسلمان بھائی کا اپنے مسلمان بھائی کو قتل کرنے سے روک نہیں پا رہا تھا۔

چونکہ یہ مختلف گروہ بظاہر مذہب اسلام سے تعلق رکھتے تھے اور اسلام کا پرچم اُٹھائے پھرتے تھے لہٰذا اس خون و غارت کے عالم کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھنے والے اُن ترک افسروں کی نگاہ میں ترکی کے زوال کا واحد سبب خود مذہب اسلام تھا۔

دوسری جانب بات یہ بھی تھی کہ چونکہ سیاسی آزادی خواہ نوجوان افسر اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ

مغرب میں تعلیم حاصل کر کے آ رہے تھے اور اُن کی نظر میں عثمانی سلطنت کے لیے زوال سے بچنے کا واحد راستہ مغربی ترقیات، جدید ٹیکنیک اور سیکولر سسٹم سے ہم کنار ہونا تھا اس لیے اسلام سے دُور ہو کر مغربی سیکولر سسٹم کا ایک حصہ بننا ہی ملک کی ترقی اور پھر سے خودمختاری حاصل کرنے کا مسیحا ہے

ان جیسے نکات کو مدنظر رکھتے ہوئے آزادی کے طلبگار فوجی افسر جن میں مصطفیٰ کمال پاشا اور عصمت انِ اونو سرفہرست تھے ۔ یہ کمانڈر اور بعد میں سیاسی لیڈر یہ چاہتے تھے کہ صدیوں سے جاری اسلامی نظام جو ملک کی پریشانی کا واحد مسبب تھا اُس کو بالکل ختم کر دیا جائے اور ایک نیا، جدید اور سیکولر ملک قائم کیا جائے جو یورپ کی ترقیات کی جانب دوڑتا چلا جائے ۔ اسی طرح پہلے سلطنت اور پھر خلافت کا خاتمہ کیا گیا، روایتی لباس اور بالخصوص نقاب اور پگڑی کی ممانعت ہوئی اور پھر ترکی کے پُرانے رسم الخط جو "عثمانی رسم الخط" کہلاتا تھا اُس کی جگہ "لاطینی حروف" یعنی "رومن رسم الخط" قائم کیا گیا ۔ یہ "رسم الخط کا انقلاب" ترکی میں سرعت کے ساتھ پھیلایا گیا کیونکہ جیسے کہ مصطفیٰ کمال پاشا اتاترک نے خود فرمایا تھا اُس وقت ترکی میں پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد دس یا بمشکل بیس فی صد تھی اور اکثر تعلیم یافتہ جوان مختلف جنگوں میں شہید ہو چکے تھے ۔ جس طرح ہماری فیکلٹی جو اُس وقت ترکی کا واحد جدید اعلیٰ تعلیمی ادارہ تھا اور جس کا نام "دارالفنون" تھا میں ۱۹۱۵ء جنگ درہ دانیال کے دوران ایک بھی طالب علم فارغ التحصیل نہیں ہوا کیونکہ سب کے سب آخری کلاس کے طلبہ جنگ میں جا کر شہید ہو چکے تھے ۔ اس لیے اُس زمانے میں تعلیم یافتہ لوگ بہت ہی کم تھے ۔ جو باقی اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ تھے وہ ویسے بھی فرانسیسی کی تعلیم حاصل کیے ہوئے تھے اور انھیں بخوبی فرانسیسی زبان اور اُس زبان کی وجہ سے رومن رسم الخط آتا تھا ۔ یعنی اُن کے لیے اس نئے رسم الخط کا سیکھنا کونسا مشکل کام تھا باقی لوگ جو متوسط یا ابتدائی تعلیم یافتہ لوگ تھے اُن کو تو یہ نیا رسم الخط سکھا ہی دیا گیا ۔

اب ترکی میں رسم الخط کی اس تبدیلی کے کیا نتائج تھے؟ یہ سوال تو راقم الحروف سے مختلف مواقع پر کیا جاتا ہے تو میں کہتا ہوں کہ آپ کونسی عینک لگائے ہوئے ہیں اس سوال کے جوابات اُس

کے مطابق بدلتے ہیں۔ میرا مطلب اگر آپ سیکولر عینک لگائے ہوئے ہیں تو ترکی میں اس تبدیلی کے بہت ہی مفید نتائج ظہور پذیر ہوئے ہیں۔ اس تبدیلی سے ملک میں سیکولر سسٹم زیادہ مضبوط ہوا ہے لوگ اپنی اسلامی بنیادوں سے (اُن کے بزعم خود جہالت سے) دور ہوئے ہیں، جدید مغربی سائنس سے روشناس ہوئے ہیں، ملک میں ماڈرنزم کا پرچم بلند ہوا ہے، بچے جلدی سے پڑھنا لکھنا سیکھ جاتے ہیں (واقعتاً سیکھ لیتے ہیں کیونکہ زیادہ سے زیادہ دو تین ماہ میں بچے پڑھنا سیکھ لیتے ہیں اور پانچ چھ ماہ میں لکھنا بھی انھیں بخوبی آجاتا ہے۔) وغیرہ۔

اس کے برعکس اگر آپ سیکولر نہیں تو اسلامی عینک لگائے ہوئے ہیں تو اس انقلاب کے بہت ہی نقصان دہ نتائج نکلے ہیں۔ ایک تو لوگوں کو اپنی اسلامی بنیادوں سے اکھاڑ دیا گیا ہے اور نئی نسلیں لادینیت کی طرف بہنے لگی ہیں، لوگوں کے چھ سو سال سے زیادہ کا تہذیبی اور ثقافتی ورثہ بہ یک دم نیست و نابود ہو گیا ہے۔ اور لوگ ایک ہی رات میں محض جاہل رہ گئے اور چند ایک ماہ میں نہ چھوٹی سی درخواست لکھنے اور نہ ہی اخبار پڑھنے کے قابل رہے، وغیرہ

اگر آپ مجھ سے اس بارے میں پوچھیں گے کہ آپ کا کیا خیال ہے یا آپ نے کس طرح کی عینک پہن رکھی ہے تو میں کہوں گا کہ میں سرکاری ملازم ہوں اس بارے میں بس "No comment" کہہ سکتا ہوں۔ مذاق ایک طرف مذکور خیالات میں سے دونوں میں کچھ کچھ صحیح نکات موجود ہیں۔ یعنی میری عینک جو ہے مخلوط رنگ کی ہے اور میں اکثر یہ کہتا ہوں کہ ترکی میں جو ہوا ہے سو ہوا ہے اب اُس کی نوحہ خوانی کی کیا ضرورت مگر ترکی میں جو ہوا صرف سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر ہوا تھا یہ یاد رکھنا چاہئے۔ اب ہمیں اردو کی طرف دیکھنا اور اُس کے بارے میں سوچنا چاہئے۔

اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو میں رسم الخط کی تبدیلی کی ضرورت ہے یا نہیں تو میں کہوں گا کہ بالکل ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اردو کا رسم الخط ایک مکمل رسم الخط ہے جس میں کسی طرح کی بھی تبدیلی یا اصلاح کی گنجائش بالکل نہیں۔

اب اگر آپ رومن یا انگریزی رسم الخط کے اپنانے کی بات کریں گے تو میں یہ کہوں گا کہ انگریزی رسم الخط خود ناقص اور اصلاح طلب رسم الخط ہے وہ لوگ کچھ اور لکھتے ہیں اور کچھ اور پڑھتے ہیں اور حرفوں کا تلفظ جگہ جگہ تبدیل ہو جاتا ہے، انگلستان اور امریکہ میں بچوں کو سالوں تک صحیح تلفظ اور املاء کی تعلیم دینے کے باوجود انگلستان کے پرانے وزیر اعظم ثانی بلئیر سمیت بڑے بڑے لوگ لکھنے میں غلطیاں کرتے ہیں تو اس کو دیکھتے ہوئے آپ لوگوں میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہوتا ہے کہ اس ناقص رسم الخط کو اپنا لیں اور اپنے مکمل اور تہذیب یافتہ (میں تہذیب یافتہ کا لفظ یہاں بوجوہ استعمال کرتا ہوں) رسم الخط کو ترک کریں۔

آپ اگر یہ کہیں گے کہ اردو کے اس رسم الخط کو یاد کرنا بہت مشکل ہے اور اردو رسم الخط بچوں کی تعلیم میں مشکلات کھڑی کر دیتا ہے تو میں آپ سے یہ کہوں گا کہ چینی زبان کے معمولی سے اخبار پڑھنے کے لیے چین کے لوگ چار پانچ سو شکلیں یاد کر لیتے ہیں اور جاپان کے لوگ اپنی کتابوں کو پڑھنے کے لیے چینی شکلوں "Kanji" کے علاوہ دو اور رسم الخط جن کا نام "Hiragana" اور "Katakana" ہے، سیکھتے ہیں اور یہ اُن کے بچوں کی تعلیم کے سامنے رکاوٹ بن کر نہیں آتا ہے تو کیا اردو کے باون حروف کو یاد کرنا اتنی ہی مشکلات پیدا کرتا ہے۔؟

آپ اگر یہ کہیں گے کہ اس ٹیکنالوجی کے زمانے میں بالخصوص انٹرنیٹ میں اردو کے رسم الخط کو استعمال کرنا کافی مشکل ہے بلکہ ناممکن ہے تو میں یہ کہوں گا کہ جب کہ چین اور جاپان کے لوگ اپنے مشکل سے مشکل رسم الخط میں یہ تمام کام کر پاتے ہیں اور بہت تیزی سے ترقی بھی کر لیتے ہیں اور پھر اوپر سے عربی اور فارسی بولنے والے اس کام میں کامیاب ہو پاتے ہیں تو صرف بے چاری اردو کو بولنے والے اصحاب اس میں کامیاب کیوں نہیں ہو پاتے ہیں؟ پھر اس میں کس کا قصور ہے زبان اور رسم الخط کا یا اپنی زبان کو نیٹ میں استعمال کرنے سے گریزاں نخرے والے معزز اصحاب کا؟ میں ترکی میں اپنے گھر میں بیٹھے ہوئے Micro Soft کے پروگرام میں ایک کلک کر کے اردو حروف استعمال کرنا شروع کر سکتا ہوں تو پاکستان یا ہندوستان میں بیٹھے ہوئے یا دنیا کے

کسی بھی ملک میں رہتے ہوئے وہ لوگ یہ کام کیوں نہیں کر سکتے ہیں۔ یہ ایک کلک کی بات ہے اس کے لیے بہت کوشش بھی نہیں کرنی پڑتی ہے۔

مجھے تو سوال کرنے کا بہت شوق ہے۔ اس لیے میں ان تمام تشریحات کے بعد اردو کے رسم الخط کو بدلنے کے خواہشمند اردو بولنے والے دوستوں سے کچھ سوالات کرنا چاہوں گا۔

یکم۔ کیا آپ صدیوں پر مشتمل تہذیبی، ثقافتی اور ادبی ورثہ کو الوداع کہنا چاہتے ہیں کیونکہ ترکی میں رسم الخط بدلنے کا نتیجہ یہی ہوا ہے اور آج تک ترکی میں ہم پرانی ترکی یا عثمانی ترکی کے ادبی اور تہذیبی ورثہ کی بازیابی کے لیے کوشاں ہیں اور ابھی تک اس کو مکمل نہیں کر پائے

دوئم۔ کیا آپ اسلام سے دُور ہو کر ایک نیا سیکولر نظام قائم کرنا چاہتے ہیں؟ کیونکہ ترکی میں رسم الخط کی تبدیلی کا ایک اہم سبب یہ بھی تھا۔

سوئم۔ کیا آپ اردو کی مرکزی اور ہمہ گیر خصوصیت کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟ کیونکہ عثمانیوں کے زمانے میں استنبول میں شائع ہونے والی ایک کتاب ازبکستان میں بھی پڑھی جاتی تھی کیونکہ عربی رسم الخط میں لہجوں کا پتہ نہیں چلتا تھا۔ ترکی اور دیگر ترکی ریاستوں میں رسم الخط کے بدلنے کی وجہ سے ایک خلاء پیدا ہوا اور اب ہم لوگ بولتے ہوئے ایک دوسرے کو سمجھتے بھی ہیں مگر بمشکل! اب چین میں لکھی گئی ایک کتاب کو جاپان والے سمجھ لیتے ہیں کیونکہ وہ چینی حروف یا شکلوں کو جانتے ہیں حالانکہ انھیں چینی زبان کا ایک لفظ بھی نہیں آتا جب وہ پڑھتے ہیں تو اپنی زبان میں پڑھتے ہیں مگر شکلوں کی وجہ سے مطلب نکالتے ہیں۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ترکی ریاستوں میں جب روسی اقتدار قائم ہوا تھا تو روسیوں نے پہلے اُن کے رسم الخط کو عربی سے رومن میں تبدیل کرایا اور جب ترکی میں رومن حروف کا سلسلہ جاری ہوا تو اُنھوں نے اُن کے رسم الخط کو رومن سے روسی یعنی کریل رسم الخط میں بدل دیا تھا تا کہ اُن کا ترکی سے تعلق بالکل ختم کیا جائے۔ یعنی اس کے درپردہ سیاسی اغراض تھے۔ اب ہندوپاک کے مختلف علاقوں میں اردو کے مختلف لہجے ہیں۔ اگر رومن حروف استعمال کریں

گے تو اُن کو بھی تحریر میں لائیں گے اور پھر تماشا دیکھئے کہ ایک اردو کی کتنی شکلیں سامنے آئیں گی اور اردو کی جو مرکزیت اور ہمہ گیری ہے وہ کس طرح ختم ہوگی۔

چہارم۔ اگر آپ یہ کہیں گے کہ رومن حروف لائیں گے تو انگریزی جاننے والے تمام لوگ بہ آسانی رومن حروف استعمال کرنے لگیں گے تو میں یہ کہوں گا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ جو لوگ انگریزی تعلیم سے محروم رہے یا جنھیں بس انگریزی کی ناکافی شُد بُد حاصل ہے وہ ایک رات میں محض اَن پڑھ جاہل ہو جائیں۔ کیونکہ ترکی میں یہی ہوا تھا اور میری نانی جان سمیت جو اسلامی خیالات کے مالک خاندانوں کی لڑکیاں تھیں جنھیں جدید سیکولر اسکولوں میں نہیں بھیجا گیا تھا وہ آخر عمر تک اَن پڑھ رہی تھیں کیونکہ وہ عربی حروف پڑھتی تھیں مگر انھیں رومن رسم الخط نہیں آتا تھا۔ پاکستان اور ہندوستان میں بھی اگر رسم الخط کی تبدیلی ہوئی تو سلسلہ یہی ہوگا جو ترکی میں ہوا تھا اور گھر میں یا مدرسوں میں قرآن مجید پڑھنے کی وجہ سے اردو پڑھنا سیکھنے والی لڑکیاں اور لڑکے یک دم جاہل ہی رہ جائیں گے۔

آخر میں میں اردو داں دوستوں سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ کیا اردو کا کوئی اور مسئلہ باقی نہیں رہا جو اردو کے رسم الخط پر آکر اٹک جاتے ہیں اور اس پر قلم فرسائی کرتے جاتے ہیں؟ جب کہ پاکستان میں اردو کو سرکاری زبان بنانے پر ٹھیک طرح سے عمل پیرا نہیں ہو پاتے ہیں اور تعلیمی نظام انگریزی کے ڈھانچے پر رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور چھوڑیئے انھیں۔ پیارے پاکستانی والدین اپنے بچوں کی تعلیمی صلاحیت سے زیادہ اُن کے فر فر انگریزی بولنے پر فخر محسوس کرتے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے میں کہتا ہوں کہ کم از کم اس زبان کو چھوڑیئے اپنے رسم الخط کے ساتھ وابستہ رہیئے کیونکہ یہ رسم الخط اس کی عزت ہے اس کی عظمت ہے۔

حوالے

۱۔ سید تقی عابدی، ''اردو کو درپیش بنیادی مسائل، املا، رسم الخط، کمپیوٹر'' اردو اور عصر حاضر عالمی کانفرنس، کراچی ۲۰۱۲ء ص ۱۳۸!

۲۔ فرمان فتح پوری، اردو زبان وادب، لاہور ۲۰۰۵، ص ۲۳

۳۔ ایضاً ، ص ۱۷

۴۔ اداریہ ''رسم الخط کے مباحث اور اردو کی تہذیبی شناخت''، سہ ماہی الاقرباء، سالنامہ ۲۰۰۹ء اسلام آباد جنوری۔ مارچ ۲۰۰۹ء ص ۶۔۷

5۔ Ismet Giritli, " Harf Inkilabi ve Ataturk", Ataturk Arastirma Merkezi Dergisi, November 1988,no 13 http//atam.gov.tr/harf.inkilabi.ve.atatu/k

گزارش

بعض موصولہ نگارشاتِ نظم ونثر ''الاقرباء'' میں بوجوہ شائع نہیں کی جاسکتیں جس کے لیے ادارہ معذرت خواہ ہے تاہم ایسے مسودات کے محترم مرسلین سے گذارش ہے کہ وہ اپنی تحریروں کی نقل اپنے پاس محفوظ فرمالیا کریں کیونکہ ادارہ کے لیے انہیں واپس بھیجنا ممکن نہیں۔ شکریہ

پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ (انڈیا)

علی سردار جعفری کی غزلیہ شاعری

اردو شاعری کی تاریخ میں بیسوی صدی کی چوتھی اور پانچویں دہائی کو ترقی پسند شاعری کی دہائی قرار دیا جاتا ہے اس نظریے سے وابستہ شعرا میں اپنے تخلیقی معیار کی بنا پر علی سردار جعفری کو ایک عہد آفریں شخصیت اور اپنے دور کی نمائندہ آواز تسلیم کیا جاتا ہے۔ فکر وفن کا ارتقا جو سردار کی شاعری کی بنیادی خصوصیت ہے اس عہد کے کسی اور شاعر کے یہاں اتنی شدت کے ساتھ نظر نہیں آتا۔ جعفری کی شاعری معاشرتی تغیرات کے جس وسیع تناظر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے نظر آتی ہے وہ انھیں کا حصہ ہے۔ وہ ترقی پسندی کے علمبردار تھے، انھوں نے اپنے نظریات اور افکار کی تبلیغ و اشاعت کے لیے شاعری کو موثر وسیلے کے طور پر استعمال کیا۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ بیشتر شعرا نے غزل کو معتوب قرار دیا اور نظم کو اہمیت دی۔ لیکن غزل کا طلسم کچھ ایسا تھا کہ کٹر سے کٹر شعراء بھی چاہنے کے باجود اس صنف سے دامن نہ بچا سکے۔ سردار جعفری اس کی ایک عمدہ مثال ہیں۔ سردار ان کٹر ترقی پسندوں میں سے ہیں جنھوں نے آغاز سے لے کر تحریک کے دم توڑنے تک اور اس کے بعد تحریک کو زندہ تصور کر کے جو شاعری کی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مینی فیسٹو کے مطابق نظریات کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ ان کے اندر بیٹھا ہوا شاعر اپنے اظہار کے لیے بے ساختہ طور پر صنف غزل کو منتخب کر لیتا ہے۔ سردار نے نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں میں بھی زندگی کے ٹھوس حقائق کا دوٹوک اظہار کیا ہے۔ محبت کو اس کی حقیقی شکل میں پیش کیا ہے۔ خوابوں کے طلسم کو توڑا اور زندگی کے بے معنی اور غیر حقیقی رشتوں کو مسترد کیا ہے۔ غربت و افلاس اور ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت غلامی کا کرب آزادی کی تمنا اور امن کا خواب جیسے موضوعات کو اپنی غزلوں کا موضوع بنایا ہے۔ سردار کے بیشتر مجموعوں میں غزلیں موجود ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ سردار کی غزلیں ان کی نظموں سے کم طاقتور نہیں ہیں۔ بلکہ نظموں کی بہ نسبت وہ اپنی غزلوں میں زیادہ

کامیاب نظر آتے ہیں۔اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سردار کا شمار غزل گو شعرا میں کیا جائے۔بنیادی طور پر وہ نظم نگار ہیں۔لیکن جب غزل کہتے ہیں تو پھر وہ غزل کی روایت اور اس کی ہمہ جہتی خصوصیات کے باوصف شعری اظہار کو ایسا رنگ عطا کرتے ہیں جو بالکل منفرد ہے۔

پندرہ سولہ برس کی عمر میں سردار جعفری نے ایک مرثیہ گو شاعر کی حیثیت سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد مزید تعلیم کے لیے وہ علی گڑھ آئے۔لیکن اپنی انقلابی تقاریر کے ذریعہ ہنگامہ برپا کرنے کے جرم میں کالج سے نکال دیئے گئے۔اس طرح اینگلو عربک کالج دہلی سے بی۔اے کرنے کے بعد جب وہ لکھنؤ یونیورسٹی میں داخل ہوئے تو یہاں بھی اپنی ہنگامہ خیز تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ فضا کو متاثر کیا اور انھیں جیل کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں۔دراصل سردار اپنے وطن بلرامپور میں اسکول کے زمانے ہی سے ایسے واقعات وحادثات کا سامنا کر رہے تھے جو ان کے ذہن ومزاج سے میل نہیں کھاتے تھے۔یہی سبب ہے کہ انھیں ہر اُس چیز سے نفرت ہوگئی تھی جس سے امارت کی ذرا بھی بو آتی تھی۔اس ذہنی کیفیت میں وہ علی گڑھ آئے جہاں اختر رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، منٹو، مجاز، خواجہ احمد عباس، جاں نثار اختر آل احمد سرور جیسے طالب علموں اور ڈاکٹر عبدالعلیم، ڈاکٹر رشید جہاں اور ڈاکٹر محمد اشرف جیسے اساتذہ سے ان کی ملاقات ہوئی۔جن کی محبت اور فیض نے نہ صرف ذوق ادب بلکہ جذبۂ حریت کو جلا بخشی۔لیکن آزادی کے بعد جس طرح کے حالات رونما ہوئے اس سے جعفری نے نہ صرف نظموں بلکہ اپنی غزلوں میں بھی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔"خون کی لکیر" (۱۹۴۹ء) میں شامل غزلیں اس بات کا بین ثبوت ہیں۔صرف ایک غزل کا انداز رومانی ہے جس میں سردار نے عشقیہ جذبات کو پیش کرتے ہوئے محبوب سے اپنی محبت کی تمام تر کیفیتوں کو بڑے ہی والہانہ انداز میں بیان کیا ہے۔خاص طور ر ابتدائے عشق میں معشوق جس طرح کی کیفیت سے دوچار ہوتا ہے اس کا ذکر انھوں نے مختلف طرح سے کیا ہے۔چند اشعار ملاحظہ کریں۔

حسن کی رنگیں ادائیں کارگر ہوتی گئیں　　　عشق کی بے باکیاں بے باک تر ہوتی گئیں

یاں مری بہکی ہوئی نظریں بہکتی ہی رہیں وہاں نگاہیں اور بھی کچھ معتبر ہوتی گئیں
زندگانی اپنے نشتر آزماتی ہی رہی ان کی نظریں بخیۂ چاک جگر ہوتی گئیں

مذکورہ غزل میں ایک حسین دوشیزہ سے محبت والتفات اور ہجر ووصال کی باتیں کی گئی ہیں اور اس کے مطابق الفاظ کا استعمال بھی کیا گیا ہے۔ البتہ بقیہ غزلوں کا رنگ جداگانہ ہے۔ ان میں نہ تو محبوب ہے اور نہ عشق بلکہ اشتراکی نظریہ کی تبلیغ اور حکومت بیزاری اور برہمی کا اظہار کیا گیا ہے۔ غرض یہ کہ جن موضوعات کو سردار نے نظموں میں پیش کیا ہے ان ہی موضوعات کو غزل میں بھی پیش کر دیا ہے مثلاً یہ اشعار دیکھیں

سکوں میسر جو ہو تو کیونکر، ہجوم رنج محن وہی ہے بدل گئے ہیں اگرچہ قاتل، نظام دار و رسن وہی ہے
فریب یہ کس نے دیا ہے کس نے کہ حریت کی برات آئی ترنگی چلمن اٹھا کے دیکھو تو ساحرِ مکر و فن وہی ہے
ابھی تو جمہوریت کے پردے میں نغمۂ قیصری چھپا ہے نئے ہیں مطرب اگر تو کیا ہے نوائے ساز کہن وہی ہے
وہی ہے سرمایہ دار و مزدور کی کشاکش جو کل تلک تھی لہو میں بھیگا ہوا زمانے کے جسم پر پیرہن وہی ہے
لبوں پہ مہریں لگی ہوئی ہیں زباں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں وہی ہیں آدابِ محفل اب بھی طریقۂ انجمن وہی ہے

فریب دے کر حیات نو کا حیات ہی چھین لی ہے ہم سے ہم اس زمانے کا کیا کریں گے اگر یہی ہے نیا زمانہ

امتحاں بزم وطن میں ہے وفاداری کا اہرمن تخت نشیں ہے اسے یزداں کہیے
رات دن کیجئے سرکار کی چوکھٹ کا طواف اور اسے حاصلِ جاں، حاصلِ ایماں کہیے

سردار نے غزلوں میں جو انقلابی اور باغیانہ رویہ اختیار کیا ہے وہ نظموں کی بہ نسبت زیادہ ادبی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ اسلوب ایسا اختیار کر لیا ہے جس سے غزل کی شعریت بھی برقرار رہتی ہے اور ایک عام آدمی بھی ان خیالات سے روشنی حاصل کر سکتا ہے۔

سردار جعفری کا ایک اور شعری مجموعہ ''پتھر کی دیوار'' اگست ۱۹۵۳ میں شائع ہوا۔ بیشتر کلام جیل میں لکھا گیا ہے جس کا اعتراف جعفری نے 'حرف اول' میں کیا ہے۔ اس مجموعے کے حرف اوّل سے سردار کے نظریۂ ادب کو سمجھنے میں خاصی مدد ملتی ہے۔ مثلاً سردار نے شاعری میں روح عصر اور موجودہ حقیقت کو سمیٹنے کی وکالت کی ہے۔ سماجی گندگی پر افسوس اور آہ وبکا کے بجائے انسانیت کی قدر و قیمت اور ایک صاف ستھرے سماج کی تشکیل پر زور دیا ہے اور ان تمام موضوعات کو پیش کرنے کے لیے کلاسیکی تشبیہات و استعارات اور علامتوں کے ساتھ ساتھ نئی اور موجودہ تشبیہات استعارات اور علامتوں کے استعمال پر زور دیا ہے۔ کسی خاص ہیئت کا پابند نہ ہوکر موضوع کے اعتبار سے آزادانہ ہیئتوں کے استعمال خاص طور پر آزاد نظم کے تجربے پر بھی اصرار کیا ہے۔ اور زندگی کی تلخیوں سے بھاگ کر محبوب کی بانہوں یا فطرت میں پناہ لینے اور زمانے سے پشیمان ہوکر ماضی میں روپوش ہونے کے بجائے ایسی زندگی کو بدل دینے پر زور دیا ہے۔ نیز عوامی زبان اختیار کرنے کو کہا ہے۔ جعفری کے اس مجموعۂ کلام میں جو نغمگی، سلاست اور روانی ہے اور جس طرح کی تشبیہوں اور استعاروں کا استعمال کیا گیا ہے وہ سردار کی شاعری کو بلند درجہ دلانے کے لیے کافی ہیں اس مجموعۂ کلام میں سردار نے اپنے باغیانہ تیور اور انقلابی مزاج کو بھی کچھ ایسا شعری جامہ پہنایا ہے جس سے ان کے کلام میں ایک خاص طرح کا حسن آ گیا ہے۔ اس مجموعے میں انہوں نے ہندوپاک مشاعرے کے موقع پر ایک طویل غزل کہی ہے جس میں دوستانہ ماحول کو فروغ دینے اور اتحاد کی شمع جلانے پر زور دیا گیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ غزل کی مناسبت سے اس میں انھوں نے نہایت دلکش رومانی انداز بیان اختیار کیا ہے۔ اشعار ملاحظہ کریں۔

پھر شمیم گل نوید جاں فزا لائی ہے آج — میرے گلشن میں بہار رفتہ پھر آئی ہے آج
پھر اٹھا ہے وادیٔ گنگا سے ابر نو بہار — سمت راوی سے ہوائے مہرباں آئی ہے آج
آج پھر ہے اتحاد شیشہ و ساغر کا دور — محفل رنداں میں جشن بادہ پیمائی ہے آج

''پتھر کی دیوار'' کے بعد جعفری کا شعری مجموعہ 'ایک خواب اور' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ مجموعے میں نظموں کے علاوہ اٹھارہ غزلیں بھی شامل ہیں جن کے مطالعے سے جعفری کی نظریاتی اور ادبی وفکری تبدیلی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مجموعے کی غزلیں ان کی سابقہ غزلوں سے بہت حد تک مختلف ہیں۔ مثلاً وہ سابقہ غزلیں جن میں بھوک، افلاس، مساوات، مظلوم اور جابر حکمراں طبقے کے خلاف جارحانہ انداز، غلامی کا کرب، آزادی کی خواہش اور امن کا خواب جیسے مضامین کو انقلابی، خطیبانہ اور بیانیہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ جب کہ 'ایک خواب اور' میں شامل غزلیں موضوع اور فن دونوں اعتبار سے تغزل کا شاہکار ہیں موضوع کی وسعت اور تنوع کا بھی احساس ہوتا ہے جس سے ان غزلوں میں ایک ادبی شان پیدا ہوگئی ہے۔ مثلاً یہ اشعار دیکھیں

یہ روشن کس کا رخ ہے کاکلِ امروز و فردا میں ۔۔۔ لباسِ نور میں جلووں کو عریاں ہم نے دیکھا ہے

جگر کا خون ہو، دل کا لہو، یا اشک آنکھوں کے ۔۔۔ انھیں کو گوہر و الماس و مرجاں ہم نے دیکھا ہے

رباب و بربط و طاؤسِ خوابیدہ کے سینے میں ۔۔۔ وفورِ نغمہ سے تاروں کو لرزاں ہم نے دیکھا ہے

اس مجموعے میں ایک دوسری غزل میں شکستِ شوق کو تکمیلِ آرزو، خیالِ یار کو وصالِ یار اور شبِ فراق کو گیسوئے مشک بو کہا گیا ہے اور غزل کو بیانِ غالب اور زبانِ میر سے سنوارنے کی بات کی گئی ہے۔ غرض اب سردار کے یہاں کلاسیکی روایات کی طرف مراجعت یا اس سے بھرپور استفادے کا رجحان نظر آتا ہے۔ اس مجموعے کی ایک اور غزل میں بھی کچھ اس طرح کا انداز ہے۔ تصور و تخیل کی اڑان، وہم و گمان سے حسنِ یقین اور حسنِ یقیں سے وہم و گمان کی طرف مراجعت اور اس سے ایک حسین تصوراتی دنیا تعمیر کرنے کی خواہش اور اس بات کا اعتراف کہ اب تو ہر طرف فردوس ہی فردوس ہے جعفری کے نئے رنگ و آہنگ کا پتہ دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کی غزلوں میں اگر مایوسی کی جھلک ملتی بھی ہے تو اس کا اختتام امید و انبساط اور حوصلہ مند فکر پر ہوتا ہے۔ اشعار ملاحظہ کریں:

شکست شوق کو تکمیل آرزو کہیے جو تشنگی ہو تو پیمانہ و سبو کہیے
خیال یار کو دیجیے وصال یار کا نام شب فراق کو گیسوئے مشک بو کہیے
سنواریے غزل اپنی بیانِ غالب سے زبانِ میر میں بھی ہاں کبھو کبھو کہیے

حوصلہ ہو تو لڑو میرے تصور کی طرح میر تخیّل کے گلزار جناں تک آؤ
چھوڑ کر وہم و گماں حسن یقیں تک پہنچو پھر یقیں سے بھی کبھی وہم و گماں تک آؤ
اِسی دنیا میں دکھا دیں تمھیں جنت کی بہار شیخ جی تم بھی ذرا کوئے بتاں تک آؤ

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اب سردار جعفری کی غزلوں میں کلاسیکی روایات، روایتی عشق اور عصری حسیّت کا ملاجلا ردِعمل پایا جانے لگا تھا۔ جو بے حد دلفریب اور دلکش ہے۔ لغزش مستانہ، جرأت رندانہ، رونق میخانہ، وصل کی صبح، ہجر کی شب، رعنائی جمال، رعنائی خیال، التفات گل عذاراں اور آفتاب رخ کے ساتھ ساتھ عصر حاضر کی سیاسی و سماجی صورتحال پر طنز، اور استعاراتی و علاماتی انداز میں جس طرح سماجی و سیاسی شعبدہ بازیوں پر انھوں نے کاری ضرب لگائی ہے وہ یقیناً قابل ذکر ہے۔ جعفری نے اس مجموعے کی نظموں، غزلوں اور قطعات میں جن مضامین کو شعری پیکر عطا کیا ہے وہ تقریباً وہی مضامین و خیالات ہیں جو روایتی اور عصری تقاضوں کے ملے جلے ردِعمل کے طور پر وجود میں آتے ہیں۔ اس میں مزدوروں اور غریبوں کا ترانہ بھی ہے اور انسانیت کا پیغام بھی، فلسفۂ حرکت و عمل بھی ہے اور انسانی سربلندی اور اس کے افتخار کا ذکر بھی، زندگی کی نیرنگی اور فطرت کی جلوہ سامانیاں بھی ہیں اور مشرق و مغرب کے درمیان اتحاد اور امن پیدا کرنے کی کوشش بھی، اس کے علاوہ کمیونزم کی وضاحت بھی ہے اور حکومت کی بے پروائی پر طنز بھی، مے نوش کی سرمستی بھی ہے اور معشوقہ کی اداؤں پر وہ اپنی جان بھی قربان کرتے نظر آتے ہیں۔ علاوہ ازیں ایک دو جگہ اشتراکیت، جمہوریت اور سرمایہ دار و مزدور کی کشاکش کا بھی ذکر ہے لیکن ڈھکے چھپے انداز میں۔ غرض مضامین کا ایک انبار ہے، وسعت خیال کی ایک دنیا آباد ہے اس کے ساتھ ہی پیشکش کا انداز

بھی جداگانہ ہے، نظم ہو، غزل ہو یا پھر قطعات ان کی شعریت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ استعاروں ،علامتوں، تشبیہوں اور محاکات کا استعمال قابل دید ہے۔ اگر چہ کہیں سابقہ انداز کی بھی باز گشت نظر آتی ہے لیکن بہت کم۔

۱۹۶۶ء کے اوائل میں جعفری کا شعری مجموعہ ''پیراہن شرر'' شائع ہوا۔ اس کا پیش لفظ پنڈت آنند نرائن ملا نے لکھا ہے اور مقدمہ خود سردار جعفری نے تحریر کیا ہے۔ اس زمانے میں سردار کی شاعری میں جو نمایاں تبدیلی آئی اس کے متعلق پنڈت جی لکھتے ہیں:

''سردار کی زندگی میں ایک مقام ایسا آیا تھا جب مجھے اندیشہ ہونے لگا تھا کہ کہیں سردار کے دل میں جو شہری ہے وہ شاعر کے ہاتھ سے قلم چھین کر تلوار اٹھا لے لیکن شکر ہے کہ یہ نوبت نہیں آئی اور سردار نے قلم ہی کو تلوار بنا لیا۔ سردار کے ارتقائے فن میں یہ ایک اہم منزل تھی۔ اور اس مقام سے گزرنے کے بعد اس کا شعور جو پہلے ہی سے بیدار تھا اور زیادہ پختہ ہوا اور اس کے لہجے میں تیزی کی جگہ نرمی آ گئی جس نے اسے ساری نوع انسان کے قریب کر دیا۔ 'پیراہن شرر' تک پہنچتے پہنچتے یہ قلم کی تلوار اب اس کے ہاتھ میں شاخ گل بن چکی ہے۔ اور وہ نظریاتی غبار کی سطح سے اُبھر کر کرۂ نور پر پہنچ گیا ہے۔ اب اس کے پیام میں ایک پیمبرانہ حلاوت ہے اور زخم انساں کے لیے مرہم۔''

'پیراہن شرر' میں پانچ غزلیں شامل ہیں۔ اور ان غزلوں میں سردار نے اپنے اُنھیں مرغوب موضوعات کو جگہ دی ہے جن کے ذریعہ وہ امن، محبت اور جنگ و جدل سے پاک دنیا کا تصور کرتے ہیں۔ اس مجموعے کی نظمیں اور غزلیں اس زمانے کی پیداوار ہیں جب ہندو پاک کے درمیان جنگ کے حالات پیدا ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس سے جعفری بے حد فکر مند ہوئے اور اس کا اظہار انھوں نے مختلف طریقوں سے کیا۔ ان موضوعات کو انھوں نے نظموں میں تو قدرے وضاحت کے ساتھ پیش کیا لیکن غزلوں میں انھی موضوعات کو علامتی انداز میں پیش کیا ہے۔ مثلاً

ابر نیساں کی نہ برکت ہے نہ فیضان بہار قطرے گم ہو گئے تعمیر گہر سے پہلے
جم گیا دل میں لہو، سوکھ گئے آنکھ میں اشک تھم گیا درد جگر ، رنگ سحر سے پہلے
قافلے آئے تو تھے نعروں کے پرچم لے کر سرنگوں ہوگئی ہر آہ اثر سے پہلے
خونِ سر بہہ گیا ، موت آگئی دیوانوں کو بارش سنگ سے طوفان شرر سے پہلے

جو ہیں رند بھٹکے بھٹکے جو ہیں ساقی بہکے بہکے انھیں درس میکدہ دیں انھیں ذوق انجمن دیں
بڑی دیر ہو چکی ہے کہ ہیں نوحہ خواں ستارے چلو اب شب سیہ کو نئی صبح کا کفن دیں
لبِ تیغ پر لہو ہے، لب زخم پر تبسم یہ حیات تن برہنہ اسے کیسا پیرہن دیں

لیکن ہندو پاک کے درمیان تعلقات میں جوں جوں تلخی آتی گئی سردار کا لہجہ بھی تلخ اور واضح ہوتا گیا۔ چنانچہ بقیہ دوسری غزلوں میں ان حالات کی عکاسی انھوں نے کسی قدر صراحت اور وضاحت کے ساتھ کی ہے مثلاً تیسری اور چوتھی غزل کے چند اشعار ملاحظہ کریں۔

جس کی تیغ ہے دنیا اس کی جس کی لاٹھی اس کی بھینس
سب قاتل ہیں سب مقتول سب مظلوم ہیں ظالم سب
دیکھیے دن پھرتے ہیں کب تک دیکھیے پھر کب ملتے ہیں
دل سے دل آنکھوں سے آنکھیں ہاتھ سے ہاتھ اور لب سے لب
زخمی سرحد ، زخمی قومیں ، زخمی انساں ، زخمی ملک
حرف حق کی صلیب اٹھائے کوئی مسیح تو آئے اب

کس سے پوچھیں کون بتائے صبح کی کب پھوٹے گی کرن رات کو سرحد مقتل مقتل باندھ کے نکلو سر سے کفن
لے کر پھر قندیل محبت اترو دل کے اندھیرے میں روح کی تاریکی کو روشن کرتی نہیں سورج کی کرن
جشن ستم ہے ناچ رہے ہیں خنجر تیغیں گاتی ہیں خون آلودہ شامِ گیسو، زخم رسیدہ صبحِ بدن

کعبۂ دل میں بیٹھے ہیں اب بھی صدیوں فرسودہ بت رنگ و نسل و شیخ و برہمن، مذہب و ملت، ملک و وطن

مجموعے کی پانچویں اور آخری غزل ۳۰ ستمبر ۱۹۶۵ء کی ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ اب چونکہ جنگ کے بادل چھٹ چکے ہیں سردار کے لہجے کی تلخی بھی چھٹتی نظر آتی ہے۔ جنگ کے دوران یا اس سے قبل جنگ جیسے حالات کے پیش نظر ان کی نظموں کو تو چھوڑیے غزلوں میں بھی جس تندی و تلخی کا احساس ملتا ہے وہ قابل دید ہے۔ جسے سردار کے فطری مزاج سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ لیکن اب جب کہ حالات معمول پر ہیں ان میں ایک خاص قسم کی سرمستی اور سرشاری آگئی ہے۔ جس کا اظہار انھوں نے اس غزل میں بخوبی کیا ہے۔ پُرمسرت حالات کی عکاسی کے لیے جعفری نے اس کی مناسبت سے الفاظ، تشبیہات، استعارات اور علامات کا استعمال کیا ہے۔ جس سے غزل میں وہ تمام شعری لطافتیں در آئی ہیں جس سے شاعری اپنے عروج پر پہنچ جاتی ہے۔ اور قاری ایک خاص قسم کا حظ حاصل کرنے لگتا ہے۔ اشعار دیکھیں:

کیا حسن ہے دنیا میں کیا لطف ہے جینے میں دیکھے تو کوئی میرا انداز نظر لے کر
ہوتی ہے زمانے میں کس طرح پذیرائی نکلو تو ذرا گھر سے اک ذوق سفر لے کر
راہیں چمک اٹھیں گی خورشید کی مشعل سے ہمراہ صبا ہو گی خوشبوئے سحر لے کر
مخمل سی بچھادیں گے قدموں کے تلے ساحل دریا اُبل آئیں گے صد موج گہر لے کر

'پیراہن شرر' کا زیادہ تر کلام اگرچہ سیاسی ہے لیکن اس کا انداز بے حد نرم اور معتدل ہے۔ وہ شاعر جو کبھی قلم سے تلوار کا کام لیا کرتا تھا، نظریاتی غبار کی سطح سے اوپر اٹھ کر اس قلم کو شاخ گل بناتا نظر آتا ہے۔

'لہو پکارتا ہے' یہ شعری مجموعہ ۱۹۷۸ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعے میں غزلوں کی تعداد اٹھارہ ہے اگرچہ ابتدائی دور میں انھوں نے غزلوں پر توجہ نہیں دی اور اس عہد کی غزلوں میں بھی انھوں نے اگرچہ عصری اور ہنگامی موضوعات ہی کو جگہ دی ہے لیکن اب انداز پیشکش میں ایک رچاؤ

اور سلیقہ مندی بھی آ گئی ہے۔ اب وہ لفظیات کے استعمال میں کلاسیکی اور روایتی انداز کو اختیار کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن چونکہ جعفری بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں اس لیے نظم کا سا تسلسل اور کسی ایک خاص مرکزی احساس یا فکر کا اتباع ضرور نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ غزلیں 'نظم نما' ہیں جس کی با قاعدہ ابتدا اقبال کر چکے تھے۔ مختلف غزلوں کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دیکھتے رہیئے کہ ہو جائے نہ کم شانِ جنوں — آئینہ بن کے خود اپنے ہی مقابل رہیئے
ان کی نظروں کے سوا سب کی نگاہیں اٹھیں — محفلِ یار میں بھی زینتِ محفل رہیئے
جانیئے دولتِ کونین کو بھی جنسِ حقیر — اور درِ یار پہ اک بوسہ کے سائل رہیئے

تہہ عارض جو فروزاں ہیں ہزاروں شمعیں — لطف اقرار ہے یا شوخیِ انکار کا رنگ

کون ہے خوف زدہ حُسنِ سحر سے پوچھو — رات کی نبض تو اب چھوٹ چلی ہے یارو
یہ زمیں جس سے ہے ہم خاک نشینوں کو عروج — یہ زمیں چاند ستاروں میں گھری ہے یارو

ستم کی تیغ خود دستِ ستم کو کاٹ دیتی ہے — ستم رانو! تم اب اپنے عزا خانوں میں آ جاؤ
یہ کب تک سیم و زر کے جنگلوں میں مشقِ خونخواری — یہ انسانوں کی بستی ہے اب انسانوں میں آ جاؤ

صبح کے اجالے پر رات کا گماں کیوں ہے — جل رہی ہے کیا دنیا چرخ پہ دھواں کیوں ہے
اک جہاں میں شہرت ہے تم بڑے مسیحا ہو — پھر یہ شاہراہوں پر درد کی دکاں کیوں ہے

نغمہ بن جاتا ہے نالہ ان کی بزمِ ناز میں — ان کے خوش رکھنے کو شورِ سوگواراں چاہیئے

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ سردار کی تمام نظموں اور غزلوں میں بہتر دنیا کی تمنا مظلوم کی حالت پر افسوس اور ظلم کے خنجر کو توڑ ڈالنے کی آرزو نظر آتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان نظموں

اور غزلوں میں پارٹی لائن کی پابندی نہیں ہے۔ اگر چہ سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات کی ابتری، بدنظمی اور گھناؤنی کیفیات کو انھوں نے شعری پیکر میں ڈھالا ہے، لیکن وہ تیزی، تندی، جھنجھلاہٹ یا وہ باغیانہ لب ولہجہ نظر نہیں آتا جو ۱۹۵۰ء سے قبل کی نظموں اور غزلوں میں دکھائی دیتا ہے۔ یوں مذکورہ تمام تخلیقات کے پیش نظر کہا جا سکتا ہے کہ سردار جعفری اس عہد کی ابتداء میں اگر چہ ایک قسم کی نظریاتی کشمکش میں مبتلا رہے لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے اپنے ادبی اور فکری رویوں میں ایک خاص قسم کی تبدیلی پیدا کی اور اعتدال وتوازن کی راہ اختیار کرنے میں عافیت سمجھی چنانچہ نظریاتی اور فکری سطح پر سردار کے یہاں ساتویں دہائی میں جو ایک کشمکش کی کیفیت در آئی تھی وہ اس کے اخیر میں ختم ہو جاتی ہے۔ اور وہ اپنے ایک خاص نقطہ نظر میں استحکام پیدا کرتے ہوئے جدیدیت کی ان صحت مند روایات کو قبول کرتے ہیں۔ جن کا ایک سماجی کردار تھا۔ جو یاسیت، قنوطیت اور ذات کے نہاں خانے میں گم ہو جانے کی کیفیت سے مبرا تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ جعفری نے ترقی پسندی سے بھی انحراف کیا۔ البتہ انھوں نے اس نئے ادبی اور فکری منظر نامے میں اجتماعیت اور اشتراکیت کی اہمیت کو ہنوز برقرار رکھا اور آخری عمر تک اس پر قائم رہے۔ ترقی پسند ادب اور اس سے قبل کی تحریروں میں انھوں نے تصوف کو جاگیر دارانہ معاشرے کی فرسودہ اقدار کہا ہے جب کہ وہی تصوف کبیر، میر، غالب اور اقبال کے حوالے سے پیغمبران سخن میں عوامی اقدار کی بنیاد بن جاتا ہے۔

*****

ڈاکٹر جاویدہ حبیب۔ دکن (انڈیا)

اردو ادب کے اوّلین نقاد مولانا باقر آگاہ ویلوری

''اردو'' ترکی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ''لشکر شاہی'' یعنی چھاؤنی کے ہیں۔ (''ترکی'' سے ''تلکانا'' اور ٹیپو بھی ترکی ہی ہے جس کے معنی کسی لغات میں نہیں ہیں۔ جیسا کہ لفظ ''چوغہ'' سے ٹمل '' چکائی' Chokkai بنا۔) ۔اردو کے ارتقاء کی داستان جتنی طویل ہے اتنی اس کی ارتقائی منزلیں بھی بڑی لمبی ہیں۔ اسے کئی نام بھی دیئے گئے ہیں۔ مثلاً ہندی ، ہندوی ، دکنی ، گجری ، ہندوستانی ، کھڑی بولی ، اردوئے معلّٰی ، اردو زبان ، زبان ہندوستان۔ اس زبان کی تشکیل میں مسلمان درویشوں اور صوفیوں نے بڑا اہم رول ادا کیا ہے جو مسلمان تاجروں اور سپاہیوں کے ساتھ ہندوستان آئے تھے۔ جن صوفیا نے اردو کی نشو ونما میں اہم کردار ادا کیا ان کا ذکر ہمیں مولوی عبدالحق اور مولانا سید سلیمان ندوی اور جمیل جالبی کی کتابوں میں مل جاتا ہے۔

اردو کا پہلا صاحب دیوان شاعر محمد قلی قطب شاہ دکن کی سرزمین سے وجود میں آیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جس میں شمالی ہند میں اکبر اعظم کی حکومت تھی۔ اسی زمانہ میں اکبر اعظم نے آگرہ کے قریب فتح پور سیکری ، ابراہیم عادل شاہ نے بیجاپور میں ایک نیا شہر ''نورس پور'' اور محمد قلی قطب شاہ نے گولکنڈا میں ''بھاگ نگر'' (جو آج حیدرآباد کے نام سے منسوب ہے) کی بنیاد رکھی۔ ان تینوں شہروں کے ادیبوں اور شاعروں نے نہ صرف اردو زبان وادب کی بلکہ شعروسخن کی شمعیں جلائیں جس سے یہ تینوں شہر منور ہوئے۔ قطب شاہی اور عادل شاہی کی سلطنتوں کے زوال کے بعد نواب محمد علی والا جاہ اور نواب غوث خان اعظم نے آرکاٹ کو نہ صرف اردو زبان وادب کا گہوارہ بنایا بلکہ علماء صوفیا اور شعراء کو مدراس آنے کی دعوتیں دیں اور شہر مدراس کو دین وعلم وادب کا ملجا وماوا بنایا۔ یہاں ایک اور بات میں واضح کردوں کہ اسی دور میں منظوم پہلا سفرنامہ نواب اعظم جاہ کے ایما پر

نادر آرکاٹی نے لکھا تھا۔ اس سفرنامہ کا تذکرہ سب سے پہلے ڈاکٹر محی الدین زور نے تذکرۂ اردو مخطوطات کی پہلی جلد ۱۹۵۴ء میں کیا تھا۔ اس سفرنامہ کا ایک اور قلمی نسخہ رضا لائبریری رامپور میں بھی موجود ہے۔ اس سفرنامہ کو موجودہ معلومات کی روشنی میں اردو کا پہلا سفرنامہ کہنے میں اشتباہ کی گنجائش نہیں۔ یہ سفرنامہ منظوم ہے اور اس میں مدراس کے اہم ترین مقامات، بزرگان دین کے مزارات کے ذکر کے ساتھ ساتھ اعظم جاہ اور عظیم جاہ کے ہمراہ ان کے فوجیوں نے جہاں جہاں ڈیرہ لگایا تھا ان مقامات کی سیر و سیاحت کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔

یہ کہنا درست ہے کہ اُس زبان نے بہتر جلد ارتقائی منازل طے کئے ہیں جو زبان دوسری زبانوں کے اثرات قبول کرتی ہے۔ زبان اردو کو یہ شرف حاصل ہے۔ کیونکہ اس زبان کی آبیاری میں جہاں فارسی اور عربی کا ہاتھ ہے وہیں ہنوی، مراٹھی، دکنی، تلگو، ٹمل، کرناٹکی، گجراتی، پنجابی، سندھی، سنکسرت، پالی، ہندوی، بنگالی، ترکی، انگریزی، فرانسیسی، جرمنی، چینی اور روسی زبان کے الفاظ بھی ہمیں ملتے ہیں۔

جس طرح اردو زبان و ادب پر مختلف زبانوں نے نقش چھوڑا ہے اُسی طرح دوسری زبانوں کے اصنافِ شعری نے اردو شعر و ادب کو بہت اونچا اٹھایا ہے۔ مثلاً اردو میں ثانیٹ اور ترائیلے فرانسیسی ادب سے آئے اور ''ہائیکو'' جاپانی ادب کی دین ہے۔ ''ماہیئے'' پنجابی زبان کی دین ہیں۔ بالخصوص اردو دوغزل بلکہ مثنوی، قصیدہ، رباعی، مخمس وغیرہ بھی۔ ان تمام اصناف کے بحور اور اوزان بھی فارسی زبان ہی سے مستعار لیے گئے ہیں۔ یہاں تک کہ اردو شاعری میں تشبیہیں، استعارے، تلمیحات اور تراکیب بھی اسی زبان کی دین ہیں۔

مختلف تاریخی شواہد سے ہمیں یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ سلاطین بہمنیہ (بہمنی دور) میں فارسی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ فیروز شاہ بہمنی نہ صرف قوم پرور تھا بلکہ خود شاعر بھی تھا۔ فارسی زبان میں اپنی شاعری کے نمایاں نقوش چھوڑے۔ بعض محققین نے فیروز بیدری کی ایک دکنی رباعی کو فیروز شاہ بہمنی سے منسوب کر کے اسے اردو کا شاعر بتایا ہے۔ حالانکہ مذکورہ رباعی،

مثنوی پرت نامہ کے مصنف فیروز بیدری کی ہے جس نے فیروز کے علاوہ فیروزی اور فیروزیا بھی تخلص اختیار کیا ہے۔ اسی زمانے میں جب اردو زبان گجرات پہنچی تو اس کا نام گجری پڑ گیا اور گجری ادب کے بھی متعدد شاعروں نے اُردوئے قدیم کو اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ چنانچہ بہاؤالدین باجن، شاہ علی، جیون گام دھنی اور امین گجراتی، احمد گجراتی، اشرف گجراتی نے گجری اردو کو ادبی جواہر پاروں سے مالا مال کر دیا اور جب یہ زبان بیجاپور پہنچی تو یہاں کے اولین صوفیا کرام جن میں میراں جی شمس العشاق اور ان کے لیے برھان الدین جانم نے اردوئے قدیم کو گجری کے نام سے یاد کیا ہے۔ قریشی بیدری پہلا شاعر ہے جس نے اردوئے قدیم کو دکنی کا نام دیا تھا اور اس کے بعد یہی نام دکن کے پورے علاقے میں مشتہر رہا ہے۔ جہاں اس دور میں دکنی زبان میں بے شمار مذہبی رسالے لکھے گئے، جس میں تصوف کی بہت زیادہ سرپرستی حاصل ہوئی۔ دکنی اردو مخطوطات کی دریافت اور تحسین اور تعارف کا آغاز سب سے پہلے مستشرقین نے کیا اس سلسلے میں ڈاکٹر اسپرنگر جس نے کتب خانہ ٹیپو سلطان کی فہرست مرتب کر کے انگریزی زبان میں شائع کی تھی اور پھر اس کے بعد بلوم ہارٹ نے اپنی فہرست میں دکنی اردو کے متعدد شعراء اور نثر نگاروں کا تعارف کروایا تھا۔ اس سلسلے میں گارساں دتا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس نے دیوان ولی کو سب سے پہلے فرانسیسی زبان میں پیرس سے شائع کیا تھا۔ اس کتاب کی اشاعت کے کم وبیش سو سال بعد دیوانِ ولی کی ترتیب وتدوین اردو زبان میں ہوئی تھی۔ جہاں تک برصغیر ہندو پاک میں دکنی اردو سے متعلق تحقیقی کام کا تعلق ہے اس سلسلے میں سب سے پہلا نام حکیم شمس الدین قادری کا ہے جنہوں نے لکھنو کے رسالہ ''لسان عصر'' ۱۹۱۰ میں دکن کے اردو کے خدمت گزاروں کا تعارف کروایا تھا۔ یہی مضمون بعد میں اردوئے قدیم کے عنوان سے ۱۹۲۵ء میں کتابی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اس کتاب کی روشنی میں حضرت گیسو دراز، سعدی دکنی، نظامی بیدری، شاہ افضل بیابانی اور عین الدین گنج العلم کے شعری کارنامے آج بھی ناقابل فراموش ہیں۔

گویا دکنی زبان اور اردو زبان کے ابتدائی روپ اور دکنی زبان کی ترقی اور ارتقا کی داستان

سے آگاہی کے لیے ہمیں حضرت امیر خسرو پیر روشاں، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز، نظامی بیدری، اشرف بیابانی، شاہ میراں جی شمس العشاق، شاہ برہان الدین جانم، محمد قلی قطب شاہ، وجہی، غواصی، ابن نشاطی، نصرتی، شاہی، حسن شوقی، مقیمی، شغلی معظم علی رحمتی وغیرہ کی تخلیقات اور نثر پاروں کے مطالعہ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔

دکنی ادب کی خدمت کرنیوالوں میں جہاں میراں جی شمس العشاق کے فرزند شاہ برہان الدین جانم اور ان کے صاحب زادے شاہ امین الدین اعلیٰ، شاہ سلطان ثانی کے نام لیے جاتے ہیں، وہیں ولی ویلوری، غوثی ارکاٹی، مذنب ارکاٹی، نادر ارکاٹی، شاہ تراب ترناملی، حضرت شاہ سلطان ثانی، ابوالحسن قربی، مولانا باقر آگاہ ویلوری، ذوقی ویلوری اور لطیف آرکاٹی کے نام اور ان کی دکنی شعری خدمات قابلِ توجہ اور قابلِ ذکر ہیں۔

جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے اٹھارویں صدی کے جید علماء وفضلاء میں حضرت محمد باقر آگاہ قادری شافعی ویلوری کی شخصیت اس لیے منفرد سمجھی جاتی ہے کہ وہ بہ یک وقت نہ صرف عربی، فارسی اور دکنی زبانوں کے قادرالکلام اور صاحب دیوان شاعر تھے، بلکہ ایک مستند محقق و مورخ 'صوفی کامل' معتبر سیرت نگار، ماہر اسلامیات، مشہور زبان دان محترم فقیہہ، روشن خیال معلم، نامور انشا پرداز، معروف نعت نویس و منقبت نگار، بلند مرتبہ مبلغ قرآن وحدیث اور بے نظیر محرک تعلیم نسواں بھی تھے۔

حضرت آگاہ نے ساری زندگی تصنیف وتالیف کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت کے لیے وقف کردی تھی اور زندگی کے آخری لمحہ تک وہ اس راہ سے سرِ مو پیچھے نہیں ہٹے۔ چنانچہ اپنی علمی، ادبی اور دینی خدمات کی وجہ سے حجاز وعرب کے علماء، صلحا اور اہل کمال نے ان کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر محی الدین زور جیسے ماہر دکنیات بلند پایہ محقق اور ماہر علوم السنہ نے ان کو اپنے وقت کے اردو ادب کے بڑے محسنوں میں شمار کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''واقعہ یہ ہے کہ دکنی علم وفضل، شعر وسخن ان (آگاہ) کے ہمعصر تھے، لیکن زبان قدیم

استعمال کی ہے۔ اس لیے شمالی ہند میں شہرت حاصل نہیں ہوئی۔'' (تذکرہ اردو مخطوطات جلد اوّل ایڈیشن ۔۱۳۴)

نواب صدیق حسن خاں ''تذکرہ شمع انجمن'' کے موٴلف نے آگاہ کو ان الفاظ میں خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

''کرناٹک میں ان کے ایسا کوئی سر بلند نہ ہوا اور مدراس میں ان کو کائی عدیل نہیں۔ صاحب تصانیف کثیرہ تھے اور بہت کمالات کے حامل تھے۔'' (ص ۱۵)

محمد غوث خاں اعظم نے اپنے تذکرہ ''صبح وطن'' میں لکھا ہے۔

''تمام فنون میں عربی فارسی ہندی (اردو) کے پچاس ہزار چھو سو ابیات ان کے کثرتِ تصانیف کے گواہ ہیں۔ اس علاقہ (مدراس) کے بہت سے لوگ ان کے فیض سے فضل و کمال کو پہنچے۔ (ص۔۹)

مولانا مہدی واصف نے ''حدیقۃ المرام میں لکھا ہے۔'

'اللہ نے آپ کو شرح صدر سے مشرف فرمایا اور علوم کے دروازے آپ پر کھول دیئے۔ آپ بڑے ذہین تھے۔ قاموس آپ کو حفظ تھی ۔۔۔۔ حقیقت یہ ہے کہ علماء عصر کو آپ پر رشک و حسد ہوتا تھا۔ آپ کی معلومات عربی اور فارسی طرز تحریر، آپ کے کمال پر دال ہے (ص ۲۶)

تذکرہ نتائج الافکار کے مولف مولوی قدرت اللہ رقم طراز ہیں کہ

''گلشن کرناٹک میں ان جیسا سرو پیدا نہیں ہوا اور گلستان مدراس میں ان کے مقابلہ کا رنگ افروز گل نہیں کھلا'' (ص ۶۳)

مختلف تذکرہ نگاروں کے علاوہ مولانا آگاہ پر دادِ تحقیق دینے والوں میں سب سے پہلا نام مولوی محمد مرتضیٰ کا ہے۔ جنھوں نے ۱۹۱۰ء میں حیدرآباد کے اخبار 'صحیفہ' میں محمد باقر آگاہ کے عنوان سے ایک مضمون قسط وار شائع کروایا تھا اور پھر بعد میں اپنے موضوع کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس مضمون کو ایک کتابچے کی صورت میں اسی نام سے ۱۹۲۱ء میں منظر عام پر لائے۔ اس کے

بعد مولوی نصیر الدین ہاشمی نے ''دکن میں اردو (۱۹۲۳ء) میں باقر آگاہ پر مختصراً خامہ فرسائی کی۔ پروفیسر عبدالقادر سروری نے جامعہ عثمانیہ کے مخطوطات کی توضیحی فہرست مرتب کرتے ہوئے دیوان آگاہ کے نسخۂ جامعہ عثمانیہ اور ڈاکٹر محمد حمید اللہ کے ایک خاندانی نسخے کے تقابلی مطالعہ کے بعد ایک معرکتہ الآرا مضمون رسالہ اردو بابت اپریل ۱۹۲۹ء میں '' باقر آگاہ کے زیر عنوان شائع کیا تھا۔ حالیہ عرصے میں پروفیسر یوسف کوکن (محمد باقر آگاہ ۱۹۵۸ء) ڈاکٹر افضل اقبال (مدراس میں اردو ۱۹۷۷ء) ڈاکٹر جمیل جالبی (تاریخ ادب اردو جلد دوم ۱۹۸۹ء) جناب علیم صبا نویدی (باقر آگاہ کے ادبی نوادر ۱۹۹۴) ڈاکٹر محمد علی اثر (نوادرات تحقیق ۱۹۹۴) ڈاکٹر ذاکرہ غوث (محمد باقر آگاہ ۱۹۹۵ء) ڈاکٹر راہی فدائی (دارالعلوم لطیفیہ ۱۹۹۷) نے آگاہ کی مختلف النوع اور مختلف الابعاد شخصیت پر مذکورہ تصانیف میں مضامین و مقالات لکھے۔

اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر اور گولکنڈہ کے پانچویں فرماں روا سلطان محمد قلی قطب شاہ کے بارے میں اس کے بھتیجے اور داماد، بانیٔ مکہ مسجد سلطان محمد قطب شاہ کا بیان ہے کہ اس (محمد قلی) کا دیوان پچاس ہزار اشعار پر محیط تھا۔ جو دستبرد زمانہ کی وجہ سے مکمل طور پر محفوظ نہیں رہ سکا۔ تاہم تاریخ ادب اردو میں ہنوز ایسے کسی شاعر کا پتہ نہیں چلا۔ جس نے محمد قلی کی طرح پچاس ہزار یا اس کے نصف (پچیس ہزار) اشعار کے برابر بھی کوئی کتاب نظم کی ہو۔ اردو کی سب سے ضخیم مثنوی خاورنامہ (رستمی بیجاپوری) چوبیس ہزار اشعار پر پھیلی ہوئی ہے، لیکن جب ہم تذکرہ صبح وطن کے مولف کے بیان پر غور کرتے ہیں کہ آگاہ نے پچاس ہزار چھ سو اشعار کہے ہیں تو ہمیں حضرت آگاہ کی پُر گوئی اور قادر البیانی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا کو شاعری کے مختلف اوزان و بحور میں ماہرانہ قدرت حاصل تھی اور جب ہم حضرت آگاہ کے مختلف شعری تصانیف پر تحریر کئے ہوئے نثری دیباچوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ وہ جتنے بڑے شاعر تھے اس سے بھی زیادہ اہمیت کے حامل نثر نگار اور نقاد بھی تھے۔

دکنی اردو کی شمع دبستان بیجاپور اور دبستان گولکنڈہ میں کم و بیش تین چار صدیوں تک نشو نما اور

ارتقا کی منزلیں طے کرنے کے بعد ولی کے توسط سے شمالی ہند میں اردو شاعری کی روشنی پھیلاتی ہے جس سے پورا برصغیر منور ہو جاتا ہے۔

پیش نظر کتاب ''مولانا باقر آگاہ ویلوری اردو ادب کا اولین نقاد'' کے مقدمے میں ڈاکٹر محمد علی اثر نے بعض اہم ترین باتیں ہمارے سامنے رکھدی ہیں مثلاً سب سے پہلے ''مولانا باقر آگاہ کی تنقیدی تحریروں پر ۱۹۲۹ء میں پروفیسر عبدالقادر سروری نے روشنی ڈالی تھی۔ حالانکہ سروری سے پہلے کئی ایک اہم تذکرہ نگاروں نواب صدیق حسن خاں، نواب غلام غوث خاں اعظم، مولانا مہدی واصف، مولوی قدرت اللہ، مولوی محمد مرتضیٰ نے مولانا باقر آگاہ کی شعری اور علمی استعداد کے ساتھ ساتھ مولانا کی عربی اور فارسی طرزِ تحریر کا بھرپور احاطہ کیا تھا۔ اور یہ بھی واضح کیا تھا کہ مولانا میر وسودا کے ہم عصر تھے لیکن مولانا کے تجر علمی اور فضل وکمال کا چرچا صرف محدود حلقے تک رہ گیا تھا۔ یہاں تک مولانا آزاد بلگرامی سے مولانا کی مراسلت اور ان دونوں میں جو علمی چشمکیں ہوئی ہیں ان کا علم اردو دنیا کو نہیں تھا۔ تاہم آگاہ نے رسالۂ چہار صد اراد میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

موجودہ دور کے بعض محققین نے مولانا باقر آگاہ ویلوری کو اردو ادب کا اولین نقاد ثابت کرنے کا دعویٰ کیا ہے جو بے بنیاد ہے۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیک ہدایت اور سچ کہنے اور لکھنے کی توفیق عطا فرمائے۔

پیش نظر کتاب کے دوسرے ایڈیشن کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ حضرت علیم صبا نویدی نے گذشتہ ایڈیشن مطبوعہ ۱۹۹۴ء میں صرف مولانا باقر آگاہ ویلوری کے آٹھ دیباچوں کو سامنے رکھ کر انہیں مولانا حالی اور مولانا شبلی سے اردو ادب میں تنقید کی پہلی بنیاد رکھنے والے نقاد کی حیثیت سے پیش کیا تھا اس سے پہلے کے تمام محققین نے صرف مولانا آگاہ کے بعض دیباچوں کے مطالعہ کے بعد ان کی تنقیدی بصیرتوں کا خاکہ کھینچا تھا۔ میں سمجھتی ہوں حضرت علیم صبا نویدی کی کتاب ''مولانا باقر آگاہ کے ادبی نوادر'' مطبوعہ ۱۹۹۴ء سے پہلے دو ایک کو چھوڑ کر کسی محقق نے بھی مولانا کے تفصیلی دیباچے نہیں پڑھے ہوں گے۔ کیونکہ یہ تمام دیباچے کسی ایک کتب خانے میں آج

بھی محفوظ نہیں ہیں۔ بہر کیف حضرت علیم صبا نویدی کا یہ بھی ایک اہم ترین کارنامہ ہے کہ ڈاکٹر محمد علی اثر صاحب سے ٹیلی فونک گفت وشنید کے بعد انہوں نے یہ کام شروع کیا اور اس کام کی تکمیل میں موصوف کو پتہ نہیں کہاں کہاں کی خاک چھاننی پڑی۔ یہاں تک کہ موصوف نے مولانا کے بعض دیباچے (British Library Meusium) لندن سے بھی منگوائے تھے۔ اس کتاب میں اس بار حضرت علیم صبا نویدی صاحب نے مولانا باقر آگاہ کی تمام تر تصانیف کا بھی جائزہ لیا ہے۔ اس جائزہ سے مولانا کے اندر کے ایک عہد آفریں عظیم فن کار سے ہماری ملاقات ہوگی۔ اس ملاقات کا سہرا یقیناً علیم صبا نویدی کے سر جاتا ہے۔

*****

غیر مطبوعہ/ترجیحاً تازہ نگارشات

(قلمی معاونین کی خدمت میں گزارش)

ہم اپنے معزز قلمی معاونین سے ملتمس ہیں کہ وہ ''الاقرباء'' کو صرف ایسی نگارشات نظم ونثر مرحمت فرمائیں جو غیر مطبوعہ اور ترجیحاً تازہ تخلیقات ہوں۔ ہمیں افسوس ہے کہ ہم بعض ایسی نگارشات کو شائع نہیں کر سکتے ہیں جن کی قبل ازیں اشاعت ہمارے علم میں آئی ہے۔ بہر حال ہم شکر گزار ہوں گے اگر ''الاقرباء'' کے لیے ترسیلات پر ''غیر مطبوعہ'' کے الفاظ لکھ دیئے جائیں (ادارہ)

سیّد انتخاب علی کمال

ابُو الطّاہر فِدا حُسین فِدا

(لاہور کا ایک مُمتاز تاریخ گو شاعر)

ابُو الطّاہر فدا حسین فدا، ۲۱ جون ۱۹۱۹ عیسوی مطابق ۱۳۳۸ ہجری کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ والدِ بزرگوار حضرت بدرالدین احمد قادری حنفی کی آغوشِ پدری میں پرورش پائی پھر جب قلم سنبھالا تو حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پوری کے خلیفۂ مجاز علاّمہ حکیم تاج الدین عرفانی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہو گئے۔ اُن سے اکتساب فیض کیا اور اپنے اُستاد کے جانشین ہو گئے۔ فدا لاہوری سَر زمینِ پنجاب کے اُن سپوتوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے فَنِ تاریخ گوئی میں بڑا نام کمایا۔ سر زمین پنجاب کے جن تاریخ گو شعرا کو پنجاب کے سرکردہ تاریخ گو شاعر کہہ سکتے ہیں اُن کا سرسری جائزہ مقالۂ ہٰذا کے حاشیے میں نذرِ قارئین ہے (ا) اہلِ پنجاب کے تاریخ گو شعراء میں پنجاب کے تاریخی شہر لاہور سے وابستہ تین اہم تاریخ گو شعراء سب سے نمایاں ہیں۔ قدیم تاریخ گو شعراء میں سرِ فہرست سَرور لاہوری، نام مولوی حاجی مفتی غلام سَرور (ولادت ۱۲۴۴ ہجری وفات ۱۳۰۷ ہجری) (تفصیل حاشیہ ا الف میں دیکھئے)۔ سَرور لاہوری کے بعد شہر لاہور سے وابستہ نامی لاہوری، نام پیر غُلام دستگیر بحثیت تاریخ گو شاعر نمایاں ہیں (موصوف کی تفصیل حاشیہ ا (وَاوٗ) میں دیکھیئے) عُمدہ تاریخ گو شاعر تھے۔ ۱۳۸۱ ہجری میں لاہور ہی میں وفات پائی۔ سَرور لاہوری اور نامی لاہوری کے بعد فنِ تاریخ گوئی کے تیسرے نمایاں شاعر جو شہر لاہور سے تعلق رکھنے والے ہیں اور جو لاہور میں ۱۹۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۹ فروری ۲۰۰۶ عیسوی میں لاہور ہی میں انتقال فرمایا وہ ہیں ابُو الطّاہر فدا حُسین فدا لاہوری زیرِ نظر مقالہ فدا لاہوری کی تاریخوں سے مُرصّع ہے۔

فدا حسین فدا کی ادبی، شعری تخلیقات میں ''ساغر و مینا'' ۔ ''افکارِ پریشاں'' ۔ ''سُنہری

راز"۔ "آفتابِ تاج"۔ "جہادِ سخن"۔ "آفتابِ تصوف"۔ "شعلۂ انتقام"۔ "پاداش"۔ "کلیاتِ خوش طبع" (میاں احمد بخش خوش طبع کے منتشر شعری سرمایہ کی یکجا ترتیب)۔ "تحفہ سلطانیہ" (سوانح حیات حضرت سلطان باہوؒ)۔ "چمستانِ سرمدی" (نعتیہ کلام)۔ "سخن گسترانہ" (منظومات)۔ "رباعیاتِ فدا"۔ "کلیاتِ تاج"۔ "شاہ حسین لاہوری" (سوانح) اور "معدنُ التّواریخ"
۱۲ ہجری ۱۴

(قطعاتِ تاریخ کا مجموعہ) "معدنُ التّواریخ" سے ہجری سنہ ۱۴۱۲ حاصل ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کتاب کا نام رَواروی میں معدن تاریخ نہ رکھ دیا جائے ورنہ اعداد غلط ہو جائیں گے۔ اس کتاب کی اشاعت پر صابر براری (۲) اور طارق سلطانپوری (۳) (حسن ابدال) نے تاریخِ اشاعت کہی۔ دونوں تاریخیں حاشیہ میں ملاحظہ فرمائیں۔ فنِ تاریخ گوئی کے سلسلے میں "تذکارِ فدا" کے صفحہ ۱۱۷ سے ۱۲۰ تک جنابِ محترم رضا احمد صاحب (ایم۔اے) نے ابو الطاہر فدا حسین فدا سے سوالاً جواباً اپنی ملاقات نقل کی ہے۔ جس میں فدا حسین فدا نے رضا احمد کے ایک سوال کے جواب میں ارشاد فرمایا:

"۔۔۔فنِ تاریخ گوئی کا رواج لکھنؤ میں عام تھا۔ وہاں اپنے مختصر قیام کے دوران اکثر سینیئر (Senior) شعرائے کرام کو اس فنِ لطیف میں گہرا شغف رکھتے ہوئے پایا۔ لیکن قیامِ پاکستان کے بعد اس صنفِ شعری سے وابستہ صرف گنتی کے لوگ رہ گئے ہیں۔ جن میں خورشید مہر علی تقوی۔ صبا متھراوی۔ حفیظ ہوشیارپوری اور بالخصوص پیر غلام دستگیر نامی کے اسمائے گرامی فنِ تاریخ گوئی کے حوالے سے خاص اہمیت کے حامل ہیں" (مندرجہ بالا چاروں اسماء میں پہلا نام سہواً "خورشید مہر علی تقوی" چھپ گیا ہے یہ نام دراصل "سید خورشید علی مہر تقوی جے پوری" ہے۔)۔

"۔۔۔آج کے راوی حضرات نے ان ماہرینِ فنِ تاریخ گوئی کو اس فن سے متعصبانہ رویوں اور تنگ نظری کے باعث یکسر نظر انداز کر دیا۔ جو اہلِ علم و فن کے لیے ایک لمحۂ فکریہ ہے۔"

"۔۔۔میں نے "معدنُ التّواریخ" کے نام سے پانچ صد قطعاتِ تاریخ کہے۔ جن میں
۹۲ ہجری ۱۴

سے وجہ بتائے بغیر ناشرِ محترم (ادارۂ معارفِ نعمانیہ۔لاہور) نے صرف سو کے قریب شعراء اور مشائخ عظام کے قطعاتِ تاریخ "معدن التواریخ" میں کتابی شکل میں شائع کئے ہیں۔"

(از رضا احمد ایم اے ماخوذ تذکارِ فدا)

رضا احمد صاحب نے فدا حسین فدا لاہوری سے پوچھا کہ "یہ فن گنتی کے چند افراد تک محدود ہو کر کیوں رہ گیا" تو فدا نے انتہائی پُر درد انداز میں جواب دیا۔

"۔۔۔دراصل فنِ تاریخ گوئی انتہائی مشکل ترین فن ہے۔لہٰذا خونِ جگر مانگتا ہے۔آج کے سہل پسند دور میں خونِ جگر دینا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔لوگ ادھر اُدھر سے دوسروں کے افکار و تصورات سے خیالات مستعار لے لیتے ہیں اور شاعر بن بھی جاتے ہیں۔مگر ڈھول کا پول ہوتا ہے۔جب کہ تاریخ گوئی میں خالصتاً اپنے دماغ اور اپنے فن کو استعمال کرنا پڑتا ہے اب جس کے پاس نہ فن ہو نہ فنی ریاضت، نہ علمِ عروض ہو نہ علمِ جمل۔۔۔؟ تو یہ کور اذہن کیا کرے گا؟ تاریخ گوئی تو اس کے بس کا روگ نہیں!! لہٰذا وہ تو صرف اس کے خلاف ہی بولے گا۔بلکہ زہر اُگلے گا۔اور اپنا دامن چھڑائے گا۔اس کے سوا اُس کے پاس اور کچھ نہیں ہے۔"

(ایضاً)

فدا لاہوری نے سب سے پہلے شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی رحلت پر قطعۂ تاریخ کہا۔جس کا آخری شعر یہ ہے:

فکرِ سالِ رحلتِ اقبال پر مجھ سے فدا　　　کہہ گیا ہاں "معتبر ہے شاعرِ مشرق"☆

۳۸ عیسوی ۱۹

تشریح: مندرجہ تاریخ میں معتبر + ہے + شاعر + مشرق سے ۱۹۳۸ عیسوی حاصل ہوتے ہیں
۶۴۰　۵۷۱　۱۵　۷۱۲

☆ مصرعہ نامکمل معلوم ہوتا ہے (ادارہ)

☆ ۱۳۵۹ھ/۱۹۴۰ء بروفات سید برکت علی شاہ گیلانی خلجیاں شریف۔ ضلع امرتسر قطعہ تاریخ کہا۔ قطعہ کا آخری شعر یوں ہے

فدا ازروئے الحمد تاریخ ''بفردوس بریں قدسی صفت'' ہے
۱ ۱۳۵۹=۱+۱۳۵۸

تشریح: بفردوس بریں قدسی صفت'' کے اعداد ۱۳۵۸ ہوتے ہیں۔ ''ازروئے الحمد'' یعنی ''الحمد'' کے الف کا اعداد جمع کر کے تاریخ حاصل کی گئی ہے۔

☆ ۱۳۶۳ھ/۱۹۴۳ء میں ممتاز مورخ اور سیرت طیبہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مصنف محمد نبی بخش قادری کی تاریخِ وفات یوں کہی:

کہہ گیا مُلہم فدا سے سالِ وصل ازسر ''الہام''۔ ''مغفور اِللہ''
۱۳۶۳=۱+۱۳۶۲ھ

تشریح: ''مغفور اِللہ'' کے ابجدی اعداد= ۱۳۶۲ اس میں ایک عدد کی کمی ہے

ازسر ''الہام'' کہکر ''الہام'' کے الف کا عدد=۱+ (جمع کرنے کا اشارہ ہے۔)
۱۳۶۳ھ

☆ ۱۳۶۳ ہجری مطابق ۱۹۴۳ عیسوی میں کتاب ''الکادیہ علی الغاویہ'' کے مصنف محمد عالم، آسی امرت سری (فرزند مولوی عبدالحمید) نے ۲۸ شعبان ۱۳۶۳ ہجری مطابق ۱۹۴۳ عیسوی کو داعیٔ اجل کو لبیک کہا، آخری آرام گاہ امرتسر میں ہے۔ آسی امرتسری کی وفات (۱۰) پر فدا لاہوری نے قطعۂ تاریخ کہا۔ جس کا آخری شعر نذرِ قارئین ہے اس میں فدا نے آسی کی تاریخ وفات کہی ہے:

مُجھ سے کہا یہ مُلہمِ غیبی نے اے فدا سالِ وِصال اُس کا ''فضیلت مآب'' ہے
۱۳۶۳ ہجری

(اشارہ): بعض تذکروں میں آسی کا سالِ وفات ۱۳۶۴ ہجری لکھا ہے۔ جو دُرست نہیں۔ فدا حسین فدا اور پیر غلام دستگیر نامی کے قطعاتِ تاریخ سے آسی کا سالِ وفات ۱۳۶۴ ہجری ثابت ہے۔ نامی کا قطعۂ تاریخ حاشیہ میں دیکھئے۔

☆ ۱۳۶۶ ہجری مطابق ۱۹۶۴ عیسوی میں فدا لاہوری کے مُرشد سید رسُول قریشی، ہاشمی کا وصال ہوا۔ اس سانحہ پر فدا لاہوری نے متعدد شعر کہے ایک تاریخ "صُوری انداز" سے کہی۔ اس میں پانچ اشعار ہیں۔ ان پانچ اشعار میں ابتدائی دو اشعار "صَنعَتِ صُوری" (۸) میں ہیں۔ (صنعتِ صُوری کی امثال و وضاحت کے لیے حاشیہ کی سطور ملاحظہ فرمائیں)

مُندرجہ بالا قطعۂ تاریخ میں صُوری صنعت ان اشعار سے ظاہر ہوتی ہے

۱۳۶۶ھ	۷ محرم
تیرہ سو ہجری سن چھیاسٹھ تھا	اور تھی ہفتمیں محرّم کی
پیر نو بجے شب	
یوم دوشنبہ نو بجے شب کے	ہوئی رحلت ہے اس مکرّم کی

☆ بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناح کا ۱۳۶۷ ہجری مطابق ۱۹۴۸ عیسوی کو انتقال ہوا۔ فدا لاہوری نے کئی تاریخیں نکالیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

☆ (الف) وہ بابائے قوم و فدائے وطن — گئے دارِ فانی سے سوئے جنّت ☆

فدا سے کہا ملہمِ غیب نے — سن مرگ ہے، "آہ فیاضِ ملّت"
۱۳۶۷ھ

(ب) "غمِ مُحیطِ کرم" (۱۳۶۷ ہجری)

(ج) "داغِ سراجِ زماں" (۱۳۶۷ ہجری)

(د) "دلاور قائدِ اعظم" (۱۳۶۷ ہجری)

☆ ۱۳۷۰ ہجری مطابق ۱۹۵۰ عیسوی میں پیر سید جماعت علی شاہ کی وفات پر ایک طویل قطعہ کہا جس کے آخری شعر میں سنہ وفات ہے اختصاراً صرف وہی آخری شعر جو

☆ مصرع ناموزوں ہوگیا ہے (ادارہ)

حامل تاریخ ہے۔ نذرِ قارئین ہے:

سروشِ غیب نے اُن کا سنِ وصال فدا؎ کہا۔ ''امیرِ مکرم شہ جماعت'' ہے
۷۰ ہجری ۱۳

(از مضمون ''فدا کی تاریخ گوئی'' تحریر سعید بدر مطبوعہ ''تذکارِ فدا'' ص ۷۲)

☆ ۱۳۷۷ ہجری مطابق ۱۳۵۸ عیسوی میں محی الدین ابن مولوی خیر الدین المعروف مولانا ابوالکلام آزاد دہلوی سابق وزیرِ تعلیم ہند کی وفات پر فدا لاہوری نے یہ تاریخ کہہ کر آزاد کو خراجِ عقیدت پیش کیا:

سُن کے ہاتف سے فدا نے برمحل ''ضیغمِ حق'' اس کی رحلت پر کہا
۱۹۵۸ء

(تذکرہ درفشان)

☆ ۱۳۷۹ ہجری مطابق ۱۹۵۹ عیسوی فرزند شعیب سلمہ کی ولادت ہوئی۔ فدا نے تاریخِ ولادت کہی:

ہوا القا فدا کو ہاتف سے ہے ''ظہورِ پسر بجا'' تاریخ
۱۳۷۹ ہجری

(تذکرہ درفشاں)

☆ ۱۳۸۰ ہجری مطابق ۱۹۶۰ عیسوی میں حکیم فقیر محمد امرت سری، کی کتاب ''مجرباتِ فخر الاطبا'' طبع ہوئی آپ نے تاریخِ طباعت کہی:

مجھے تھی فکر جب تاریخ کی، ہاتف نے فرمایا فدا یہ فی البدیہہ لکھ کہ ''خضرِ راہ الحق ہے'' ☆

۱۹۶۰ عیسوی

(تذکرہ درفشاں، ص ۱۳۲۹)

☆ دوسرا مصرع خارج از بحر ہے (ادارہ)

☆ دسمبر ۱۹۶۱ عیسوی مطابق ۱۳۸۱ ہجری میں پیر غلام دستگیر نامی لاہوری کی وفات پر فدا نے قطعۂ تاریخ کہا۔ پورا قطعۂ تاریخ ماہنامہ "پیامِ مشرق" لاہور۔ ماہ مئی ۱۹۶۲ عیسوی میں صفحات نمبر ۴۴/۴۵ پر طبع ہے

واصلِ حق حضرتِ نامی ہوئے   رنج سے ہر دل بنا دادِ محن
پوچھی جب تاریخِ رحلت اے فدا   بولا ہاتف "نامی شیریں سخن"
۱۳۸۱ ہجری

(تذکرۂ دُرفشاں، ۱۲۲۹)

☆ ۱۳۸۱ ہجری مطابق ۱۹۶۲ عیسوی میں پیرزادہ مولوی بہاء الحق قاسمی نے اپنے بزرگوں کا تذکرہ اور کشمیر و امرت سر کی تاریخ پر مشتمل ایک کتاب موسوم بہ "تذکرۂ اسلاف" لکھی۔ فدا نے اس کی تاریخ طبع لکھی۔ اس کے دو آخری مصرعے نذر ہیں:

فکرِ تاریخِ طباعت پر فدا   بولا ہاتف "چھپ گیا ہے تذکرہ"
۱۳ ۸۱ ہجری
(از تذکرۂ اسلاف ص، ۱۳۶)

☆ ۱۳۸۲ ہجری مطابق ۱۹۶۲ عیسوی میں مولوی سردار احمد لاہوری کا انتقال ہوا۔ فدا نے کئی تاریخیں کہیں: (الف) "آہ فاضل سردار"۔ (ب) "صدمۂ مرگِ محدث اعظم" (ج) "انتقالِ عالی فطرت"

(از اخبار "رضائے مصطفٰے۔ گجرانوالہ)

☆ ۱۳۸۳ ہجری مطابق ۱۹۶۳ عیسوی میں مولوی مُحمد سَعید ادب سیمابی متوطن شہر ملتان کا پوتا (لائق علی ابنِ محمد فاروق) تولد ہوا۔ فدا نے قطعہ تاریخ کہہ کر مُبارک باد پیش کی۔ قطعہ کا پہلا اور آخری شعر یہ ہے:

☆ شگفتہ ہوئی اس کے دل کی کلی ہے فاروق کو حق نے بیٹا دیا
فدا سالِ تولید تم یہ کہو "ہے فرزند شایستہ لایق علی"
۸۳ ہجری ۱۳

(ماہنامہ "مہر و ماہ" ستمبر ۱۹۶۳ء)

اشاریہ: مندرجہ بالا تاریخی مصرعے میں "شایستہ" اور "لایق" میں ہمزۂ اشباعی ہے۔ جس میں موجود "ہمزہ" دراصل "ی" کا قائم مقام ہے لہٰذا جمہوری اصول کے تحت دس (۱۰) عدد شمار کیے گئے ہیں

☆ ۱۳۹۲ہجری مطابق ۱۹۷۲عیسوی میں والدہ حکیم محمد موسیٰ امرتسری، محترمہ غلام فاطمہ (اہلیہ فخر الاطبا جناب حکیم فقیر محمد چشتی نظامی) کے انتقال پر یہ تاریخ کہی:

گفت ہاتف اے فدا سالِ رحیل "عارفہ، طیبہ، مستورشد"☆
۹۲ ہجری ۱۳

☆ ۱۳۹۲ہجری مطابق ۱۹۷۲عیسوی کو خطاط العصر محمد صدیق، الماس رقم کا انتقال ہوا۔ آپ نے تاریخ وفات کہی:

اُسے تھی فنِ خطاطی میں حاصل دسترس ایسی کہ ہر اُستادِ فن کو اس کی تھی محبوب شخصیت
فدا کو محوِ فکر و جستجو دیکھا تو ہاتف نے کہا "عالی گہر خطاطِ اعظم" ہے سنِ رحلت

اشاریہ: مندرجہ بالا تاریخ عالی + گہر + خطاط + اعظم = ۱۹۶۶ء کے اعداد میں ۶ عدد کی
۱۱۱ ۲۲۵ ۶۱۹ ۱۰۱۱

کمی ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ شاید اس تاریخ کے الفاظ "عالی گوہر خطاطِ اعظم"
۱۹ عیسوی ۷۲

ہوں گے۔ اگر واقعی "عالی گوہر خطاط اعظم" ہو تو ۶ عدد کی کمی پوری ہوسکتی ہے۔ شاید ایسا ہی ہو ----- دراصل "گہر" لغوی اعتبار سے "گوہر" ہی کا مخفف ہے۔ معنی میں کوئی فرق نہیں۔ البتہ "گہر" کے عدد ۲۲۵ ہیں اور "گوہر" کے عدد ۲۳۱ ہوتے ہیں۔ ☆☆

☆ تاریخ پر مشتمل مصرع کا ناموزوں ہونا محلِ نظر ہے (ادارہ)

☆☆ اس ترمیم سے تاریخ تو درست ہو جاتی ہے لیکن مصرعہ ساقط الوزن ہو جاتا ہے (ادارہ)

☆ ۱۳۹۲ ہجری مطابق ۱۹۷۲ عیسوی میں پیر فضل گجراتی سجادہ نشین حضرت شاہ دولہ دریائی رحمتہ اللہ علیہ کے وصال پر فدا نے تاریخ وفات کہی:

فدا! کر کے قطع تعلق جہاں سے — رواں آج ہیں فضل شہ سوئے جنت

وہ شیرازیٔ عہد، سعدیٔ دوراں — سراپائے شعر وادب، گنج حکمت

وہ بہزاد تصویرِ حُسنِ بتاں کے — تقدس نگارِ مجاز و حقیقت

مقرب تھے وُہ شاہ دولہ کے الحق — شناسائے اسرارِ شرع وطریقت

ہے گویا ہوا مجھ سے ہاتف فدا یوں — کہو "شاہِ بزمِ غزل" سالِ رحلت

۱۳۹۲ ہجری

☆ ۱۳۹۴ ہجری مطابق ۱۹۷۴ عیسوی میں حافظ الحاج پیر سیّد غُلام مُحی الدین چشتی، نظامی، فخری علی اللہ مقام (خلف الصدق حضرت قطب عالم پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ) کے وصال پر فدا کے جذباتِ عقیدت اور تاریخ وفات:

ہوئے عازم سوئے جنت ہیں آج — فدا! حضرتِ محی دیں، دیں پناہ

چمکتے نہ چرخِ ولایت پہ کیوں وہ — رہی اُن پہ مہرِ علی کی نگاہ

سِنِ وصل اُن کا فدا برمحل

کہو "رحلتِ ہادیٔ خلق آہ"

۱۳۹۴ ہجری

☆ مُبلّغ اسلام ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاری رحمتہ اللہ علیہ کی رحلت ۱۳۹۴ ہجری مطابق ۱۹۷۴ء میں ہوئی مزار، اَحاطہ المرکز الاسلامیہ شمالی ناظم آباد۔ کراچی۔ فدا صاحب نے قطعۂ تاریخ کہا اس کے چند اشعار نذر قارئین ہیں:

چل بسا دارِ فنا سے آج ہے اک مردِ حق — ہو نہ کیوں مغموم اس پر ہر دلِ دردآشنا

عشقِ محبوبِ خدا کی ان کے دل میں تھی تڑپ — اور آنکھوں میں سمایا تھا جمالِ مُصطفےٰ

باتفِ غیبی فدا سے برمحل بے ساختہ
"فضلِ رحماں شمعِ دانش" سالِ رحلت کہہ گیا
۱۹۷۴ عیسوی

☆ حضرت مولانا مفتی الحاج حافظ قاری علامہ عزیز احمد قادری، بدایونی کا انتقال ۱۴۰۹ ہجری مطابق ۱۹۸۹عیسوی میں ہوا۔ اور احاطہ درگاہ حضرت جان محمد حضوری گڑھی شاہو لاہور میں مدفون ہوئے۔ حضرت مفتی صاحب کی سوانح حیات ادارہ معارف نعمانیہ لاہور نے طبع کی۔ فدا حسین فدا لاہوری نے تاریخ کہی:

اُٹھ گیا دُنیا سے ہے اک آج مردِ باخدا — وہ مُحدِّث، وہ مُفسّر، وہ عزیزِ دیں پناہ

مفتیِ دینِ متیں تھا وہ حقیقت آشنا — رہبرِ شرع و طریقت صاحبِ فضل و کمال

"وارثِ ابوانِ خُلد" افلاک سے آئی ندا — اے فدا اُس کے سنِ رحلت پہ مجھ کو غمنا
۱۴۰۹ ہجری

☆ ۲۲ جمادی الثانی ۱۴۱۰ ہجری مطابق ۲۰ جنوری ۱۹۹۰ عیسوی بروز ہفتہ، محترمہ امیر النساء والدۂ ماجدہ صاحب "معدنُ التّواریخ" ابوالطاہر فدا حُسین فدا اور دادی صاحبہ جناب طاہر ابدال طاہر صاحب امیر النساء مدفون بجوار حضرت پیر بودیاں والے علیہ الرحمہ

وُہ ذی جاہ مادر، وُہ ظلِ الٰہ — رواں آج ہیں سُوئے باغِ جناں

وُہ پابندِ صوم و صلوٰۃ و سلام — وہ شب زندہ دار و تقدّس نشاں

وُہ غوثِ مُعظّم کے در کی فقیہہ — وُہ گرویدۂ سیّدِ مُرسلاں

تھی "بی اماں مالن" کی اُن پر نظر — عیاں جن پہ الحق تھے سرِّ نہاں

دُعاؤں سے ان کی ہیں مامون ہم — وگرنہ ہے چرخِ کہن بدگماں

فدا مصرعِ سالِ رحلت کہو تم!
امیر النساء شمعِ نورِ قرآں
۱۴۱۰ ہجری

☆ ۱۴۱۰ ہجری مطابق ۱۹۸۹ عیسوی میں مؤرخ لاہور میاں محمد دین کلیم قادری کے انتقال پر فدا نے کہا:

اُٹھ گئے دارِ فنا سے ہیں محمد دین آہ — ان کو آخر مل گئی گویا حیاتِ سرمدی

اے فدا ان کے سنِ رحلت پہ مجھ کو دفعتاً — غیب سے آئی ندا "فخرِ دیار قادری"

۱۴۱۰ ہجری

☆ محترمہ شمیم خانم صاحبہ مرحومہ، رفیقۂ حیات جناب سردار علی احمد خاں صاحب نگراں مہر و ماہ۔ لاہور کا ۱۴۱۱ ہجری مطابق ۱۹۹۱ عیسوی میں انتقال ہوا۔ فدا نے ان کے انتقال پر مندرجہ ذیل تاریخ کہی:

وہ شمیمِ نیک دل، وہ زوجِ ذی فہم و شعور — جان سے گزری ہے آخر آج وہ جانِ حیا

جستجوئے سالِ رحلت پر فدا سے برمحل — "نیک باطن داخلِ خُلد" آج رضواں نے کہا

۱۴۱۱ ہجری

☆ عارفِ کامل صوفی باصفا حکیم محمد عظیم قاسمی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال ۱۴۱۱ ہجری مطابق ۱۹۹۱ء عیسوی کو ہوا۔ آپ نے اُن کے انتقال پر تاریخ کہی:

مردِ حق، صُوفی منش، حاذق طبیب — ناگہاں وہ آج دُنیا سے گیا

ہاتفِ غیبی نے مجھ سے بے سرِ "ایقا" فدا — سالِ رحلت "عارفِ ذی شاں" کہا

۱۴۱۲-۱=۱۴۱۱ھ

تشریح: "بے سرِ ایقا" کے اشارے کے مطابق "عارفِ ذی شان" کے اعداد ۱۴۱۲ میں سے "ایقا" کے "ا" عدد ۱ کا "تخرجہ" (یعنی نفی) کرکے ۱۴۱۱ ہجری حاصل ہوتے ہیں

☆ ۲ رجب المرجب ۱۴۱۱ھ مطابق ۲۳ جنوری ۱۹۹۱ء کو میاں احمد دین چشتی (والدِ بزرگوار جناب حکیم مولانا اشرف چشتی) کے انتقال پر فدا نے تاریخ کہی:

حضرتِ والا گہر مولانا احمد دین آہ — دارِ فانی سے ہوئے ہیں راہیِ ملکِ بقا

والدِ مشفق جناب اشرف مغموم کے — دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہو گئے سب سے جُدا

جستجوئے سالِ رحلت پر فدا سے برمحل — "پاک باطن عابدِ مغفور" ہاتف نے کہا

۱۴۱۱ ہجری

☆ ۱۴۱۱ ہجری مطابق ۱۹۹۰ عیسوی ہی کو سیّد محمد مدنی خلفِ الصدق حضرت سید محمد حسین گیلانی (برادر زادہ مخدومی سیدی حضرت پیر محمد حسن شاہ گیلانی نوری) کا انتقال ہوا۔ وہ چک سادہ شریف گجرات میں مدفون ہیں۔ فدا نے ان الفاظ میں اپنے تاثراتِ غم پیش کئے:

سیّد السادات کے گھر کا وہ اک چشم و چراغ ناگہاں دارِ فنا سے آہ رخصت ہو گیا
وہ حُسین والا شاں کا راحتِ جاں نورِ عین نیک طینت خوش خصال و صاحبِ صدق و صفا
وہ برادر زادۂ شاہِ حَسَن والا گُہر اور جگر گوشہ جنابِ غوث کی اولاد کا
سیدِ مدنی[1] کی رحلت پر فدا سے باادب بولا ہاتف ''شاہ زادہ داخلِ جنت'' ہوا
۱۴۱۱ ہجری

☆ ۱۴۱۱ ہجری مطابق ۱۹۹۰ عیسوی ہی میں محترم سیّد مسعود حسن شہاب دہلوی مدیرِ اعلیٰ ہفت روزہ ''الہام'' بہاولپور کا انتقال ہوا۔ موصوف کے جسدِ خاکی کو قبرستان حضرت پیر حامد چشتی عقب شیر باغ بہاولپور میں سُپردِ خاک کیا گیا۔ فدا نے اس موقع پر سات اشعار کا قطعۂ تاریخ کہا۔ چند اشعار یہ ہیں:

سیّدی مسعود حسن بزمِ جہاں سے اُٹھ گئے ہو گئے وُہ سرفرازِ زندگیِ جاوداں
آسمانِ علم و حکمت کا درخشندہ شہاب محفلِ شعر و ادب تھی جس کے دم سے ضوفشاں
کہہ گیا ہاتف فِدا سے اُن کا سالِ ارتحال کر رقم ''اہلِ مَعانی شاعرِ شیریں بیاں''
۱۴۱۱ ہجری

''فدا کی تاریخ گوئی'' پر مضمون لکھتے ہوئے محترم سعید بدر نے تاریخ گوئی کی چند مثالیں بھی رقم کی ہیں۔ لکھتے ہیں کہ برصغیر کا مغل حکمران ہمایوں چھت سے گر کر اللہ کو پیارا ہوا تو اس کا سنہ وفات ''ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد'' موزوں ہو گیا۔ محترم سعید بدر صاحب نے نہ تو اس کا سنہ لکھا اور نہ ہی یہ تاریخ کہنے والے تاریخ گو شاعر کا نام۔ راقم الحروف نہ صرف سعید بدر صاحب بلکہ جملہ

---

(۱) لفظ 'مدنی' میں حرف 'د' متحرک ہے لیکن زیرِ نظر مصرعہ میں ساکن باندھا گیا ہے (ادارہ)

قارئین کی معلومات میں اضافے کی غرض سے عرض کر رہا ہے۔ ''ہمایوں بادشاہ ۷ ربیع الاوّل ۹۶۳ ہجری مطابق ۱۵۵۵ عیسوی کو شاہی کتب خانے کے بام سے گر کر ۱۵ ربیع الاوّل کو فوت ہوئے۔ اُن کا سنہ وفات مُلّا مُحمد ابُو القاسم متخلص بہ کاہی بھکری نے کہا (کاہی بھکری بقول ڈاکٹر ہادی حسن (صاحب اسلامک کلچر) ''۸۶۸ ہجری مطابق ۱۴۶۳ عیسوی میں پیدا ہوئے۔'' اور مقالات الشعراء کے مطابق ۲ ربیع الثانی ۹۸۸ ہجری مطابق ۱۵۸۰ عیسوی کو بعمر ایک سو دس (۱۱۰) سال وفات پائی۔ فیضی نے آپ کی تاریخِ وفات صنعتِ صُوری و معنوی میں کہی: ''دویم از ماہ ربیع الثّانی'' (۹۸۸ ہجری)۔) (یہ تاریخ صنعتِ صُوری و معنوی کی بہترین مثال ہے)۔۔۔ ہمایوں بادشاہ کی وفات کی تاریخ جس کا سَرسَری ذکر محترم جناب سعید بدر صاحب نے فرمایا اُس پر مشتمل نادر و نایاب قطعۂ تاریخ قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش خدمت ہے:

ہمایوں بادشاہِ ملکِ معنیٰ — ندارد کس چو اُو شاہنشہی یاد
زبامِ قصرِ خود اُفتاد ناگہ — وزاں عمرِ عزیزش رفت برباد
پئے تاریخِ اُو کاہی رقم زد — ''ہمایوں بادشاہ از بام اُفتاد''
۹۶۲ ہجری

راقم الحروف کا مقالہ سندھ میں تاریخ گوئی مطبوعہ سہ ماہی الاقرباء۔ اسلام آباد۔۔ (تذکرۂ دُرفشاں ص: ۶۶۷)

اشاریہ: نمبر ۱ بزمِ تیموریہ کے ص ۱۴۱-۲۴۲ پر اس قطعہ کا آخری شعر تو یہی لکھا ہے مگر ابتدائی چار شعر مُندرجہ بالا اشعار سے بالکل مختلف ہیں۔ (واللہ اعلم بالصّواب)

اشاریہ: نمبر ۲ مقالات الشعراء میں صفحہ ۹۶۹ پر اور منتخب التواریخ از بیدل بدایونی میں ہمایوں بادشاہ کی وفات کا سنہ ۹۶۳ ہجری بالاتفاق لکھا ہے۔

اس سے تو صاف ظاہر ہے کہ ہمایوں کی وفات ۹۶۳ ہجری میں ہوئی مگر کاہی بھکری کے مصرع تاریخ کے اعداد ۹۶۲ ہوتے ہیں۔ گویا ایک عدد کم رہتا ہے۔ اب صاحبانِ تحقیق فیصلہ فرمائیں۔

حواشی، ماخذات وحوالہ جات

1 سرزمینِ پنجاب کی ایک سو پچپن (۱۵۵) سالہ تاریخ میں "فنِ تاریخ گوئی" کے نامور تاریخ گو شعراء مندرجہ ذیل گزرے ہیں:

(الف)۔ سرور لاہوری، (ولادت: ۱۲۴۴ ہجری، وفات: ۱۳۰۷ ہجری) نام مولوی حاجی مفتی غلام سرور۔ صاحب "خزینۃ الاصفیا"، نیز صاحب "گنجِ تاریخ" دونوں کتب
۱۲۸۰ ہجری
کے نام تاریخی ہیں۔ "گنجِ تاریخ میں کم وبیش دس ہزار ۱۲۸۴ ہجری تاریخی مادّے سرور نے خود کہے ہیں۔ گلزارِ شاہی نامی کتاب کی سرور نے تاریخ کہی:

رقم کر مصرع تاریخ سرور "کتابِ نامور گلزارِ شاہی"
۱۲ ۹۴ ہجری

(ماخوذ: نقوش لاہور: از تذکرۂ زرفشاں مرتبہ سید خورشید علی مہر تقوی سجے پوری۔ ص ۱۰۷۱)

(ب) مفتوں جلال پوری، (ولادت ووفات نامعلوم)۔ نام حکیم منشی عبدالحمید۔ ۱۳۷۰ ہجری کی اسلامی محمدی تقویم بمبئی سے طبع ہوئی۔ تو مفتوں کی تاریخ تقویم میں چھپی:

صنعتِ منقوطہ میں تاریخ ہے مفتوں نہاں "رشکِ تقویم کا یہ حسن اور نقش ونگار"
(صرف منقوطہ حروف سے) ۱۳۷۰ ہجری

منقوطہ حروف کی تشریح: ش + ت + ق + ی + ی + ن + ں + ق + ش + ن = ۱۳۷۰ ہجری
۳۰۰ ۴۰۰ ۱۰۰ ۱۰ ۱۰ ۵۰ ۵۰ ۱۰۰ ۳۰۰ ۵۰

(ج) متین پٹیالوی، نام خلیفہ سید محمد محسن (ولادت ووفات نامعلوم) بہت بلند پایہ تاریخ گو شاعر تھے ہر مصرع سے تاریخ کہنے میں مہارت رکھتے تھے۔ ۱۸۸۹ء/ ۱۳۰۰ھ/ ۱۹۴۶ بکری میں وائسرائے ہند نے مہاراجہ کو اختیارات دیئے تو متین نے یہ قطعہ کہا

"خدیو صاحبِ بخت بلند با اقبال" "چو شاہ خلق مہاراجہ راج اندر سنگھ"
۸۹ عیسوی ۱۸ ۳۶ بکری ۱۹

"طراز مسندِ پٹیالہ خسروِ دوراں"   "بہارِ گلشنِ پنجاب وبحرِ فضل وکمال"
۱۸ عیسوی ۸۹   ۱۹ بکری ۴۶

(ماخوذ: تذکرۂ دُرفشاں مرتبہ مہر تقوی جے پوری۔ص ۹۰۴)

(د) حفیظ جالندھری: پاکستان کے قومی ترانے کے خالق اور شاہنامۂ اسلام کے شاعر۔ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان نے "دارالاسلحہ" کا افتتاح کیا۔ حفیظ نے تاریخ کہی:

مصرعِ تاریخِ دارالاسلحہ لکھ دے حفیظ   "اب بدستِ ناظمِ ملت کھلا بابِ دفاع"
۱۹ عیسوی ۵۱

(ماخوذ: تذکرۂ دُرفشاں مرتبہ مہر تقوی جے پوری)

(ہ) حفیظ ہوشیار پوری: شیخ عبدالحفیظ نام، حفیظ ہوشیار پوری تخلص بہت ہی مشاق تاریخ گو شاعر تھے۔ پیر غلام دستگیر نامی کی وفات پر کہا:

اور کیا ہو نامی مرحوم کا سالِ وفات   "زندہ جاوید ہے نامِ غلام دستگیر"
۱۹ عیسوی ۶۲

(از ماہنامہ: پیامِ مشرق" لاہور۔ ماہ مئی ۱۹۶۲ء)

(و) نامی لاہوری: پیر غلام دستگیر نے ۱۳۸۱ ہجری میں وفات پائی۔ عمدہ تاریخ گو شاعر تھے نامی لاہوری کی ایک تاریخ نمونۃً دیکھئے: خواجہ غلام صمد انبالوی کے انتقال پر نامی نے تاریخ کہی:

ہوئے فوت جب وہ ندا آئی نامی   کہ تاریخ ہے "خواجہ باغِ ارم میں"
عیسوی ۱۹ ۵۹

(مرسلہ حکیم محمد موسیٰ امرت سری مرحوم۔ لاہور۔ ماخوذ تذکرۂ دُرفشاں مرتبہ مہر تقوی)

(ز) عزیز گوجرانوالہ: مولوی حاجی عزیز الدین۔ (ولادت دسمبر ۱۸۴۱ عیسوی بمقام قلعہ دیدار سنگھ گوجرانوالہ وفات ۵ دسمبر ۱۹۰۵ عیسوی بہاولپور) بہت اعلیٰ درجہ کے تاریخ گو شاعر تھے۔ خوش نویسی میں بھی استادی کا درجہ رکھتے تھے۔ نواب صادق محمد خاں والی بہاولپور نے مفتیِ شہر بنا دیا۔ نواب صبح صادق محمد خاں عباسی کی سالگرہ

۱۳۱۳ ہجری مطابق ۱۸۹۵ عیسوی پر دوسو (۲۰۰) اشعار کی ایک مثنوی نواب صاحب کی خدمت میں پیش کی جس کے ہر مصرع سے سنہ سالگرہ ۱۳۱۳ ہجری حاصل ہوتا ہے۔ جس میں حمد بھی ہے، نعت بھی مدح نواب بھی اور تہنیتِ سالگرہ بھی۔ نواب صاحب کی مدح کے اشعار سے ایک شعر بطور نمونہ نذرِ قارئین ہے: جس کے دونوں مصرعوں سے سنہ سالگرہ ۱۳۱۳ برآمد ہوتا ہے:

"بگوشِ خوبروں یاصاحبِ جاہ" "دُرِ اشعارِ من چوں لولوے شاہ"

۱۳ ہجری ۱۳ ۱۳ ہجری ۱۳

(مراسلہ جناب اختر واصفی مرقومہ ۱۴ ربیع الآخر ۱۳۸۴ ہجری از گوجرانولہ بنام مہر تقوی جے پوری "تذکرۂ درفشاں")

ڈاکٹر ابرار عبدالسلام

نیساں اکبرآبادی کی تاریخ گوئی: تجزیاتی مطالعہ

ہندوستان میں انیسویں صدی کے معتبر و مفتخر فنون میں سے ایک تاریخ گوئی کا فن بھی ہے۔ یہ ہندوستان میں بالعموم اور شمالی ہند میں بالخصوص تہذیب کی علامتوں میں سے ایک علامت سمجھا جاتا تھا۔ اُس صدی میں شاعری کا جوہر اسی فن میں کھلتا تھا اور حالی کے بقول تو اسے شاعر ہی نہیں سمجھا جاتا تھا جو تاریخ نہ کہہ سکتا تھا(۱) اگر کوئی شخص اس کے باوجود اپنے شاعر ہونے کا دعویٰ کرتا تھا تو اس کے اس دعوے کو مشکوک سمجھا جاتا تھا۔ بیسویں صدی میں جہاں اور بہت سی اصناف نے اپنا چولا بدلا وہیں بہت سی اصناف اور فنون زمانے کے تقاضوں کے بدل جانے کی وجہ سے گوشۂ گمنامی میں مستور ہو گئے۔ ان میں سے ایک فن تاریخ گوئی کا بھی ہے۔ انیسویں صدی تاریخ گوئی کے عروج کی صدی ہے۔ بیسویں صدی میں اس فن نے اپنی بساط لپیٹنا شروع کر دی تھی اور اس صدی کے اختتام تک پہنچتے پہنچتے تو صورت حال اس نوبت تک پہنچ گئی تھی کہ شاید ہی کوئی شاعر ہو جو اس فن میں مہارت رکھتا ہو یا کم از کم تاریخ کہہ سکنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور اس کے اسرار و رموز سے مکمل واقفیت کا دعویٰ بھی رکھتا ہو۔ ہند و پاک میں اگر اس فن کے جاننے والوں اور اس میں تاریخ کہہ سکنے والوں کو شمار کیا جائے تو ان کو انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے۔ یہ بھی وہ شخصیات ہیں جنھوں نے انیسویں صدی کے جید شعرا کی آنکھیں دیکھی ہوئی تھیں یا ان کے شاگردوں سے مستفید رہ چکے ہیں۔ ان شعرا میں حامد حسن قادری، خالد حسن قادری، حفیظ ہوشیار پوری، رئیس امروہوی، شمیم صبا متھراوی، ساحر لکھنوی، قمر وارثی، ظہور جارچوی، کوثر نقوی، سیدہ، مغیث الدین فریدی، اعجاز جودھپوری، مہر نقوی جے پوری، سید انور علی شاد جے پوری، شاغل عثمانی جے پوری، منشی چند بہاری لال جے پوری، رسا لکھنوی، عشرت جلالی رامپوری، شرف خورجوی، شائق اکبر آبادی، انتخاب علی کمال، زبیر فاروقی شوکت اور طالب اجمیری قابلِ ذکر نام ہیں۔ بیسویں صدی

کے ان تاریخ گوشعرا میں ایک چمکتا ہوا ستارہ سید علی عباد عرف نیساں اکبرآبادی کا بھی ہے۔

نیساں اکبرآبادی خاندانی شاعر تھے۔ ان کے دادا محمد حسین قمر، نانا سید وقار علی عروج، چچا سید آل محمد اخگر، ماموں علامہ نجم آفندی، بھائی سجاد علی مہر شاعر تھے۔ ان کی دادی بھی شاعرہ تھیں۔ اس لحاظ سے ان کا گھرانہ شاعر گھرانہ ہے اور ان پر یہ مصرع ''ایں خانہ ہمہ آفتاب است'' صادق آتا ہے۔ میر انیس نے کہا تھا 'پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں'۔ میرے ناقص علم میں تیسری پشت تو نیساں اکبرآبادی کی بھی ہے۔ سید علی عباد عرف نیساں اکبرآبادی بیسویں صدی کے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے اپنی شعری صلاحیت کا استعمال مختلف انداز اور مختلف اصناف سخن میں اس طرح کیا کہ ان کی قادرالکلامی پر مہر تصدیق ثبت ہوگئی انھوں نے قرآن کریم کو اردو اشعار کے روپ میں پیش کیا۔ نہج البلاغہ کے ۲۳۹ خطبات کو نظم کا جامہ پہنایا۔ صحیفۂ کاملہ جو حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کی چون دعاؤں کا مجموعہ ہے، کی دعاؤں کو شعری صورت گری کے ذریعے نظم کے پیکر میں ڈھال کر پیش کیا۔ ان کے یہ ادبی کارنامے اردو کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے

اردو کی وہ اصناف جو انیسویں صدی میں شعرا کا طرۂ امتیاز ہوا کرتی تھیں، نیساں اکبرآبادی نے بیسویں صدی میں بھی انھیں اپنے دل سے لگا کر رکھا اگر چہ آج کل اردو شاعری اپنی صورت، ہئیت اور موضوعات میں انیسویں صدی کی شاعری سے بہت مختلف ہو چکی ہے لیکن نیساں اکبرآبادی ان شخصیات میں سے ایک ہیں جنھوں نے اپنی قدیم مشرقی اور شعری روایات کو اپنے دل سے لگا کر رکھا۔ زمانے کے انقلاب اور روایات کی تبدیلی کے باجود نہ اپنے آپ کو بدلا اور نہ اپنے خیالات کو۔ اسی وجہ سے انھوں نے اپنی کلاسیکی شعری روایت سے انحراف کرنا پسند نہیں کیا۔ نیساں اکبرآبادی کے شعری کلام کو دیکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ قدیم مشرقی شعری روایت سے ان کا تعلق پختہ اور مستحکم ہے۔ یہ تعلق ذہن و دل ہر دو سطحوں سے جڑا ہوا محسوس کیا جا سکتا ہے۔

انیسویں صدی تاریخ گوئی کے عروج کی صدی تھی۔ اس عہد میں بڑے بڑے قد آور اور باکمال تاریخ گوشعرا کے شاگردوں میں ایک معروف نام سید وقار علی عروج کا بھی ہے۔ سید وقار علی عروج اپنے دور

کے منفرد تاریخ گو اور معروف شاعر تھے۔ تاریخ گوئی میں ان کی مہارت کا یہ عالم تھا کہ وہ باتوں باتوں میں ۔تاریخ کہہ دیا کرتے تھے۔نیساں اکبرآبادی نے فن تاریخ گوئی کی تربیت اپنے نانا سید وقار علی عروج سے حاصل کی۔انھی کے فیض کی بدولت انھوں نے بھی اس فن میں اس درجہ استعداد حاصل کر لی تھی کہ بہت مختصر وقت میں تاریخ کہہ دیا کرتے تھے۔اس حوالے سے انھوں نے اپنی کتاب ''دُرجِ تاریخ'' میں دو واقعات بھی نقل کیے ہیں۔(۲)

''دُرجِ تاریخ'' نیساں اکبرآبادی کے تاریخی قطعات پر مشتمل کتاب ہے۔اس کتاب میں ان کے کہے ہوئے ۱۶۷ قطعات تاریخ اور ۸ دیگر تاریخیں شامل ہیں۔ یہ قطعات ان کے معاصرین سے متعلق بھی ہیں اور گذشتہ صدیوں میں وفات پانے والے مشہور شعرا سے متعلق بھی۔ ان تاریخوں سے نیساں کی قادرالکلامی بھی ظاہر ہوتی ہے اور مشاقی بھی۔ان تاریخوں کے پیش نظر انھیں بیسویں صدی کا ایک اہم تاریخ گو کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

تاریخ کی خوبیوں میں سے ایک خوبی یہ ہے کہ جس مصرع سے سنہ مطلوب حاصل کیا جائے وہ مصرع سالم لکھا جائے۔جزو مصرع یا مصرع کے کسی لفظ یا حرف سے تاریخ متخرج کرنے کو بھی تاریخ گو اساتذہ نے ناپسندیدہ قرار دیا ہے۔(۳) نیساں اکبرآبادی کی تاریخوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کے بیشتر مادۂ تاریخ مکمل مصرعوں سے برآمد ہوتے ہیں۔ذیل میں چند تاریخیں ملاحظہ کیجیے۔

تاریخِ وفاتِ امیر خسرو

نغمہ خوانی سے خسرو کا تھا ربط ۔۔۔ نامور خوش بیانی سے خسرو
کیسی برجستہ تاریخ کہہ دی ۔۔۔ ''وہ گیا دارِ فانی سے خسرو''
۱۳۲۴ھ (۴)

تاریخِ وفات محمد قلی قطب شاہ

قطب شاہ کہتا ہے جس کو جہاں ۔۔۔ وہ پہلا ہے اردو ادب کا امام
اسی کے لیے ہے یہ تاریخِ مرگ ۔۔۔ ''محمد قلی شاعرِ خاص و عام''
۱۶۱۱ھ(۵)

تاریخِ وفات پروین شاکر

پروین شاکر کا حادثہ جا نکاہ سارے لوگوں کے غم میں اشک ڈھلے
کل تلک رونقِ شباب وہی ''اب گیا ہے شباب خاک تلے''
۱۴۱۵ھ(۶)

تاریخ کی خوبیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ تاریخ کہنے والا جس شخص یا واقعہ کی تاریخ کہنا چاہتا ہے۔ اس واقعہ یا صاحب واقعہ کا نام اس طرح مادۂ تاریخ میں استعمال کرے کہ پڑھنے والا فوراً سمجھ جائے کہ یہ کس شخص یا واقعہ کی تاریخ کہی گئی ہے۔(۷)

تاریخ وفات امتیاز علی تاج

اک عالم بے کیفی و بے رنگی ہے ہر سو دنیا ہے فسردہ کہ اٹھے تاج جہاں سے
تاریخ وفات ان کی یہ برجستہ نکالی ''مغموم ہوئے تاج کے جانے سے ڈرامے''
۱۹۷۰ء(۱۹)

تاریخِ وفات محسن نقوی

حُب اہل بیت ان کے دل میں تھی اپنی الفت کا صلہ وہ پا چکے
آئی کانوں میں مرے آوازِ غیب ''خدمتِ مولا میں محسن جا چکے''
۱۴۱۶.(۲۰)

تاریخِ وفات برادرم پروفیسر سید علی سجاد مہر اکبر آبادی

جب سے گئے ہیں پیارے بھائی اس دنیا سے دور کوئی نہ جانے کوئی نہ سمجھے کتنا ہوں رنجور
فرقِ قلق کو میں نے اٹھا کر کہہ دی یہ تاریخ ''مہر درخشاں ڈوبا لیکن بکھرا اس کا نور''
۲۰۸۹_۱۰۰=۱۹۸۹ء(۲۲)

تاریخ گو شعرا کی خواہش ہوتی تھی کہ مادۂ تاریخ میں صاحب واقعہ کا مکمل نام مع القاب و آداب آنا چاہیے کیونکہ اس سے پڑھنے والے کو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ کس کی تاریخ کہی گئی ہے۔ اگر مادۂ تاریخ میں سالم نام نہ آ سکے اور جزو نام بھی خوبصورتی سے استعمال نہ ہو سکے تو کم سے کم یہ کوشش کی جاتی تھی کہ مادۂ تاریخ کے الفاظ سے کوئی خاص اشارہ یا کنایہ، واقعہ مخصوص یا شخص

مطلوب کی جانب کیا گیا ہو۔ جس سے معاصرین فوراً پہچان لیں کہ یہ تاریخ کس شخص سے متعلق ہے۔ اس کی مثال میں درج ذیل مادۂ تاریخ کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس میں داغ کی رحلت کی تاریخ ''ہائے وہ داغ دے گئے دل پر'' ۱۳۲۲ھ سے نکالی گئی ہے۔ اس تاریخ میں داغ کے لفظ سے داغ دہلوی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جس سے یہ معلوم کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ مذکورہ تاریخ داغ دہلوی کی وفات کے حوالے سے کہی گئی ہے۔ (۲۳) اسمٰعیل حسین منیر نے ذوق کی وفات کی تاریخ ''فرہاذوقِ زباں دہلی میں'' ۱۲۷۱ھ سے اور خواجہ بدرالدین امان دہلوی کی وفات کی تاریخ قدر بلگرامی نے ''آہ بدر آیا خسوفِ گور میں'' ۱۲۹۲ھ سے نکالی ہے۔ (۲۴) ذیل میں نیساں اکبرآبادی کی وہ تاریخیں درج کی جاتی ہیں جن میں انھوں نے صاحب واقعہ کی تاریخِ وفات کے قطعات میں صراحت کا اظہار تو نہیں کیا لیکن وہ مادۂ تاریخ میں ایسے اشارے کر جاتے ہیں جن سے صاحب واقعہ یا وقوع واقعہ سے متعلق جاننے میں مشکل پیش نہیں آتی۔ ان کی بیشتر تاریخوں میں صاحب واقعہ کا نام بھی موجود ہوتا ہے۔ صاحب واقعہ کے نام سے مادۂ تاریخ کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے۔ ذیل میں صفی لکھنوی اور عزت لکھنوی کی وفات کی وہ تاریخیں درج کی جاتی ہیں جن کے مادۂ تاریخ وفات میں دونوں شاعروں کے نام استعمال ہوئے ہیں۔

تاریخِ فات صفی لکھنوی

یہ جو دنیا تھی سرائے چھوڑ کر اس کو گئے — خلد کے گلشن میں کتنے ہی سخنور آ گئے
مصرعۂ تاریخ یہ رضواں سے مجھ کو مل گیا — ''باغِ جنت میں صفی لکھنوی بھی جا بسے''
۱۹۵۰ء (۸)

تاریخ وفات عزت لکھنوی

متقی ذیشان عزت لکھنوی — مذہبی رجحان زیب شاعری
وقفِ ذکرِ پنجتن ان کی حیات — بعدِ مُردن بھی ہے ان کی زندگی
مجھ کو اک الہام سا ہونے لگا — مصرعۂ تاریخ کی جب فکر کی

ہاتھ آیا مصرعۂ تاریخ یہ "خلد میں ہیں آج عزت لکھنوی"
۱۴۰۱ھ(۹)

اکابر تاریخ گو شعرا نے تاریخ کی یہ خوبی بھی بتائی ہے کہ جس شخص کی تاریخ کہنا مقصود ہو اس کا پورا نام مع القاب و آداب مادۂ تاریخ کا جزو ہونا چاہیے۔ بالفرض مادۂ تاریخ میں پورا نام نہ آسکے تو نام کا کوئی جزو ضرور مادۂ تاریخ میں موجود ہونا چاہیے۔ بالخصوص ایسا جزو جس سے متعلقہ شخص کو پہچانا جا سکے۔ نواب عزیز جنگ ولا نے کامل لکھنوی کا قول نقل کیا ہے کہ اگر تاریخ میں پورا نام نہ آسکے تو مجبوری کی حالت میں جزو نام بھی کافی ہوگا۔ اس کے لیے انھوں نے درج ذیل تاریخ پیش کی ہے۔ جیسے "قیامت ہوئی ہائے مہدی کی رحلت" ۱۳۲۵ھ (۱۰) مذکورہ مصرع میں مذکور شخص کا پورا نام مہدی علی ہے یہ پورا نام مادۂ تاریخ میں نہیں لایا جا سکا۔ اس لیے صرف نام کا جزو خاص ہی تاریخ میں شامل کر دیا گیا۔ نیساں اکبرآبادی کی بیشتر تاریخیں مذکورہ بالا معیار یا خوبی کی حامل ہوتی ہیں۔ وہ مادۂ تاریخ میں یا تو مطلوبہ شاعر کا پورا نام لاتے ہیں۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو نام کا اہم جزو مادۂ تاریخ میں لاتے ہیں۔ اس جزو خاص کی وجہ سے قاری کو یہ معلوم کرنے میں دقت پیش نہیں آتی کہ مذکورہ تاریخ کس شخص کی کہی گئی ہے۔ مزید یہ کہ وہ جزو خاص کو مادۂ تاریخ میں اس خوبصورتی سے لاتے ہیں کہ وہ صرف تاریخ ہی نہیں رہتی ادب کا اعلیٰ نمونہ بھی بن جاتا ہے۔ مثلاً نظیر اکبرآبادی کی وفات کا مادۂ تاریخ وفات "صحن فردوس میں پہنچا وہ نظیر" ۱۸۴۶ء (۱۱) مرزا سلامت علی دبیر کا مادۂ تاریخ وفات "دشتِ فانی سے گیا دیکھ دبیر کامل" ۱۲۹۲ھ (۱۲) باقی صدیقی کی وفات کا مادۂ تاریخ "خلد میں ہے دیکھیے وہ باقی رنگیں سخن" ۱۹۷۵ء (۱۳) ڈاکٹر یاور عباس کی وفات کا مادۂ تاریخ "باغِ خلد میں یاور گیا" ۱۹۸۵ء (۱۴) فیض بھرتپوری کی وفات کا مادۂ تاریخ "مرثیہ گو فیض آئے ہیں ارم" ۱۹۸۹ء (۱۵) تحسین جعفری کی وفات کا مادۂ تاریخ "باغ فردوس میں تحسین اب آئے" ۱۹۹۵ء (۱۶) قیصر بارہوی کی وفات کا مادۂ تاریخ "باغِ جنت میں قیصر گئے" ۱۹۹۶ء (۱۷) فراق گورکھپوری کا مادۂ تاریخ وفات "فراق جوش میں فراق اس جہاں سے آ گئے" ۱۴۰۲ھ (۱۸) سے نکالا ہے۔ مادۂ تاریخ کو پڑھتے ہی صاحب واقعہ کے بارے میں آگاہی ہو جاتی

ہے۔قارئین کے ذوقِ طبع کے لیے چار تاریخی قطعات بھی پیش کیے جاتے ہیں۔

تاریخِ وفات علامہ اقبال

قوم کو جس نے دیا شانِ خودی کا پیام
کیوں نہ ہو وجہ فغاں شاعرِ مشرق کی موت
فکرِ رسا سے ملی مجھ کو یہ تاریخِ مرگ
"قوم کا ہائے زیاں شاعرِ مشرق کی موت"
۱۹۳۸ء (۲۵)

تاریخِ وفات سید محمد جعفری (مزاح نگار)

وہ جس کو کہتے تھے جعفری سب وہ بادشاہِ سخن تھا نیساں
ہنر سے اپنے دلوں کو جیتا ہے محوِ حیرت بنا کے اٹھا
جو واقعہ ہے وہ نظم کر دو اسی میں تاریخِ مرگ بھی ہے
"یہ ایک طرفہ ہوا تماشا ہنسانے والا رلا کے اٹھا"
۱۹۷۶ء (۲۶)

تاریخِ وفات جوش ملیح آبادی

اردو ادب میں جوش کی ہستی تھی مستند
دانشوروں میں علم کا سکہ بٹھا گیا
لطفِ بیاں بھی زورِ بیاں کے تھا ساتھ ساتھ
رنگِ سخن وہ اپنا سبھی پر جما گیا
جھٹکا قلم تو اس سے بہاریں ٹپک پڑیں
اک جنبش قلم سے گلستاں کھلا گیا
تاریخِ مرگ مل گئی رضواں نے جب کہا
"نظموں کا بادشاہ بھی جنت میں آ گیا"
۱۹۸۲ء (۲۷)

تاریخِ وفات لیاقت علی خان

قائد ملت کو گولی کا نشانہ کر دیا
جو وطن پر جاں چھڑکنے کے لیے تیار تھے
واقعہ بھی ہے یہی اور مصرعۂ تاریخ بھی
"قائد اعظم سے ملنے قائد ملت گئے"
۱۹۵۱ء (۲۸)

شعر میں تاریخ کہہ دینا اگرچہ مشکل کام ہے لیکن ایسا مادۂ تاریخ نکالنا جو رواں، برجستہ اور تعقیدِ لفظی سے مبرا ہو مشکل کام ہوتا ہے۔نیساں اکبر آبادی کے قطعات کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ ان کے بیشتر قطعات رواں، برجستہ اور تعقیدِ لفظی سے پاک ہوتے ہیں۔قاری مادۂ تاریخ کو

پڑھتے ہوئے لذت محسوس کرتا ہے۔ مرزا داغ بھی ایسے ہی مادوں کو پسند کرتے تھے جن میں زبان کی خوبی ہوتی تھی۔ نواب عزیز جنگ ولا نے داغ کے حوالے سے لکھا ہے کہ داغ کی تاکید تھی کہ تاریخ میں بامحاورہ الفاظ کا خاص خیال رکھا جانا چاہیے۔ خوبی زبان کا درجہ سب پر مقدم ہے۔ عمدہ مضامین نقص زبان کی وجہ سے خاک میں مل جاتے ہیں اور کم درجہ کا مضمون بھی خوبی زبان کیساتھ چمک اٹھتا ہے۔ ان کا یہ قول تھا کہ اگر کسی مادۂ تاریخ میں زبان کی خوبی ہو اور صاحب واقعہ کا نام نہ آسکے تو ایسا مادۂ تاریخ اس مادۂ تاریخ پر فائق ہوگا جس میں صاحب واقعہ کا نام تو ہو مگر زبان کا لحاظ نہ رکھا گیا ہو۔ (۲۹) اصغر گونڈوی کی وفات کا مادۂ تاریخ ''اٹھ گیا دنیا سے اک شاہِ غزل'' ۱۹۳۶ء (۳۰) جوش کی وفات کا مادۂ تاریخ ''نظموں کا بادشاہ بھی جنت میں آ گیا'' ۱۹۸۲ء (۳۱) میر کی وفات کی تاریخ ''بابائے سخن میر تقی میر جہاں ہے''۔ ۱۸۱۰ء (۳۲) ساغر نظامی کی وفات کا مادۂ تاریخ دنیا سے آج اٹھ کے ساغر چلے گئے ہیں'' ۱۹۸۴ء (۳۳) محسن نقوی کی وفات کا مادۂ تاریخ ''خدمتِ مولا میں محسن جا چکے'' ۱۴۱۶ھ (۳۴) مرتضیٰ بھٹو کی وفات کا مادۂ تاریخ'' آچکا ہے مرتضیٰ بھٹو کے پاس'' ۱۹۹۶ء (۳۵) قیسی رام پوری کا مادۂ تاریخ وفات'' آج قیسی رام پوری چین سے جنت میں ہیں'' ۱۳۹۴ھ (۳۶)

اردو اور فارسی زبان میں کہی جانیوالی تاریخیں بالعموم ایک مصرعے یا جزو مصرع سے نکالی جاتی تھیں۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی شعرا نے قطعۂ تاریخ کے آخری شعر کے دونوں مصرعوں سے ایک سنہ (ہجری یا عیسوی) یا مختلف سنین (ہجری اور عیسوی وغیرہ) میں تاریخیں نکالی ہیں، نیساں اکبرآبادی کی تاریخوں کی ایک خوبی یہ ہے کہ انھوں نے بعض تاریخیں دو مصرعوں کے مجموعے سے نکالی ہیں۔ یہ تاریخ کا نیا انداز ہے لیکن خرابی اس میں یہ ہے کہ اگر پڑھنے والے کو علم نہ ہو تو وہ اسے ناقص تاریخ کہہ کر رد کرسکتا ہے۔ اس لیے تاریخ گو کو چاہیے تھا کہ وہ قطعاتِ تاریخ میں اس امر کا اظہار کرے کہ مادۂ تاریخ ایک نہیں دو مصرعے ہیں۔ جیسا کہ حامد حسن قادری نے حسرت موہانی کی وفات کی تاریخ میں اشارہ کیا ہے کہ مادۂ تاریخ ایک مصرع نہیں پورا شعر ہے۔

تاریخ یہ ہے۔

اللہ باقی، باقی فسانی موت حقیقت، زیست کہانی

قادری ان کی مدح ہے مشکل ان پر ہو فضلِ ربانی
سچے لیڈر، ناقد شاعر مولانا حسرت موہانی
۱۰۴۳ + ۹۰۸ = ۱۹۵۱ء (۳۷)

ذیل میں مرزا رفیع سودا، شوکت تھانوی اور حفیظ جالندھری کی وفات کی تاریخیں درج کی جاتی ہیں۔ تینوں تاریخوں میں نیساں اکبرآبادی نے آخری شعر (دونوں مصرعوں سے) سے تاریخ وفات برآمد کی ہے۔

تاریخِ وفات مرزا سودا

اپنی دنیا بسائی جنت میں چھوٹے وہ قیدِ زندگانی سے
ان کی تاریخ شعر میں کہہ دو دادلواپنی خوش بیانی سے
"تھے جو سودا قصیدہ گو شاعر چل دیئے آہ دارِ فانی سے"
۱۳۰۱ + ۴۷۹ = ۱۷۸۰ء (۳۸)

تاریخ وفات شوکت تھانوی

دلوں میں ہے گدگدی سی اب تک وہ شعر ایسے سنا کے اٹھا
دلوں کو تسخیر کر لیا ہے ادب کی دنیا پہ چھا کے اٹھا
سنا جو شوکت اٹھے جہاں سے تو میرے منہ سے معاً یہ نکلا
"عجیب میں نے خبر وہ پائی ہنسانے والا. رلا کے اٹھا
۱۰۸۱ + ۸۸۲ = ۱۹۶۳ء (۳۹)

تاریخِ وفات حفیظ جالندھری

ہوئے ہیں پیارے خدا کو حفیظ جالندھر خبر یہ سن کے بہت دل کو مضطرب پایا

کسی نے مجھ سے یہ آکر کہا کہ اے نیساں — نکالو شعر میں تاریخ ہاں مگر اعلیٰ

نہ اس میں فکر کو ہو دخل نے تخیل کو — یہ کہہ دی شعر میں تاریخ میں نے برجستہ

''جہان چھوڑا کہ پہنچا ارم کی وادی میں — جو شاہنامۂ اسلام کا مصنف تھا''

۷۵۲ + ۱۲۳۰ = ۱۹۸۲ء (۴۰)

تعمیہ اور تخرجہ کو بالعموم تاریخ کے نقائص میں شمار کیا جاتا ہے لیکن بعض شعرا نے ان میں بھی ایسی جدتیں اور ندرتیں پیدا کی ہیں کہ اکابر تاریخ گوان کو بھی مخصوص صورت اور حالت میں محاسنِ تاریخ گوائی میں شمار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ اردو تاریخ گوئی کی روایت میں مومن نے تعمیہ اور تخریجہ میں خاص التزام سے ایسے حسین اور دلکش جواز پیدا کیے کہ تاریخ گوئی کی روایت میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ نیساں اکبر آبادی کی تاریخوں میں ایسے خوبصورت التزام تو نہیں ملتے لیکن ان کی کوشش ہوتی تھی کہ ان کی تاریخیں تعمیہ یا تخرجہ کے عیب سے پاک ہوں اور اگر تعمیہ یا تخرجہ کا سہارا لینا بھی پڑے تو اس میں حسن التزام برتنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں کیپٹن راشد منہاس شہید نشانِ حیدر اور اسد اللہ خاں غالب کی وفات کی تاریخیں پیش کی جاتی ہیں۔ جن میں نیساں اکبر آبادی نے خوبصورت مادۂ تاریخ بھی نکالا ہے اور خوبصورت تخرجہ سے مطلوبہ اعداد بھی پورے کر دیے ہیں۔

تاریخ شہادت راشد منہاس

وطن کی الفت ہی اس کو کھینچے جواں طرح جل میں موجزن تھی — جواں راشد نے تج کے دنیا بہشت کی سمت رخ کیا ہے

جو وقت آئے تو اپنی جاں کو عزیز ہرگز نہ تم سمجھنا — مجاہدینِ وطن کو نیساں یہ جاتے جاتے سبق دیا ہے

زباں سے میری جو آہ نکلی تو میں نے تاریخ خوب پائی — ''شہید راشد نے ہو کے قرباں نشانِ حیدر بھی پالیا ہے''

۷۷ـ۶ =۱۹۷۱ء(۴۱)

تاریخ وفات غالب

غالب نے کیا ملک عدم کو آباد — اس غم میں ہوا سارا زمانہ ناشاد

تاریخ ملی "آہ" جو منہ سے نکلی   "گزرا ہے جہاں سے آج غالب استاذ"

۱۸۷۵ـ۱۶ = ۱۸۶۹ء (۴۲)

ذیل میں تین اور تاریخیں پیش کی جاتی ہیں جن میں نیساں اکبرآبادی نے تخرجہ کا سہارا لیا ہے

تاریخِ وفات علامہ رشید ترابی

تھا لقب جن کا ترابی نام تھا جن کا رشید   خلد کی جانب گئے ہیں یہ کہا' آیا نہ راس

غم زدہ لوگوں میں سے یہ ایک نے اٹھ کر کہا   "بن ترابی مجلسیں سُونی ہیں منبر بھی اداس"

۱۴۲۴ـ۳۱ = ۱۳۹۳ھ (۴۳)

تاریخِ وفات شورش کاشمیری

ایک جرأت مند انساں شاعرِ شعلہ بیاں   مبتلائے غم تھا کل تک آج وہ راحت میں ہے

تُو سرِ افسوس اٹھا یہ غیب سے آئی ندا   دیکھ "شورش کاشمیری داد ئ جنت میں ہے"

۱۹۷۶ـ۱ = ۱۹۷۵ء (۴۴)

تاریخِ وفات احسان دانش

جوش سے ملنے کی خواہش کا جو اک جذبہ اٹھا   چل دیے منہ موڑ کے دنیا سے شاعر تھے عظیم

یوں سر افسوس اٹھا کے کہہ دی ہے تاریخ مرگ   "خلد کی بستی میں ہیں احسان دانش بھی مقیم"

۸۸۲ = ۱۹۶۳ء (۳۹)

تعمیہ کی بھی ایک خوبصورت مثال دیکھیے

تاریخِ وفات علامہ ابوالاعلیٰ مودودی

مودودی جن کا نام تھا عالم تھے دین کے   اللہ کے کلام کا بھی ترجمہ کیا

تاریخ مرگ میں نے کہی 'دل' لگا کے یہ   "اک فخرِ روزگار زمانہ سے اٹھ گیا"

۱۹۷۹ء = ۱۹۴۵+۳۴ء (۴۶)

شاعر نے لفظ 'دل' کے ۳۴ عدد آخری مصرع کے ۱۹۴۵ اعداد کے مجموعہ سے سالِ مطلوب ۱۹۷۹ء حاصل کیا ہے۔ تعمیہ کے لفظ 'دل' سے شاعر کے خلوص کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

محاسن تاریخ میں ایک یہ بھی ہے کہ شاعر جو بھی تاریخ کہے اسے مکمل مصرعے میں کہے آدھے مصرعے یا جزو مصرع میں کہی ہوئی تاریخ کو پسند نہیں کیا جاتا۔ نیساں اکبرآبادی کی کچھ تاریخیں جزو مصرع سے نکلتی ہیں لیکن ان تاریخوں کی خوبی یہ ہے کہ تاریخوں کے مادے خوبصورت ہیں اور یاد رہ جانے والے ہیں۔ ایسی تاریخیں جن کے مادے خوبصورت اور یاد رہ جانے والے ہوں انھیں راقم الحروف خوبصورت تاریخ میں شمار کرتا ہے۔ ذیل میں حسرت موہانی کی وفات کی تاریخ دیکھیے

تاریخ وفات حسرت موہانی

خلقاً علیٰ شعر بھی تھے بہتریں　　　سختیاں جھیلیں سیاست میں رہے

کس قدر اچھی کہی تاریخِ مرگ　　　"نامور شاعر تھے حسرت" چل بسے

(۴۷)۱۹۵۱ء

صنعت توشیح اس صنعت کو کہتے ہیں جس کے ہر مصرع میں شاعر پہلا حرف ایسا لاتا ہے کہ ہر مصرع کے اوّل حرف کو اسی ترتیب میں رکھیں جس ترتیب میں وہ مصرعوں میں آئے ہیں۔ تو شخص مطلوب کا نام بن جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ہر مصرعے کے پہلے حروف کو بحساب جمل جمع کر لیا جائے اور اس سے سال مطلوبہ بھی حاصل ہو تو اسے تاریخ در صنعت توشیح کہتے ہیں۔ تاریخ گو شعرا نے اس فن میں بھی بہت نئے مادۂ ہائے تاریخ نکالے ہیں۔ نیساں اکبرآبادی نے اپنے بھائی سید سجاد علی مہر اکبرآبادی کی وفات کا سال صنعت توشیح میں نکالا ہے اور اس نظم کا جو عنوان تحریر کیا ہے وہ بھی تاریخی ہے۔ اس سے بھی ان کا سالِ وفات آشکار ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے۔

بیاد برادر محترم سید علی سجاد مہر اکبرآبادی حلیم مزاج ۱۹۸۹ء

۶۰	سوچا ہے میں نے یہ کہ دکھاؤں کمالِ فن	۳۰۰	شعروں سے آشکار ہو پھر اک جمالِ فن
۱۰	یعنی میں کہہ دوں صنعت توشیح میں وہ نظم	۴۰	محسوس کر لیں جس کو سخن دان اہلِ بزم
۴	دامن تر آنسوؤں سے پریشاں ہوا ہے دل	۱۰۰	قلب حزیں ہوا ہے مرا آج مضمحل
۷۰	عالی وقار مہر سخن کے تھے شہسوار	۲۰۰	رحلت سے ان کی دل کو نہیں ہے مرے قرار

۳۰	لازم ہے مجھ کو ان کی گناؤں میں کچھ صفات	۴۰۰	تھی وجہِ فخر بزمِ سخنور میں ان کی ذات
۱۰	یہ مہر آسمانِ ادب کے تھے بے گماں	۲۰۰	رمزِ سخن سے ان کو شناسائی، نکتہ داں
۶۰	سوچوں میں ان کی فکر کی گہرائی بھی ملی	۴۰	مضمون آفرینی بھی فطرت میں ان کی ذات
۳	جس رخ سے شعر کہتے تھے وہ منفرد ہی تھا	۶۰	سوزِ دروں کو شعروں میں اپنے بسا دیا
۱	اپنے سخن کے رنگ میں بے مثل ہی رہے	۴۰	منوالیا تھا زورِ قلم شعریوں کہے
۴	دانشوروں نے مانا تھا استادِ فن انھیں	۶۰	سر آنکھوں پہ بٹھاتے تھے اہلِ سخن انھیں
۴۰	معلوم ہے زمانے کو جوان کا تھا مقام	۴۰	مہر درخشاں یہ تھے بہر طور لا کلام
۵	ہائے اب ان کی یاد ہی دل میں سمائی ہے	۲	بدلی اداسیوں کی طبیعت پہ چھائی ہے
۲۰۰	رہبر ہے فکرِ نیساں یہ تاریخ دیکھیے	۱۰	یعنی حروفِ اولِ ہر مصرع لیجیے (۴۸)

۴۹۷ + ۱۴۹۲ = ۱۹۸۹ء

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات باعثِ تخلیق کائنات ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت ایمان کا حصہ ہے لہٰذا جو شخص یا چیز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات سے وابستہ ہوگئی یا اس نے تعلق قائم کرلیا وہ معتبر اور معزز ومکرم ہوگئی۔ جب ایک اجنبی شخص کی وابستگی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسے عرش بریں پر پہنچادیتی ہے تو خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آل اولاد کی حیثیت اور درجہ کتنا بلند ہوگا اس کے بارے میں ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے۔ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت دراصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہے۔ نیساں اکبر آبادی کو آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے خاص عقیدت تھی اس عقیدت کا اظہار ان قطعاتِ تاریخ میں ہوا جو ان کی تصنیف ''دُرجِ تاریخ'' کے آخر میں شامل ہیں۔ آلِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق ان کی عقیدت اور وفورِ جذبات قطعاتِ تاریخ کی صورت میں ڈھل کر سامنے آئے ہیں۔ ان قطعات میں انھوں نے رواجِ عام سے ہٹ کر نئے اور منفرد انداز سے تاریخیں کہی ہیں۔ ان تاریخوں میں شاعر کی عقیدت اور جذبہ ادبی حسن کے ساتھ مل کر ذوقِ طبع کا سامان بھی فراہم

کرتا ہے اور شاعر کا والہانہ پن بھی آشکار کرتا ہے۔ ذیل کی تاریخیں دیکھیے۔

پنجتن سے ہی محبت کا صلہ ملتا ہے یہ — جو بھی ان کو مان لے وہ رحمت باری میں ہے
دُور جوان سے رہے گا ہے جہنم اس کا گھر — پانچ ہی کا فرق تو بس نوری و ناری میں ہے
(۴۹)۲۶۶+۲۶۱

نوری کے اعداد ۲۶۶ ہیں اور ناری کے ۲۶۱۔ شاعر نے پنجتن پاک کی محبت کو نوری اور ان سے عداوت کو ناری سے منسوب کیا ہے۔

نام عباسِ جری کے لیجے پہلے دو حروف — کربلا والوں کی ہے تعداد پنہاں دیکھیے
اب الف اور سین جو باقی بچے ہیں دو حروف — ان میں تاریخ شہادت کو نمایاں دیکھیے
(۵۰)

شاعر نے حضرت عباسؓ کے نام سے تاریخ نکالی ہے۔ شاعر کے بیان کے مطابق اگر ہم حضرت عباسؓ کے نام کے پہلے دو حروف ع اور ب لیں تو ان کے اعداد ۷۲ بنتے ہیں۔ باقی بچنے والے دو حروف الف اور سین کے اعداد ۶۱ بنتے ہیں۔ یہ واقعہ کربلا کی تاریخ ہے۔

حیدر کی بھی صفات ہیں کیا کیا نہ پوچھیے — نفسِ رسول کہہ لو کہ مشکل کشا کہو
تاریخ ہے گو اہ سخی و شجاع ہیں — ''دریائے فیض'' کہہ لو کہ 'شیرِ خدا'' کہو
(۵۱) ۱۱۱۵ ۱۱۱۵

مذکورہ بالا تاریخ میں شاعر نے حضرت علیؓ کے حوالے سے تاریخ نکالی ہے۔ ان کے 'دریائے فیض' اور 'شیرِ خدا' کے اعداد برابر ہیں۔ یہ مشابہت حضرت علیؓ کے حوالے سے کرامت ظاہر کرتی ہے اس قطعہ میں دوسری خوبی یہ ہے کہ شاعر نے دوسرے شعر کے پہلے مصرع میں لفظ سخی اور شجاع استعمال کیا ہے اور دوسرے مصرع میں ان صفات کی مناسبت سے 'دریائے فیض' اور 'شیر خدا' کے الفاظ لائے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے قطعہ صرف اعداد کا کھیل ہی نہیں رہا بلکہ ادبی حسن سے متصف بھی ہو گیا ہے۔

نیساں اکبرآبادی کی تصنیف '' دُرجِ تاریخ'' کی ایک خوبی اور بھی ہے۔ یہ خوبی تاریخ گوئی کی بہت کم کتابوں میں موجود ہے وہ یہ کہ اس کتاب میں انھوں نے اپنے منظوم اور منثور تاریخی خطوط بھی درج کیے

ہیں (۵۲) یہ وہ خطوط ہیں جو انھوں نے اپنے معاصرین کو تحریر کیے۔ یہ صلاحیت اور خصوصیت بہت کم تاریخ گو یوں کے حصے میں آئی ہے۔ ذیل میں نیساں اکبرآبادی کا ایک تاریخی خط درج کیا جاتا ہے۔ یہ خط انھوں نے اپنے دوست شاعر اور ادیب وحید الحسن ہاشمی کے نام تحریر کیا تھا۔ یہ خط مصنف کے تمام خیالات کا عکاس بھی ہے اور تاریخ گوئی کی عمدہ مثال بھی۔ اس خط میں مکتوب نگار نے مکتوب الیہ کی ناسازیِ طبع کی خیریت دریافت کی اور ان کی صحت کے لیے دعا بھی کی ہے۔ مکتوب الیہ کے مرثیوں کے مجموعے 'العطش' کی وصولی کی رسید دی اور اپنے جذبات سے آگاہ بھی کیا۔ یہ خط ۱۴۱۶ھ مطابق ۱۹۹۶ء میں تحریر کیا گیا۔ اس لیے اس خط کے ہر جملے سے مذکورہ سنین برآمد ہوتے ہیں۔ خط درج ذیل ہے۔

نیساں اکبرآبادی کا مکرم وحید الحسن ہاشمی کے نام خط (۱۹۹۶ء)

محترم وحید پیر آسماں السلام علیکم ۱۴۱۶ھ

خط آیا ہے آپ کی ناسازیٔ طبع سے تشویش ہوئی۔ ۱۹۹۶ء میں دوام دعائے صحت کرتا ہوں ۱۴۱۶ھ آج نیک سیر وحید الحسن کے مرثیوں کا مجموعہ العطش پا گیا ۱۹۹۶ء آپ کو یہ گوہر نایاب بہت بہت مبارک ۱۴۱۶ھ میں یہ خط ایک فاضل ادیب کو بھیج رہا ہوں ۱۹۹۶ء آپ کا شمار صف اول کے ممتاز شعرا و ادیب میں ہوا ۱۹۹۶ء خط طویل کر کے میں کیا کروں گا جناب اجازت چاہوں گا ۱۹۹۶ء فقط مرسلہ نیاز مند حقیر نیساں اکبرآبادی ۱۴۱۶ھ (۵۳)

تاریخ گوئی ایک مشکل فن ہے۔ جس میں حسابی قابلیت کے بل پر ہی تاریخ گو کامیابی کے زینے پر قدم رکھتا ہے۔ یہی نہیں تاریخ گو اور بہت سی پابندیوں میں جکڑا ہوا ہوتا ہے۔ ان سب پابندیوں کے باوجود نیساں اکبرآبادی کی تاریخیں فقط تاریخیں نہیں بلکہ ادبی شاہکار کا درجہ بھی رکھتی ہیں۔ ان تاریخوں میں انھوں نے خوبصورت مضمون آفرینی کے نمونے فراہم کیے ہیں۔ یہ مضمون آفرینی کے نمونے ''دُرجِ تاریخ'' کے صفحات پر جابجا نظر آتے ہیں۔ یہ مضامین اکثر اوقات پورے مصرعے میں اس طور پر جلوہ گر ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہ مضامین اس قدر رواں اور صاف ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کو یہ گمان بھی نہیں ہوتا کہ ان مصرعوں کے عقب میں کسی کی وفات، پیدائش یا کسی واقعہ کے وقوع کا سال بھی چھپا

ہوا ہے۔

نیساں اکبرآبادی بیسویں صدی کی اردو تاریخ گوئی کی روایت کا وہ درخشندہ ستارہ ہے جس نے ذہن رسا، حسابی قابلیت، ذکاوت طبع اور تخلیقی اُپج کی بدولت خوبصورت تاریخیں اور یادرہ جانیوالے مادۂ تاریخ کہے ہیں۔ جس طرح کسی شاعر کی بقا کا راز اس کی یادرہ جانے والی غزلیں، نظمیں یا اشعار ہوتے ہیں۔ یہی اس کا سرمایہ ہوتے ہیں اور یہی اس کی بقا کے ضامن بھی۔ بالکل اسی طرح نیساں اکبرآبادی کے تاریخی قطعات میں سے بہت سے قطعات اور تاریخی مادے ایسے ہیں جو قارئین کے ذہنوں میں محفوظ رہیں گے۔ اسی وجہ سے ان کا نام بیسویں صدی کی اردو تاریخ گوئی کی روایت میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔

حواشی وحوالہ جات :

١ دیکھیے دیوان حالی، الطاف حسین حالی، نامی پریس کانپور، ١٨٩٣ء، ص ٣٢٠۔٣١٩

٢ دُرجِ تاریخ، نیساں اکبرآبادی، مطبع ٹی۔ ایس۔ پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، ١٩٩٧ء ص ٢٦۔٢٥

٣ دیکھیے تحقیقِ سخن، سید حسن مرتضیٰ شفق، مطبع سلیمانی شاہی الی، پٹنہ ١٩٣٠ء ص ٦٠ (٢) افادۂ تاریخ مشمولہ نگار، کراچی، تاریخ نمبر جولائی ١٩٦٣ء ص ٦ (٣) بیان التواریخ، شاہ محمد عزیز اللہ عزیز، ابولعلائی پریس، آگرہ، ١٣٣٢ھ ص ٣

٤ دُرجِ تاریخ ص ٤٣

٥ ایضاً ص ٤٣

٦ ایضاً ص ٦١

٧ بیان التواریخ، شاہ محمد عزیز اللہ عزیز، ابوالعلائی پریس، آگرہ ١٣٣٢ھ ص ٣۔٢

٨ دُرجِ تاریخ، ص ٤٨

٩ ایضاً ص ٥٨

۱۰ غرائب الجمل، نواب عزیز جنگ ولا، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، دسمبر ۱۹۹۸ء ص ۱۳۱

۱۱ ایضاً ص ۴۵
۱۲ ایضاً ص ۵۷
۱۳ ایضاً ص ۵۰
۱۴ ایضاً ص ۵۴
۱۵ ایضاً ص ۵۵
۱۶ ایضاً ص ۵۶
۱۷ ایضاً ص ۵۶
۱۸ ایضاً ص ۵۹
۱۹ ایضاً ص ۶۴
۲۰ ایضاً ص ۶۱
۲۱ ایضاً ص ۵۰
۲۲ ایضاً ص ۵۵
۲۳ غرائب الجمل ص ۱۳۲
۲۴ نگار، کراچی، تاریخ نمبر جولائی ۱۹۶۳ء ص ۴۰۔۳۹
۲۵ دُرجِ تاریخ، ص ۴۷
۲۶ ایضاً ص ۵۲
۲۷ ایضاً ص ۵۲
۲۸ ایضاً ص ۶۳
۲۹ غرائب الجمل ص ۱۳۲
۳۰ دُرجِ تاریخ، ص ۴۷
۳۱ ایضاً ص ۵۲
۳۲ ایضاً ص ۴۴
۳۳ ایضاً ص ۵۳
۳۴ ایضاً ص ۶۱
۳۵ ایضاً ص ۶۷
۳۶ ایضاً ص ۲۸
۳۷ آثار التواریخ، مولانا حامد حسن قادری، بکس انٹرنیشنل برطانیہ، اکتوبر ۱۹۹۹ء ص ۵۱
۳۸ دُرجِ تاریخ، ص ۴۳
۳۹ ایضاً ص ۴۹
۴۰ ایضاً ص ۵۳
۴۱ ایضاً ص ۶۴
۴۲ ایضاً ص ۳۶
۴۳ ایضاً ص ۶۸
۴۴ ایضاً ص ۵۰
۴۵ ایضاً ص ۵۲
۴۶ ایضاً ص ۶۴
۴۷ ایضاً ص ۴۸

۴۸ ایضاً ص ۳۶_۳۵ ۴۹ ایضاً ص ۷۴

۵۰ ایضاً ص ۷۸ ۵۱ ایضاً ص ۸۰

۵۲ تاریخی خطوط ان خطوط کو کہا جاتا ہے جن کے ہر جملے سے مطلوبہ سال مستخرج ہوتا ہے۔تاریخ گو خط میں اپنا مافی الضمیر بھی بیان کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود اس تحریر کے ہر جملے سے تاریخ بھی برآمد ہوتی ہے

۵۳ دُرج تاریخ، ص ۸۶ ۵۴ ایضاً ص ۹۶_۹۴

۵۵ گلستانِ ادب، نیساں اکبر آبادی، مطبع ٹی۔ایس، پرنٹرز، گوالمنڈی، راولپنڈی، ۱۴۲۵ھ/۲۰۰۵ء، ص ۱۶۸

پروفیسر سیّدہ نغمہ زیدی

فلاسفۂ مغرب اور اقبال

علامہ اقبالؒ ۱۹۰۵ء میں عازمِ انگلستان ہوئے اور اپنے مقصدِ سفر کا اظہار اس طرح کیا:

”چمن کو چھوڑ کے نکلا ہوں مثلِ نکہتِ گل — ہوا ہے صبر کا منظور امتحاں مجھ کو
چلی ہے لے کے وطن کے نگار خانے سے — شرابِ علم کی لذت کشاں کشاں مجھ کو

اقبال اس لحاظ سے خوش قسمت رہے کہ شرابِ علم کی لذت حاصل کرنے کا اُن کا یہ شوق انگلستان پہنچتے ہی پورا ہو گیا۔ اور اُن کی ملاقات میک ٹگارٹ جیسے فلسفی سے ہوئی جو ہیگل کا متبع تھا۔ پھر ادبِ فارسی کے مشہور مورخ اے۔ جی براؤن اور ”اسرارِ خودی“ کے مترجم ڈاکٹر نکلسن سے بھی ملاقات ہوئی۔ کیمبرج یونیورسٹی میں اُن کا زیادہ تر تعلق پروفیسر وارڈ سارلے اور پروفیسر براؤن سے رہا۔ تین سال کی قلیل مدت میں انھوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا اور کیمبرج یونیورسٹی سے فلسفۂ اخلاق میں اور میونخ یونیورسٹی سے ”میٹا فزکس آف پرشیا“ یعنی ایرانی الٰہیات پر مقالہ لکھ کر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ پھر جرمنی سے واپس آکر لندن کے سکول آف پولیٹیکل سائنس میں داخل ہوئے اور چھ ماہ تک لندن یونیورسٹی میں پروفیسر آرنلڈ کے قائم مقام کی حیثیت سے عربی کے پروفیسر بھی رہے۔

فلسفۂ مغرب کا صحیح معنوں میں آغاز سولہویں صدی سے ہوا ہے۔ جب یورپ کو پاپائیت کی ذہنی غلامی سے نجات ملی اور اس کی وجہ سے علم و حکمت کے دروازے ہمیشہ کے لیے کھل گئے۔ اور اس طرح میک ٹگارٹ، کینٹ، ہیگل، برگساں، نطشے، ویٹ مین، ہربرٹ ریڈ، بارکلے، ہیوم، شوپن ہار، فشٹے اور بے شمار فلاسفۂ مغرب نے وجودِ باری تعالیٰ، کائنات کی حقیقت، تخلیق انسانی،

اور مقصد حیات جیسے مسائل و مباحث کو کھل کر موضوعِ بحث بنایا اور قابل قدر نظریات پیش کیے۔
فلسفہ ایک قدیم علم ہے۔ اور ہمیشہ سے سائنس کا مرہونِ احسان رہا ہے۔ فلاسفۂ یونان کے بھی بیشتر خیالات کائنات کے اُس علم پر مبنی ہیں جو استقراء اور مشاہدے سے حاصل ہوتا ہے اور چونکہ فی زمانہ سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے اس لیے اُن لوگوں کے فلسفے کا بہت سا حصہ اب بے کار ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے یورپ کے تمام اربابِ فکر کی مو شگافیوں کا مطالعہ ہی نہیں کیا بلکہ تجربے کی بنیاد پر اُن تمام نظریات کی اصل قدر و قیمت بھی معلوم کی ہے۔ جس شخص کے فلسفیانہ نظریات سے اقبال متاثر ہوئے وہ نطشے (Nietzbche ۱۸۴۴ـ۱۹۰۰ء) ہے۔ جرمنی کا یہ عظیم مفکر ۱۹۰۰ء میں راہی ملک عدم ہوا۔ مگر اس کے نظریات نے تمام اہلِ یورپ میں تہلکا مچا دیا۔

نطشے کے فلسفے کا خلاصہ یہ ہے کہ ''خواہش اقتدار'' اس کائنات میں بنیادی حقیقت ہے۔ یہ خواہش زندگی کی فراوانی اور افزونی کی مظہر ہے اور بالذات تمام حسنات کی سرتاج ہے بالکل جس طرح شوپن ہار کے فلسفے میں ''خواہش زیست'' تمام سیئات کی بنیاد ہے۔ یعنی جو چیز شوپن ہار کی نظر میں بدترین ہے وہ نطشے کی نظر میں بہترین ہے کسی نے کہا ہے کہ شوپن ہار جسے شیطان سمجھتا ہے نطشے اُسے خدا سمجھتا ہے۔

طبقاتی حیثیت سے نطشے کے نزدیک اخلاق دو طرح کے ہیں (۱) آقائی (۲) غلامانہ صداقت کی تلاش، زندگی کو لذت و الم اور سود و زیاں کے پیمانے سے نہ ناپنا، ہر قسم کا اثبات اور حیات افزا فعلیت آقائی اخلاق کے مظاہر ہیں۔ اور ہر قسم کی بزدلی، رسوم و قیود سے باہر آنے کی کوشش نہ کرنا، عجز و قناعت، توکل، حلم، عبرت غرض کہ ہر قسم کی انفعالی صورتیں غلامانہ اخلاق میں داخل ہیں۔ اُس کے نزدیک انسانی کوششوں کا مقصود سب کو اونچا اٹھانا نہیں ہونا چاہیے بلکہ بہتر اور قوی تر افراد کا ارتقا ضروری ہے۔ اُس کے الفاظ یہ ہیں: ''بنی نوع انسان نہیں بلکہ انسان برتر مطمح نظر ہے''

خیر کیا ہے؟ ہر وہ چیز خیر ہے جو آدمی میں طاقت کا احساس، اپنے عزم اور خود طاقت میں

اضافے کا باعث ہو۔ اور شر کیا ہے؟ کمزوری سے مشتق ہر چیز ہے۔ نطشے فوق البشر کے لیے خطر پسندی اور کشمکش، عمدہ نسل، اعلیٰ تعلیم و تربیت، سخت کوشش بے خوفی، جرأت و استقلال، اخلاق پابندیوں سے آزادی، طاقت و توانائی، گناہ، موت اور ضمیر کے خوف سے آزادی، خود پسندی اور ارضی زندگی کو اصلی زندگی سمجھنا ضروری قرار دیتا ہے۔ نطشے نے مذہب سے انحراف کر کے خُدا کی موت کا اعلان کیا۔ اُس نے مسیحیت کے خلاف اعلان کیا کہ غلامانہ اخلاق کے سبب حکمت شعار انسان ابھی پیدا نہیں ہوا۔ ضرورت ہے کہ تمام مروجہ اقدار کو نئے سرے سے مرتب کیا جائے۔ آدمی کی آزمائش اس کی توانائی صلاحیت اور طاقت کے ذریعے ہوتی ہے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ بنی نوع انسان کی زندگی اخلاق و مذہب کے بجائے حکمت پر مبنی ہوگی۔ نطشے نے تکمیل ذات، ضبط نفس، خودنمائی و خود بینی کا پرچار کر کے انسانی خودی کو مستحکم کرنے پر زور دیا۔ سیاسیات میں نطشے کا خیال ہے کہ جمہوریت بھی درحقیقت آزاد افراد کی سرکوبی کا ایک طریقہ ہے۔ ترقی حیات کبھی جمہور کی رائے سے نہیں ہوئی۔ جمہوریت و اشتراکیت بھی عوام اور غلام اقوام کی ایک سازش ہے۔ نطشے کے خیال میں نپولین بوناپارٹ، جولیس سیزر، وغیرہ اس کے انسانِ برتر کے تصور سے بڑی مطابقت رکھتے ہیں۔ اقبال نطشے کے خیالات سے متاثر ہوئے کیونکہ وہ بھی اسلامی مذہبی فکر کی نئی تعبیر و تشکیل چاہتے تھے اور خودی کے استحکام کے ذریعے روحانی ارتقاء کے متمنی تھے۔ اقبال اور نطشے دونوں کی نظر میں جدوجہد اور خواہش، آویزش و تنازعات، خطرات و مشکلات اور مصائب و آلام کے مصلحانہ اثرات تعمیر انسانی کے بنیادی عناصر ہیں۔ دونوں مسیحی فلسفۂ اخلاق کے مخالف ہیں کیونکہ یہ خودی کو کمزور بناتا ہے۔ اقبال نے نطشے کے دل کو مومن قرار دیا مگر دماغ کو کافر ٹھہرایا۔ کیونکہ اقبال موحد ہیں جب کہ نطشے خُدا کا منکر، نطشے کے ہاں صداقت کا معیار قوت کے سوا کچھ نہیں۔ تنازع البقاء کا انداز ظالمانہ، بے رحمانہ اور جابرانہ ہے۔ جب کہ اقبال کا فوق البشر یا انسان کامل جلال و جمال دونوں کا مظہر ہے۔ اقبال خودی کے ساتھ بے خودی کا فلسفہ بھی رکھتے ہیں۔ اور فرد کا رشتہ ملت اور کائنات سے بھی جوڑتے ہیں۔

نطشے کی نظر فقط چند کامل افراد پر ہے۔ جب کہ اقبال تمام نوعِ انسانی کو ابھارنا چاہتے ہیں ان کے ہاں قاہری غالب ہے اور دلبری مغلوب۔ اقبال کے نصب العین انسان میں ناز کے ساتھ نیاز بھی ہے۔ نطشے جمہوریت اور مساوات کا دشمن ہے جب کہ اقبال ایک اعلیٰ سطح پر صحیح مساوات کے متلاشی ہیں۔ جو اسلام کی تعلیمات کا ایک امتیازی عنصر ہے۔ نطشے کا فوق البشر اپنی ذات میں محدود ہے۔ وہ قوت کے گھمنڈ میں ظلم و سنگدلی سے کام لے سکتا ہے۔ کیونکہ وہ کسی ہستی کے سامنے جواب دہ نہیں جب کہ اقبال کے انسان کامل کے سامنے خدا کی ذات موجود ہے۔ اور خدا چونکہ لامحدود ہے اس لیے انسانِ کامل کی ترقی کا میدان بھی لامحدود ہے۔ اور وہ تمام تر ترقیوں کے باوجود ذاتِ باری تعالیٰ کے آگے سربسجود ہوتا ہے۔ نطشے طبقۂ افراد میں اعلیٰ افراد پیدا کرنے کا خواہش مند ہے جب کہ اقبال کے فلسفے کی رو سے ترقی کی راہیں ہر خاص و عام کے لیے کھلی ہیں۔ اسلامی جمہوریت، یورپی جمہوریت کی طرح اقتصادی مواقع کی وسعت سے پیدا نہیں ہوتی۔ وہ تو ایک روحانی اصول ہے۔ کہ ہر شخص میں ترقی کی استعداد موجود ہے اور اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ہر انسان کی مخفی قوتوں کو بروئے کار لانے کی ترغیب دیتا ہے۔ نطشے نے بنی آدم کو آقا و غلام دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ جب کہ اقبال کے نزدیک ادنیٰ ترین طبقے کے افراد بھی خودی کے استحکام کے ذریعے بادشاہت کے مرتبے پر پہنچ گئے ہیں۔ نطشے روحانیت سے عاری تھا جب کہ اقبال کے نزدیک نگاہِ مردِ مومن تقدیریں بدل سکتی ہے۔ وہ ایام کا مرکب نہیں راکب ہے۔ وہ خدا کا نائب ہے۔ اس کی جلوت میں مصطفائی اور خلوت میں کبریائی ہے۔ فوق البشر کے برعکس مردِ مومن سراپا رحمت و شفقت ہوتا ہے۔ خدمتِ خلق، جان بازی، فولادی سیرت اور عشق کی مستی سے سرشار ہوتا ہے

اقبال نطشے کے فلسفے ارتقائے حیات، تسخیر فطرت، سخت محنت و ریاضت اور شعورِ ذات کے تو قائل تھے مگر وہ اس کے تمام نظریات کو من و عن قبول نہیں کرتے بلکہ اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ان میں ترمیم، تنسیخ اور اضافے کرتے ہیں، اقبال نطشے کو ایک دیوانہ قرار دیتے ہیں۔ جس نے اپنا بت خانہ اسلام کی بنیادوں پر قائم کیا۔ وہ مرشد کامل نہ مل سکنے کی وجہ سے سالک ہونے کے بجائے

مجذوب ہوگیا اور اپنی ہی عقل کے بھنور میں چکر کھاتا رہا۔ بقول اقبال

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں تو اقبال اس کو سمجھاتا مقام کبریا کیا ہے

علامہ اقبال ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے برطانیہ گئے کانفرنس سے فارغ ہونے کے بعد وہ فرانس کے مشہور فلسفی پروفیسر ہنری برگساں سے ملے۔ جن کے نظریے ''واقعیت زماں'' کو وہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے بہت قریب سمجھتے تھے۔ دوران ملاقات اس نظریہ پر بحث ہوئی اور ڈاکٹر صاحب نے برگساں کو یہ حدیث سُنائی کہ:

''زمانے کو بُرا مت کہو کہ زمانہ خود خُدا ہے'' اس حدیث کو سُن کر برگساں کرسی سے اُچھل کر آگے بڑھا اور پوچھا کیا یہ سچ ہے؟ برگساں کے زمانے میں میکانکی طبیعیات مادیت سے ہم کنار ہو چکی تھی اور خطرہ تھا کہ تمام اخلاقی اور جمالیاتی اقدار، ایمان، مذہب مادیت کے اس سیلاب کی نظر نہ ہو جائیں۔ کیونکہ ڈارون اور اس کے مقلدین کی تشریحات کے مطابق حیات و کائنات کے تمام تصورات اپنی اہمیت کھو چکے تھے بقول پروفیسر ٹنڈال (Tyndal):

''سائنس عنقریب اس قابل ہو جائے گی کہ وہ ابتدائی سحابیہ سے لے کر سائنس کی ترقی کے لیے برٹش ایسوسی ایشن کے جلسوں تک ہر چیز کو خالص فطری اور ارتقاء کے ناگزیر نقطۂ نظر سے واضح کر سکے۔''

برگساں نے سپنسر (Spencer) کی کتاب اصول اولین (First Principle) کا از سر نو مطالعہ کیا جب وہ تصور زمان پر آیا تو اُسے احساس ہوا کہ سپنسر کے تصور کے مطابق جو ارتقا سامنے آتا ہے وہ دراصل ارتقاء ہی نہیں۔ اور میکانیکی فلسفہ جس زماں کا تصور پیش کرتا ہے وہ زمان حقیقی نہیں بلکہ زمان اور مکان کے باہمی اختلاط سے رونما ہونے والی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ کائنات کے آغاز و ارتقاء کی مادی تعبیر پر سات سال تک گہرے تفکر کے بعد برگساں نے ۱۸۸۹ء میں اپنی پہلی کتاب ''زمان و اختیار'' (Time and Free will) شائع کی۔ برگساں کے

نزدیک زمانے کا وہ نظریہ غلط ہے جس میں اس کو ماضی، حال اور مستقبل میں تقسیم کیا گیا تھا۔ یہ نظریہ حساب دانوں نے علم حساب کے تصورات کے تحت بنایا تھا۔ مثلاً نیوٹن نے زمانے کو لکیر قرار دیا۔ جس کا کچھ حصہ طے کیا جا چکا ہے۔ اس کو ماضی کہتے ہیں۔ کچھ حصے پر ہم چل رہے ہیں اُسے حال کہتے ہیں اور جو حصہ طے کرنا باقی ہے وہ مستقبل ہے۔ اس قسم کے تصور کے مطابق زماں لامتناہی ہے۔ یک رنگ یک بعدی اور مسلسل ہے اور اس قابل نہیں کہ لوٹ کے آسکے۔ برگساں نے زمان کی یک رنگی اور تسلسل پر خاص طور پر زور دیا۔ برگساں اور اقبال دونوں اس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ یہ نظریہ زمانے کے خارجی ادراک کی کوشش ہے۔ کیونکہ اگر بالفرض زمانے کو لکیر کی طرح سمجھ بھی لیا جائے تو پھر دو ہی زمانے کہے جا سکتے ہیں یعنی حال اور مستقبل اور جس کو حال کہا جاتا ہے وہ ایک ایسا نقطۂ موہوم ہے جس کو پار کر لیا جائے تو ماضی بن جاتا ہے یا اس نقطے کو پار کرنا باقی ہو تو مستقبل کہلائے گا۔ برگساں کے نزدیک زمان کے اس تصور میں مکان کی آمیزش ہے جب کہ اقبال کے نزدیک زمانہ یک رو ہے جس میں نہ دن ہے نہ رات نہ ماضی نہ مستقبل اس کی حقیقت کو سمجھنا یا سمجھانا ایک مشکل کام ہے۔ حقیقی زمانہ یعنی مرور خالص سے زمان مسلسل پیدا ہوتا ہے۔ گویا زمانے کی دو قسمیں ہیں اور زمانہ حقیقی کی ماہیت روح کی طرح عقل کی گرفت سے بالاتر ہے

برگساں اور اقبال دونوں متفق ہیں کہ حقیقت کی صحیح ماہیت تک رسائی کے لیے ہمیں محض ظاہری کا مشاہدہ نہیں کرنا بلکہ باطن کی خبر بھی لانا ہے۔ جہاں سے حیات کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ یہ خارجی نظریہ زمان اُس وجدان کے قطعی برعکس ہے جو ہم کو درونِ سینہ میسّر ہوتا ہے۔ کیونکہ اندرون سینہ کی زندگی ایک مسلسل بہاؤ کی طرح ہے جس میں ماضی، حال، مستقبل سب ایک سلسلۂ وجود میں موجود معلوم ہوتے ہیں۔ اقبال کے اشعار ملاحظہ ہوں:

نہ نشیبے نہ فرازے نہ مقامے دارم　　　نہ بہ امروز اسیرم نہ بہ فردا نہ بہ دوش

سلسلۂ روز و شب تارِ حریر دو رنگ　　　جس سے بناتی ہے ذات اپنی قبائے صفات

سلسلۂ روز و شب ساز ازل کی فغاں　　جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بم ممکنات

عشق کی تقویم میں عصر رواں کے سوا　　اور زمانے بھی ہیں جن کا نہیں کوئی نام

برگساں نے کہا:

میرا وجود، احساسات، تاثرات، ارادات اور خیالات کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے جو باری باری مجھے مصروف رکھتے ہیں اور میں لگا تار بدلتا رہتا ہوں۔ لہٰذا میری داخلی زندگی میں کوئی چیز ساکن نہیں جو کچھ ہے وہ ایک مستقل حرکت ہے۔''

قرآن حکیم کی رو سے زمانِ الٰہی اُم الکتاب ہے۔ جس کے اندر تمام تاریخ مسبّب تسلسل (Casual sequence) کے حال سے آزاد ہو کر ایک بالا ابدی آن (Super Eternal now) میں جمع ہوگئی ہے۔ جاوید نامے میں یہی نکتہ ''زروان'' روحِ زماں و مکاں کی زبانی اِن الفاظ میں ادا کیا ہے۔

من حیاتم، من مماتم من نشور　　من حساب و دوزخ و فردوس و حور

آدم و افرشتہ در بند من است　　عالم شش روزہ فرزند من است

ہر گلے کز شاخ می چینی منم　　ام ہر چیز ے کہ می بینی منم

اقبال اور برگساں فلسفہ کے غائر مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حقیقت مطلق کا ادراک عقل و فکر کے ذریعے قطعی ناممکن ہے۔ حقیقت کا ادراک اس لیے ناممکن ہے کہ عقل ایک مقام پر پہنچ کر متضاد دعاوی (Anti-nomies) پیش کرتی ہے۔ اور یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ ان میں سے کون سی بات تسلیم کی جائے اور کون سی رد کی جائے۔ اس بات نے برگساں کو عقل اور وجدان کے مابین نہایت اہم خط امتیاز کھینچنے کی سجھائی یہ فلسفہ اقبال کانٹ اور برگساں نے متفقہ طور پر تسلیم کیا کہ وجدان ہی وہ کنجی ہے جو نہ صرف حقیقت کے مخفی دروازے تک لے جاتی ہے بلکہ اسے کھول بھی دیتی ہے۔ اور یوں برگساں نے ثابت کیا کہ حقیقتِ زمان محض ہے۔ وحدت ہے۔ مختار ہے۔ تخلیقی ہے۔ اقبال نے بھی عقل کو وجدان ذات کے مقابلے

میں محدود قرار دیا ہے اور وہ لامحدود کا ادراک نہیں کر سکتی۔ ذاتِ نفس کے رموز جن کی عقدہ کشائی سے عقل و حکمت عاجز نظر آتے ہے وجدان کے ذریعے نہ صرف واضح ہوتے ہیں بلکہ ان کے ثبوت کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت باقی نہیں رہتی کیونکہ وجدان میں حقیقت براہِ راست منکشف ہوتی ہے۔ وجدان کسی شے یا حقیقت کی تہہ تک پہنچنے کا نام ہے۔ عقل کا دارومدار حواس خمسہ پر ہے اس لیے تعقل و تفکر کسی شے کا محض بیرونی طواف کرتے ہیں اور اصلیت کو نہیں پہنچتے۔ وجدان ہی سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ ذاتِ نفس (جو درون سینہ مضمر ہے) ہر لحظہ متحرک، منقلب اور متبدل ہے اور مختلف احوال و کیفیات کی حامل ہے۔ اندرون سینہ کی زندگی ایک مسلسل ''بہاؤ'' کی طرح ہوتی ہے اس لیے برگساں انسانی شعور کی زیادہ گہری سطحوں کا پرزور حامی تھا۔ وہ وجدان کے اس کام کا بڑا قائل تھا جو حرکی تجربے کو معرض وجود میں لاتا ہے۔ اقبال اور برگساں دونوں حقیقت کو حرکی اور تخلیقی شمار کرتے ہیں۔ اقبال حقیقت کی تلاش میں ایک نئی روشنی اور رہنمائی کے متلاشی ہیں۔ یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

عقل گو آستاں سے دُور نہیں ۔۔۔ اس کی تقدیر میں حضور نہیں
دل بینا بھی کر خدا سے طلب ۔۔۔ آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نُور ۔۔۔ چراغ راہ ہے منزل نہیں ہے
خرد سے راہرو روشن بصر ہے ۔۔۔ خرد کیا ہے چراغ رہ گزر ہے
درونِ خانہ ہنگامے ہیں کیا کیا ۔۔۔ چراغ رہگزر کو کیا خبر ہے

برگساں مسلسل انقلاب اور تغیر کو ذاتِ نفس کا عین کمال سمجھتا ہے لیکن اقبال اُس سے آگے بڑھ کر سوچتے ہیں کہ مسلسل انقلاب ذاتِ نفس کا آئینہ دار ضرور ہے مگر اس کا اصل مقصد کیا ہے؟ اور اگر یہ مقصد خارجی ہے تو ذاتِ نفس لاتغیر، آزاد اور خود مختار نہ رہے گی۔ ان کے خیال میں ذاتِ نفس مسلسل تغیر اور انقلابِ احوال کے ذریعے ''خودی'' کی پرورش اور تکمیل میں مصروف ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے ۔۔۔ خودی کیا ہے؟ تلوار کی دھار ہے

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات

اقبال کے فلسفۂ خودی نے انہیں برگساں کے نتائج سے بہت آگے پہنچا دیا۔ اگرچہ برگساں کے نزدیک زورِ زندگی(Elan Vital) غایت حقیقت ضرور ہے لیکن کسی مخصوص مقصود کے حصول کے درپے نہیں ہے۔ جب کہ اقبال کے نزدیک یہ زورِ زندگی جو کائنات میں مختلف صورتوں اور حالتوں میں نظر آتا ہے حقیقت تک رسائی کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں:

''قرآن کے نزدیک حقیقت اولیٰ روحانی ہے لیکن اس کی زندگی دنیاوی سرگرمیوں سے آشکار ہوتی ہے۔ روح کو مواقع حاصل ہوتے ہیں تو انہیں فطری، مادی اور دنیاوی اشیاء میں مادّے کی تمام تر وسعت روح کے لیے حصول ذات کے مواقع پیدا کرتی ہے۔''

اقبال حقیقت کو دوران محض تصور کرتے ہیں جس میں زندگی اور اس کے مقاصد یوں گھل مل جاتے ہیں کہ ان سے ایک نامی وحدت وجود میں آتی ہے۔ یہ بھی ایک حیاتی تشویق کی مانند ہے جو پیہم تبدیل ہوتی رہتی ہے اور ترقی تخلیق کی راہیں تخلیق کرتی ہے۔ مگر وہ ایک قدم آگے بڑھ کر حقیقت کو ذات قرار دیتے ہیں۔ ایک ایسی ذات جو ہمہ گیر ہے۔ محسوس وموجود ہے اور ہر انفرادی زندگی اور خیال کا سرچشمہ ہے۔ وہ بے مقصد اور نابینا نہیں بلکہ عقلی مقام کا حامل ارادہ ہے۔ جس کی تخلیقی فعالیت بے پایاں ہے۔ اقبال اس حقیقت کو ''ایغو'' قرار دیتے ہیں۔ حقیقت اولیٰ کو ایغو قرار دینے سے یہ مراد نہیں کہ ہم خدا کو انسانی تصویر کے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ اقبال فرماتے ہیں:

''وجدان زندگی کو مرتکز ایغو کی حیثیت سے منکشف کرتا ہے یہ تو محض زندگی کی ایک سیدھی سادی واقعی شے کو تسلیم کرنا ہے کہ زندگی ایک سیال بے صورت شے نہیں بلکہ وحدت کا اصول ناظمہ ہے۔ ایک تالیفی فعالیت ہے کہ عضویات نامی کی مائل بہ انتشار طبائع کو یکجا کر دیتی ہے تا کہ اس سے کوئی تعمیری کام لے سکے۔ حقیقت کہ معقول طور پر کار فرما ہے روحانی ہے اور تخلیقی ایغو ہے صرف ماورائے کائنات ہی نہیں بلکہ محیط کائنات بھی ہے وہ کائنات اور انسان سے ہمکنار ہونے کے باوصف ان سے بہت بالا ہے۔ وہ خالصتاً ارسطو کے ماورائی خدا کی مانند بھی نہیں جو حیات کے سارے کے سارے ارتقائی عمل سے باہر ہے۔ اور اس کے نشیب وفراز سے

اُسے کوئی تعلق اور دلچسپی نہیں اسکے برعکس قرآن اسے انسان کی شہ رگ سے نزدیک قرار دیتا ہے۔ اگر یہ قربت مکانی نہیں۔ وہ اُن سے محبت کرتا ہے جو اُسے چاہتے ہیں اور اُن کی صدا سنتا ہے جو اُسے پکارتے ہیں۔ وَقَالَ ربُکُمْ ادْعُونِی اَستجِب لَکُمره (سورۂ مومن)

مختصر طور پر حقیقت کے بارے میں اقبال کا نقطۂ نظر قرآن کی ان آیات سے بھی بخوبی بیان کیا جاسکتا ہے۔ ھوالاول و لآخر و لظاھر و الباطن سارے کا سارا ارتقا اسی ایک وحدت سے شروع ہوا۔ جس نے اپنے آپ کو کثرت میں تبدیل کر لیا۔ اور آخر کار ارتقاء اس منزل پر پہنچ جائے گا۔ جہاں سے اس کا آغاز ہوا تھا۔ وَاَنَّ اِلیٰ رَبِّکَ الْمُنتَھیٰ ہ

اقبال فرماتے ہیں

اسرار ازل جوئی برخود نظرے واکن ‏ ‏ یکتائی و بسیاری پنہانی و پیدائی

یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر ‏ ‏ مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر

یہ عالم یہ بتخانۂ شش جہات ‏ ‏ اسی نے تراشے ہیں یہ سومنات

وہی اک حُسن ہے لیکن نظر آتا ہے ہر شے میں ‏ ‏ یہ شیریں بھی ہے گویا بےستوں بھی کوہکن بھی ہے

☆ زندگی جزو کی ہے کُل میں فنا ہو جانا ‏ ‏ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

اقبال کے خیال میں حقیقت کی مکمل تجلی حاصل کرنے کے لیے حسی ادراک کی توسیع اس ادراک سے کی جانی چاہیے جسے قرآن ''فواد'' یا ''قلب'' کہتا ہے۔ قلب ایک قسم کا داخلی وجدان یا کشف ہے۔ جو رومی کے دل پذیر الفاظ میں:

''آفتاب کی شعاعوں سے نمو پاتا ہے اور ہمیں حقیقت کے ان پہلوؤں سے ہم کنار کرتا ہے۔ جن تک

☆ عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ‏ ‏ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ‏ ‏ (غالب)

حسی ادراک کی رسائی نہیں۔ قران کی رُو سے یہ ''بصیر'' ہے اور اس کی خبریں بشرطیکہ اُن کی صحیح تفسیر کی جائے غلط نہیں ہوتیں۔ (خطبات)

اقبال قرآن حکیم پر تدبرِ عمیق کے بعد اس نظریے پر پہنچتے ہیں کہ حقیقت کی فطرت مطلقہً روحانی ہے۔ اور یہ کہ اسے لازمی طور پر ایک انا کی حیثیت میں تصوّر کرنا چاہیے۔ مگر مذہب کے عزائم فلسفے کے عزائم سے بلند ہوتے ہیں۔ فلسفہ اشیاء کے بارے میں عقلی نقطۂ نظر ہے اور وہ تجربے کی کثریت کو ایک تنظیم میں نہیں لاسکتا اور اُسے قدرے فاصلے سے دیکھتا ہے۔ یہ کائنات اپنی تمام تر تفصیل میں مادّی جوہر کی میکانکی حرکت سے لے کر انسانی انا میں فکر کی آزادانہ حرکت تک ایک عظیم اور برتر انا کا انکشاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قران مجید انائے مطلق کو انسان کی شہ رگ سے بھی قریب قرار دیتا ہے۔

زمان ومکاں کی بحث فلسفہ اور الہیات کے لیے نئی چیز نہیں خصوصاً اسلامی مفکرین کے لیے ہمیشہ سے دلچسپی کا باعث رہی ہے۔ قران حکیم کے مطابق اختلاف لیل ونہار میں خدائے عزّ وجل کی نشانیاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ حدیث شریف میں دہر (زمان) کو ذات الٰہی کا مترادف قرار دیا گیا ہے۔ ارسطو سے لے کر برگساں تک اقبال نے تمام فلاسفۂ مغرب کا مطالعہ کیا۔ لیکن قران حکیم پر فلسفیانہ تدبر کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا وہ مندرجہ ذیل اشعار سے ظاہر ہے۔

تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا زُنارّی برگساں نہ ہوتا
ہیگل کا صدف گہر سے خالی ہے اس کا طلسم سب خیالی

اقبال کے نزدیک 'خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں'۔ جب کہ انسانیت کے دُکھ درد کا علاج عشق الٰہی، اور عشقِ رسولؐ ہے۔ انسان کو رازِ کائنات پانے کے لیے مذہب کو رہنما بنانا ہوگا۔ مذہب اور فلسفہ دونوں انسانی روح کی فلاح کے دعوے دار ہیں لیکن فلسفے کا رہنما ستارۂ عقل واستدلال ہے۔ جو محدود قدرت و قوت کے باعث روحانی دنیا تک رسائی نہیں رکھتا جب کہ مذہب ایک مثبت سائنس ہے جس کا مقصد انسان کے دل کو روحانیت سے لبریز کرتا ہے۔ عشق وجدان ہی وہ واحد راستہ ہے۔ جو انسان کے کل سوالوں کا شافی

جواب دے سکتا ہے۔اسی لیے اقبال فرماتے ہیں۔

علاج آتشِ رومی کے سوز میں ہے ترا　　تری خرد پہ ہے غالب فرنگیوں کا فسوں

مقام عقل سے آساں گزر گیا اقبال　　مقام شوق میں کھویا گیا وہ فرزانہ

چنانچہ اپنے لیے دُعا فرماتے ہیں:

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں　　مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

کتابیات

۱　اقبالیات کے نقوش　ڈاکٹر سلیم اختر

۲　کلیات اقبال

۳　تجدید فکریات اسلام　انگریزی خطبات کا اردو ترجمہ

۴　فلسفۂ اقبال مرتبہ بزم اقبال۔لاہور

۵　اقبالیات کے سو سال۔اکادمی ادبیات پاکستان مرتبہ ڈاکٹر رفیع الدین۔محمد سہیل عمر۔ ڈاکٹر وحید عشرت

۶　اقبال کا انسانِ کامل۔ڈاکٹر غلام عمر

۷　فکر اقبال کا تعارف۔لوس کلوڈ میتج ترجمہ۔ڈاکٹر سلیم اختر

۸　اقبال نئی تشکیل۔عزیز احمد

۹　اقبال اور بعض دوسرے شاعر۔خواجہ منظور حسین

۱۰　Creative Evolution pages 39,40,66,54,278,135

۱۱　Lectures pages.53,52,60,61,155,50,109,181

۱۲　گلشنِ راز جدید۔علامہ اقبال

۱۳　اسرار خودی۔علامہ اقبال

ڈاکٹر مظہر حامد

اقبال کی متصوفانہ فکر

اقبال کے ہاں شاعری میں مختلف معیار ملتے ہیں۔ ان میں سے ایک متصوفانہ فکر اور نعتیہ شاعری بھی ہے۔ ان کی شاعری میں جو وسعت اور آفاقیت دیکھنے میں آتی ہے۔ وہ کسی اور شاعر کے ہاں نہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کے زوال کو ایمانی کمزوری سے تعبیر کیا ہے۔ یہی ایک ایسا مرض تھا جس سے پوری ملّت اسلامیہ پارہ پارہ اور رُو بہ زوال ہو گئی تھی۔ علامہ اقبال نے اس مرض کا علاج اور تشخیص پیش کی اور اپنے پیغام میں بارہا اس بات پر زور دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور پیروی کر کے ہی اپنا کھویا ہوا وقار اور عزت وعظمت حاصل کر سکتے ہیں۔ مسلمان جب اغیار کی تہذیب کو اپنانے لگے، اپنے مذہب سے بے پروا ہو گئے تو اقبال نے ''جواب شکوہ'' میں مسلمانوں کی حالت کو جو نقشہ کھینچا ہے ملاحظہ کیجئے۔

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختارؐ ؟ — مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار؟
کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعار اغیار؟ — ہو گئی کس کی نگہ طرز سلف سے بیزار؟
قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں — کچھ بھی پیغام محمدؐ کا تمھیں پاس نہیں

مسلمانوں کو دعوت فکر دیتے ہوئے اقبال کہتے ہیں کہ اب بھی وقت ہے اپنی اصلاح کی فکر کرلو، ورنہ دنیا سے مسلمان کا نام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ عشق رسولؐ اور اتباع رسولؐ کر کے ہی آخرت کی کامیابی حاصل کر سکتے ہیں۔

کسی یک جائی سے اب عہد غلامی کرلو — ملتِ احمدؐ مرسل کو مقامی کر لو

اقبال کے ہاں عشق ایک طاقت بن کر اُبھرا ہے فرماتے ہیں:

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے　　　دہر میں اسم محمدؐ سے اُجالا کر دے

اقبال سراپا عشق رسولؐ سے سرشار تھے۔ اگر کوئی ان کے سامنے حضورؐ کا نام لے لیتا تو آپ تڑپ جاتے تھے۔ سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت کرتے ہوئے اشکبار ہو جاتے اور پھر یہ ارشاد کرتے:

وہ دانائے سُبلؐ ختم الرسل مولائے کُل جس نے　　　غبار راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا !

نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر　　　وہی قرآں، وہی فرقاں، وہی یٰسیں وہی طٰحٰہ

ملت اسلامیہ کی بربادی اور زبوں حالی پر اقبال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کرتے ہیں:

شیرازہ ہوا ملت مرحوم کا ابتر　　　اب تُو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے

اس راز کو اب فاش کر اے روح محمدؐ　　　آیاتِ الٰہی کا نگہبان کدھر جائے

اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی بے بضاعتی اور زبوں حالی کا علاج صرف عشق رسولؐ اور اُسوۂ حسنہ پر چلنے میں ہے۔ اقبال نے جو تعلیم و تبلیغ کی ہے اس میں حضور اکرمؐ کی سیرت طیبہ اور مکارم اخلاق کو بڑا دخل ہے۔ وہ حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ سے انسانی زندگی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ حضورؐ قیامت تک کے لیے نمونہ اور رحمت بن کر آئے ہیں۔ اقبال نے اپنی شاعری میں اخلاقی اور روحانی قدروں کا خیال رکھا ہے۔ ان کا نعتیہ کلام ان خوبیوں کا حامل ہے۔ جس میں نعت رسولؐ کا یہ طریقہ جس میں حکمت آفرینی کی مثالیں عشق و مستی کی صورت میں پائی جاتی ہیں،

یہاں تک اقبال کی نعتیہ شاعری کا ذکر تھا، اب ان کی متصوفانہ فکر کو شاعری میں دیکھیں گے کہ اقبال کا نظریہ تصوف کیا ہے۔؟ دراصل اسلامی تصوف میں جب دیگر فلسفیوں کے نظریات شامل ہو گئے تو اس عمل سے تصوف کی روح مجروح ہو گئی۔ موجودہ دور میں تصوف کی ہئیت ہی بدل

گئی ہے۔ خانقاہوں کے صوفی حضرات صحیح معنی میں تصوف کی حقیقی روح سے واقف ہی نہیں تھے۔
تصوف ایک نظریہ ہے، تعلیم ہے اور اس میں اصلاح کے ہزار پہلو ہیں، اس میں توحید و طریقت کے معاملات زیر بحث لائے گئے ہیں۔ اقبال کے متعلق یہ کہنا کہ وہ تصوف کے خلاف تھے کسی بھی لحاظ سے درست نہیں۔ وہ لوگ غلطی پر ہیں در حقیقت اقبال کے نظریات کا صحیح معنی میں مطالعہ نہیں کیا گیا۔ وہ تصوف میں غیر اسلامی نظریات کو برداشت نہیں کرتے۔ وہ عجمی اثرات سے تصوف کو پاک کرنا چاہتے ہیں اس لیے وہ اپنے نظریۂ تصوف میں عمل پر زور دیتے ہیں:

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیّری — کہ فقر خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

اسلامی ممالک میں جو نظریہ کام کر رہا تھا، تصوف میں توحید یا وحدت الوجود کا مسئلہ تھا۔ اس نظریے نے غلط طریقے پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں میں سُستی، کاہلی اور جہد و عمل سے گریز کو اُبھارا، مسلمان جب اس راہ پر چل نکلے تو ان میں غفلت، اپنی ہستی کا ادراک نہ کرنا، بے مقصد زندگی بسر کرنا۔ محی الدین ابن عربیؒ نے اپنی کتاب ''فصوص الحکم'' میں وحدت الوجود پر جو بحث کی ہے، اس کی فضیلت سے انکار نہیں، انہوں نے احسن نکات واضح کیے ہیں۔ دراصل اقبال نفی خودی کے خلاف تھے ان کا نظریۂ اثبات خودی ہے۔ طویل بحث سے گریز کرتے ہوئے اقبال کے وہ اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کا تصوف کا نظریہ واضح ہوتا ہے۔ بلکہ ایک تعلیمی اور تبلیغی مشن تھا جسے انہوں نے احسن طریقہ سے ادا کیا۔ گو کہ ان کی مخالفت بہت ہوئی، لیکن ثابت قدم رہے، اقبال موجودہ صوفیاء کی توجہ ان بزرگان دین کی طرف مبذول کراتے ہیں جن کا ذکر داتا گنج بخش سید علی ہجویریؒ نے اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں کیا ہے اقبال کے دو شعر ملاحظہ کیجئے:

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد — محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا — یہ سالک مقامات میں کھو گیا

اقبال ایسے صوفیائے کرام کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو آستینوں میں شمس و قمر چھپائے بیٹھے ہیں:

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو ید بیضا لیے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں

اقبال کے پیام میں خودی پر جو زور ملتا ہے اس میں ذات کا عرفان و آگہی بھی ہے اور خدا آگہی کا ادراک بھی۔ اقبال جب اپنی قوم کی حالت زار پر نظر ڈالتے ہیں تو انہیں یہ غم اور افسوس ہوتا ہے کہ یہ قوم فرسودہ طریقوں پر کیسے گامزن ہوگئی۔ اس قوم کے پاس تو باقاعدہ ایک ضابطۂ حیات ہے۔۔ پھر یہ زوال پذیر کیسے ہوئی۔ انہوں نے تصوف کا صحیح ادراک دیا، انہوں نے اس خانقاہی نظام کی مخالفت کی اور نام نہاد صوفیوں پر اور ان کے طریقوں پر کاری ضرب لگائی۔ اپنی قوم کی حالت بہتر بنانے میں اہم کردار ادا کیا اور متصوفانہ فکر کو از سر نو فروغ دینے میں مصروف عمل ہو گئے۔

حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی

اقبال نے مسلمانوں، خاص کر نوجوانوں کو فکر و عمل کی تعلیم دی، اسی ایک عمل سے ملت کے رُخ پر شباب آگیا:

ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ذوق انقلاب ندرت فکر و عمل کیا شے ہے؟ ملت کا شباب

ندرت فکر و عمل سے معجزات زندگی ندرت فکر و عمل سے سنگ خارہ لعلِ ناب

مُلّا اور فقیہہ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں، جن کے قلب عشق سے محروم ہیں:

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملّا نہ فقیہہ وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

قوم کیا چیز ہے، قوموں کی امامت کیا ہے اس کو کیا سمجھیں یہ بے چارے دو رکعت کے امام

اقبال نے ''ضربِ کلیم'' میں دلِ مردہ کی بات کی ہے، اگر دل مردہ ہے تو پھر یہ دل نہیں، اسے دوبارہ زندہ کرنے کی تدبیر کرنا چاہیے۔ اپنی خودی کو اس انداز سے صیقل کرے کہ پھر اس پر غبار نہ آسکے۔

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ — کہ یہی ہے امتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اقبال مرض کی تشخیص بھی کرتے ہیں اور علاج بھی، ان کے نزدیک اس مرض کی دوا ''خودی'' ہے:

خودی وہ بحر ہے جس کا کوئی کنارہ نہیں — تُو آبِ جُو اسے سمجھا اگر تو چارہ نہیں

غرض اقبال نے عرفانِ خودی اور تعمیرِ خودی پر سب سے زیادہ زور دیا ہے، یہی ان کی متصوفانہ فکر ہے اور یہی ان کا نصب العین ہے تصوف کا مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتا جب تک کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت اور ان کی تعلیمات کی مکمل پیروی میں نہ آ جائیں۔ اتباعِ رسولؐ ہی سے ہم دنیاوی مصائب اور آلام سے چھٹکارا حاصل کر سکتے ہیں۔ آپؐ کے اخلاق اور اوصافِ حمیدہ نے یہ ثابت کر دکھایا کہ انسان کو زندگی کیسے گزارنا چاہیے۔

علامہ اقبال نے جب اپنی قوم کو پستی میں ذلیل و خوار ہوتے دیکھا تو ان سے رہا نہ گیا۔ معاً دل میں خیال آیا کہ اس قوم کو بیدار کرنا چاہیے۔ اس لیے انہوں نے قرآن اور اس کی روح کو موجودہ مسلمانوں کی حالت کے پیشِ نظر روشنی بہم پہنچائی اور مولانا جلال الدین رومیؒ کی مثنویِ معنوی سے کسبِ فیض کیا، اس مُردہ قوم کو جگانے کا بیڑا اٹھایا۔ اس طرح اقبال نے مثنوی اور قرآن سے روشنی حاصل کی اور اپنی مثنوی ''اسرارِ خودی'' کی بنیاد رکھی کیونکہ مسلمان روحانی اور اخلاقی او سیاسی اعتبار سے اپنا وقار کھو چکے تھے۔ اس بات کی تائید ان اشعار سے ہو جاتی ہے:

تجھے آبا سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی — کہ تُو گفتار، وہ کردار، تُو ثابت، وہ سیارہ

گنوادی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا

اقبال نے اپنے اشعار میں مسلمانوں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ ان کی حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ قوم کی پستی اور ان کی تذلیل کو اپنی شاعری میں موضوع بحث بنایا۔ اور مسلمانوں کو مسلمانوں کی تاریخ، مذہب اور اخلاقیات کے وہ نمونے پیش کیے، جن سے مسلمان سرخرو تھے۔ آج کا مسلمان زمانے بھر میں رُسوا ہی رُسوا ہے۔

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تُو ہوا

اس رُسوائی کے پیش نظر اقبال نے اپنے افکار اور نظریات کو اشعار کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنے کی جو سعی کی تھی اس میں ''اسرار خودی'' اور ''رموز بیخودی'' اہمیت کی حامل ہیں۔ اقبال نے مسلمانوں کو عجمی تصوف کے مضر اثرات سے بچانے کی بھرپور کوشش کی۔ عجمی تصوف غیر اسلامی فکر کا وہ نتیجہ ہے جس سے مسلمانوں میں سعی و عمل میں کوتاہی سے کام لیا جانے لگا اور لوگ ذوق عمل سے دور ہوتے گئے۔ اقبال نے عمیق مطالعہ کی روشنی میں یہ بات واضح طور پر ظاہر کر دی کہ ویدانتی، نوفلاطونیت اور غیر اسلامی تصوف قرآن کے بالکل برعکس ہے۔ اقبال تصوف کے خلاف نہیں بلکہ نظریہ کے خلاف ہیں۔ کیونکہ وہ غیر اسلامی تحریک کی مخالفت کرتے ہیں۔ اپنے ایک خط میں اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''میں اگر مخالف ہوں تو صرف ایک گروہ کا جس نے محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر بیعت لے کر دانستہ یا نادانستہ ایسے مسائل کی تعلیم دی ہے جو مذہب اسلام سے تعلق نہیں رکھتے۔ حضرات صوفیہ میں جو گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر قائم ہے اور سیرتِ صدیقی کو اپنے سامنے رکھتا ہے میں اس گروہ کی خاک پا ہوں اور ان کی محبت کو سعادت دارین کا باعث تصور کرتا ہوں۔''

یہ اقتباس اقبال کے نظریہ کو واضح کر رہا ہے۔ انہوں نے ''اسراری خودی'' اور ''رموز

بیخودی'' لکھ کر مسلمانوں کو اثبات خودی کی تلقین کی اور مسلمانوں میں عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا جذبہ پیدا کیا۔ عشق رسولؐ کی افادیت میں اقبال کا نظریہ یہ تھا کہ انسان روحانی طور پر اس قدر طاقتور ہو جاتا ہے جیسے صحابہ کرامؓ کی طرز زندگی جو مکمل پیروی اور اطاعت میں نظر آتی ہے۔ اقبال نے ریاست اسلام کی بنیاد توحید اور حیات عقلی پر رکھی ہے، اس اصول کے پیش نظر مسلمانوں کی کامیابی یقینی ہے۔

اقبال نے اپنی نظم اور نثر میں قرآنی آیات سے کام لے کر بھی اسلام کی سربلندی اور صحیح اسلامی طریق کو واضح کیا ہے، یہی ان کا مشن تھا اور یہی ان کا مقصود۔ اقبال کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ذہن مشرقی اور دل عربی تھا تو بے جا نہ ہوگا۔ ان کی قلبی کیفیت کا رُخ حجاز کی طرف تھا اور ذہن مسلمانوں کی حالت زار کی طرف، ایک دردمند دل کے ساتھ فکر کرنا اور اس کا حل تلاش کرنا اور پھر قرآنی تعلیمات سے ثابت کرنا یہ اقبال کا فکری اجتہاد ہی تھا۔ انہوں نے اسلام کو اسلام کی روشنی میں پیش کیا۔ مملکت اسلامیہ اقبال کی ممنون احسان ہے۔

خورشید جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں　　　آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

اقبال کے نزدیک دین اسلام کا پہلو اصول توحید ہے اللہ رب العزت واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں، اس اصول سے تمام نظریات باطل ہو جاتے ہیں، عبادت صرف اللہ کے لیے ہے اور اطاعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے۔ جو شخص اس اُصول پر کاربند رہے گا، وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول اور فعل سے یہ ثابت کر دیا کہ دین اسلام ہی وہ واحد مذہب ہے جو قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کرتا رہے گا۔ اقبال اس اصول اور نظریے پر عمل پیرا ہوتے ہوئے دعوت فکر دیتے ہیں کہ دنیا و آخرت میں سرخرو ہونا چاہتے ہو تو پھر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور اتباع لازمی ہے۔ یہی نجات کا راستہ ہے۔

علامہ اقبال کے نزدیک ایرانی تصوف اور ایرانی شاعری نے تصوف کے رجحان اور اسلامی زندگی پر اپنے اثرات مرتسم کیے ہیں۔ وہ ہماری اسلامی اور قومی فکر سے مماثلت نہیں رکھتے۔ دین

اسلام کا ان نظریات اور رجحانات سے کوئی تعلق نہیں۔ اقبال نے صوفیوں کے خیالات کو قرآن اور حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام جہد و عمل، ذوق عمل، غور و فکر اور تحقیق کی دعوت دیتا ہے جب کہ اہل تصوف کی تعلیم اس کے برعکس ہے۔ ایرانی شاعری میں بہت سے مضامین قلمبند ہوئے جس سے قوم کے اندر سستی، کاہلی، غلامی اور پست ہمتی جیسی بیماریاں لاحق ہو گئیں۔ مثلاً صوفیوں کے نظریات میں مرجاؤ، مرنے سے پہلے اقبال کہتے ہیں کہ ہرگز نہ مرو۔ صوفیوں کے نزدیک تگ و دو فضول ہے اللہ پر بھروسہ کیے بیٹھے رہو، اقبال کا یہ کہنا ہے کہ جہد مسلسل میں رہو، کوشش کرتے رہو۔

اقبال نے پہلے ہی اس بات کی وضاحت کر دی تھی کہ تحریک تصوف پر جامع تاریخ لکھوں گا۔ ان کے نزدیک تصوف پر حملہ کرنا نہیں بلکہ تصوف کی صحیح آگاہی مقصود تھی۔ اسلامی اور غیر اسلامی نکات کی نشاندہی تجزیہ کے بغیر ممکن نہیں۔ اقبال یورپ جانے سے پہلے وحدت الوجود کے قائل تھے۔ اقبال کی تربیت ان کے والد شیخ نور محمدؒ نے کی تھی۔ والد صوفی بزرگ تھے اقبال کی تربیت جس ماحول میں ہوئی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ذہن مذہب سے کس قدر قریب ہوتا گیا۔ ان کی فکر میں اخلاقی قدریں اور روحانیت دل و دماغ میں جاگزیں ہو گئیں۔ اقبال نے جن امور پر تنقید کی بنیاد رکھی ہے وہ خالصاً اسلامی نقطۂ نظر ہے ''تنزلات ستۂ افلاطونیت جدیدہ''۔ یہ پلاٹائنس کے افکار و خیالات کا عربی ترجمہ ہے۔ ان خیالات کی ترویج سے مسلمان اسلامی فلسفہ کے اندر داخل ہوا۔ صوفیائے کرام نے ان نظریات کو اسلامی رنگ میں پیش کیا۔ وحدت الوجود اسی کا حصہ ہے۔ اقبال کی تنقید نظریے پر ہے نہ کہ شخصیت پر۔ وہ تصوف کو دل و جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں۔

اسلامی احیاء اور تصوف میں ''مکتوبات امام ربّانی'' کی اہمیت مسلّم ہے اسلامی فکر جس میں متصوفانہ اور سیاسی افکار کی روشنی میں جدید اسلامی تصوف کی داغ بیل ڈالی۔ تصوف کا حقیقی روپ جو دھندلا گیا تھا اس کی اصطلاحوں سے واضح ہو گیا۔ اقبال کی تصنیف ''تشکیل جدید الہیات

اسلامیہ'' ان دو کتابوں کی وہ کڑی ہے جسے اسلامی فکر کی تاریخ میں وہ مقام ملا ہے جس کے پڑھنے سے لوگوں کے دلوں میں دین سے محبت اور معاشرتی اصلاح کا خیال ذہن میں کروٹ لینے لگا۔

سید سلیمان ندویؒ نے اقبال کے افکار و خیالات کو انہی کی کتابوں سے اُجاگر کیا ہے۔ ان کا یہ اقتباس تاریخی دستاویز ہے، انہوں نے اقبال شناسی کا صحیح طور پر حق ادا کیا ہے۔ ان کے کارناموں اور کوششوں کو سراہا ہے۔ معارف، مئی ۱۹۳۸ء میں تحریر فرماتے ہیں:

''وہ ہندوستان کی آبرو، مشرق کی عزت اور اسلام کا فخر تھا آج دنیا ان ساری عزتوں سے محروم ہوگئی اور ایسا عارف فلسفی، عاشق رسولؐ شاعر، فلسفۂ اسلام کا ترجمان اور کاروان ملت کا حدی خواں صدیوں کے بعد پیدا ہوا تھا اور شاید صدیوں کے بعد پیدا ہوا اور اس کے ذہن کا ہر ترانہ ''بانگ درا''، اس کی جان حزیں کی ہر آواز ''زبور عجم'' اور اس کے دل کی ہر فریاد ''پیام مشرق'' اس کے شعر کا ہر پرواز ''بال جبریل'' تھا۔ اس کی فانی عمر گو ختم ہوگئی لیکن اس کی زندگی کا ہر کارنامہ ''جاوید نامہ'' بن کر انشاء اللہ باقی رہے گا۔''

یہ وہ اعتراف ہے جس کے ہر لفظ سے عقیدت ٹپک رہی ہے۔ اسلامی تصوف کے بارے میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو حضرات اپنے ذاتی فکر و تدبر سے منتہا پر پہنچے، تزکیہ نفس سے باطن پر جو تجلیات ظہور پذیر ہوئیں انہیں واردات قلبی کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے روحانی تجربوں کا ہونا ضروری ہے، روحانیت کی شرط اوّل مومن ہونا لازمی ہے۔ اسی لیے اقبال نے دل کو مرکزی حیثیت دی ہے۔ دل ایک ایسا سرچشمہ ہے جس میں انسان اپنی خودی کا ادراک کرتا ہے۔ یہی خودی ایک قوّت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے نظریۂ خودی کو پیش کر کے اس بات پر زور دیا ہے کہ اے انسان! تیری خودی تجھ پر آشکار ہو جائے اور تُو شر اور خیر میں تمیز کر سکے۔ اقبال کے ہاں خودی کا استحکام اور ذوق عمل پر جو تلقین ہمیں ملتی ہے اس پیغام میں اللہ رب العزت کی وحدانیت اور سرشاری عشقِ رسولؐ پر ایمان رکھنا یہی زندگی کی روحانی بنیاد ہے اور یہی اقبال کی متصوفانہ فکر کی روح ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

محسن بھوپالی

قدح قدح تری یادیں، سبُو سبُو تیرا غم

محسن بھوپالی (عبدالرحمٰن) ---- علم وادب کا وہ آفتاب جہانتاب جو ۲۹ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بھوپال سے طلوع ہوا، ۱۶ جنوری ۲۰۰۷ء کو کراچی میں غروب ہو کر عدم کی بے کراں وادیوں میں اوجھل ہو گیا۔ محسن بھوپالی کے ساتھ میرے تعلقات گزشتہ تیس برسوں پر محیط تھے۔ ان کی وفات میرے لیے کس قدر جان لیوا غم ہے، اس کا اندازہ صرف میں ہی کر سکتا ہوں۔ وہ میرے مونس، غم خوار اور محسن تھے۔ ان کی وفات نے مجھے جانگسل تنہائیوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔ ایک ایسے درد نے مجھے گرفت میں لے لیا ہے جو لادوا ہے۔ میری نوجوان بیٹی کی رحلت کا دکھ اتنا قیامت کا تھا کہ سب لوگ فرطِ غم سے نڈھال تھے۔ محسن بھوپالی نے اپنے مکتوب میں ہمیں دلاسا دیتے ہوئے لکھا:

"آپ کی صاحب زادی کی مفارقت کے غم سے دل بھر آیا۔ صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں --- آپ مایوس اور دل برداشتہ ہرگز نہ ہوں۔ لاتقنطو من رحمتہ اللہ کا ورد اکثر کیجئے اور اس ایقان کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ بہتر حالات پیدا کرنے والا ہے۔ اس نے ہی ہمیں پیدا کیا ہے اور وہی ہماری خبر گیری کرتا ہے۔"

آج سے سولہ برس پہلے گلاسکو (اسکاٹ لینڈ) میں جب میرے گلے کا آپریشن ہوا تھا تو میں بہت فکر مند رہنے لگا تھا کبھی کبھی مایوسی حد سے بڑھ جاتی تھی ایسے میں میرے ذہن میں اچانک ایک خیال آیا کہ جس کی میں تخلیق ہوں آخر وہ بھی تو میرے بارے میں سوچتا ہو گا چنانچہ فوراً اس مضمون کا شعر ہو گیا۔

جس نے زندگی دی ہے وہ بھی سوچتا ہوگا　　　زندگی کے بارے میں اس قدر نہ سوچا کر

میں اکثر یہ شعر دہراتا رہا اور خدا کا شکر ہے کہ اس پاک پروردگار نے مجھے شفائے کاملہ عطا فرمائی۔

''سردیاں بڑھ رہی ہیں چنانچہ سانس کی تکلیف بھی بڑھنے لگی ہے بائیں آنکھ کا آپریشن کامیاب نہیں رہا۔ اس کی بینائی بھی کم ہوتی جا رہی ہے لیکن میں راضی بہ رضا ہوں''

محسن بھوپالی کا یہ خط خاندان کے تمام افراد نے متعدد بار پڑھا۔ جس خلوص، اپنائیت، دردمندی اور انسانی ہمدردی سے سرشار ہو کر انھوں نے ہمیں مخاطب کیا اس کے معجز نما اثر سے ہم لوگ قدرے سنبھل گئے۔ میں خط کا جواب نہ لکھ سکا۔ انھوں نے ٹیلی فون پر بھی ہم سب کو حوصلے اور صبر کی تلقین کی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور خط بھی لکھا جس مین ہماری صحت اور صبر کی بات کی گئی تھی۔ خط میں وہ دعائیں اکثر کرتے تھے۔ ایک جملہ وہ ضرور لکھا کرتے تھے:

''اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ و اماں میں رکھے''

محسن بھوپالی کے خطوط کا ہم سب کو شدت سے انتظار رہتا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے ان کے خطوط میرے لیے چراغ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اب سوچتا ہوں مہیب سناٹوں اور سفاک ظلمتوں میں کون سہارا دے گا۔ اب دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے۔ محسن بھوپالی نے آخری خط مجھے ۵ جنوری ۲۰۰۷ء کو لکھا۔ گھر میں وہ خط ۸ جنوری ۲۰۰۷ء کو موصول ہوا۔ میں ان دنوں عارضہ قلب کے باعث زیر علاج تھا۔ میں ملتان گیا ہوا تھا۔ ۱۲ جنوری سے ہی مجھے پریشانیوں نے گھیر لیا۔ مجھے ایسا لگا کہ کسی نے میرا ایک حصہ کاٹنے کی کوشش کی ہو۔ میں نے اپنے معالج سے اس تکلیف کا ذکر کیا تو اس نے کوئی توجہ نہ کی۔ معمول کے طبی معائنے اور ادویات لینے کے بعد میں گھر واپس آگیا۔ یہ ۱۳ جنوری ۲۰۰۷ء کی بات ہے۔ محسن بھوپالی کا خط پڑھا۔ انھوں نے لکھا تھا:

''کئی دنوں سے رابطہ نہیں ہو سکا، اس لیے خط لکھ رہا ہوں۔ بائیں آنکھ کی بینائی خاصی کم ہو گئی ہے۔ پڑھنا لکھنا کم کرنا پڑا ہے۔ اپنا مجموعہ ''نظمانے'' اس توقع پر روانہ کر رہا ہوں کہ آپ ان نظمانوں

(منظوم افسانوں) پر میری خاطر مضمون ضرور تحریر فرمائیے گا۔ آپ کی تنقیدی نظر نثری اور شعری ادب پر یکساں طور پر قابل رشک ہے جواب ضرور دیجئے گا۔

والسلام

دعا گو اور طالب دعا

محسن بھوپالی

محسن بھوپالی کے اس خط نے مجھے حیرت زدہ کر دیا۔ تین باتیں خلافِ معمول تھیں پہلی بار انھوں نے مجھے مضمون لکھنے کے بارے میں کہا۔ میری تحریروں پر بھی انھوں نے پہلی مرتبہ اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ خط کے اختتام پر دعا گو لکھا کرتے تھے۔ اس بار انھوں نے طالب دعا کا اضافہ کر دیا۔ آج تک انھوں نے خط کے جواب پر اصرار کبھی نہیں کیا تھا۔ اس خط میں انھوں تاکید کی کہ جواب ضرور دوں۔ جہاں تک مضمون کا تعلق ہے تو میں کیا اور محسن بھوپالی پر میری تحریر کیا، لیکن حکم کی تعمیل فرض تھی اور وہ بھی جانے والے کے آخری حکم کی بات ہے۔ اب ان کی باتیں اور یادیں ہی رہ گئی ہیں۔ ان کے احسانات اس قدر ہیں کہ میری گردن ان کے بار سے خم رہے گی۔

محسن بھوپالی پر میں زیادہ لکھنے کا ارادہ رکھتا تھا مگر میری آنکھیں پُرنم ہیں اور ہاتھوں میں اتنی قوت نہیں کہ اس نابغۂ روزگار ادیب، جری تخلیق کار اور حریت فکر کے مجاہد کی علمی، ادبی اور قومی خدمات کا صحیح احاطہ کر سکوں۔ زندہ رہا تو ضرور لکھوں گا۔ (انشاءاللہ) محسن بھوپالی کے اس شعر کے ساتھ اجازت چاہوں گا۔

زیست ہمسائے سے مانگا ہوا زیور تو نہیں ایک دھڑکا سا لگا رہتا ہے کھو جانے کا

پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا

پروفیسر انیتا غلام علی

ہر رہ گزر پہ تیرے گزرنے کا حُسن ہے

پاکستان میں تانیثیت کی علم بردار ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر انیتا غلام علی نے ۸۔اگست ۲۰۱۴ کی شام عدم کے کوچ کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔کراچی میں ۱۹۳۵ میں جنم لینے والی اس نابغۂ روزگار خاتون کو اپنی تدریسی خدمات، علمی فضیلت، علم دوستی، ادب پروری، انسانی ہمدردی، حقوق نسواں کے لیے جدوجہد اور جذبۂ انسانیت نوازی کے اعجاز سے پوری دُنیا میں جو عزت، وقار، محبت اور پذیرائی نصیب ہوئی اس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں۔ کچھ دنوں سے وہ ساؤتھ سٹی ہسپتال کراچی میں واقع ایک نجی ہسپتال میں عارضۂ قلب کے باعث زیرِ علاج تھیں لیکن معالجوں کی کوئی اُمید بر نہ آئی اور اس بیماریٔ دل نے بالآخر پروفیسر انیتا غلام علی کی زندگی کی شمع بُجھا دی۔ وہ شمع فروزاں جس نے جہالت کی سفاک ظلمتوں کو کافور کیا، اذہان کی تطہیر و تنویر کا اہتمام کیا اور ستارۂ سحر کے مانند طلوعِ صبحِ بہاراں کی نوید سنائی اب ہماری بزم میں ضوفشاں نہیں رہی۔ان کی وفات سے جو خلا پیدا ہوا وہ کبھی پُر نہیں ہوسکتا۔ان کی رحلت ایک بہت بڑا قومی سانحہ ہے جس پر ہر آنکھ اشک بار اور ہر دل سوگوار ہے۔وہ تا بہ ابد اندھیروں کی دسترس سے دُور مثل آفتاب اُفقِ علم و ادب پر ضوفشاں رہیں گی۔ایسی عظیم اور نایاب شخصیات کسی بھی قوم اور ملک کا بیش بہا اثاثہ ہوتی ہیں، تاریخ ہر دور میں ان کی فقید المثال خدمات کی بنا پر اُن کے نام کی تعظیم کرے گی۔ایسی یگانۂ روزگار شخصیات رحلت کے بعد بھی اپنے قدر دانوں کی محفلوں میں موجود رہتی ہیں اور ان کی عظمت فکر کے موضوع پر گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔زندگی کا کوئی بھی عکس ہو ان کے خدوخال کی مسحور کُن دل کشی قلب و نظر کو مسخر کر لیتی ہے اور جہاں بھی علم و ادب کی کوئی محفل سجتی ہے اُن ہی کا ذکر تمام گفتگو پر حاوی رہتا

ہے۔ایام گزشتہ کی کتب کی ورق گردانی کرتے وقت پلٹ کر دیکھیں تو آئینۂ ایام میں جو حسین تصویر نظر آتی ہے اُس کے نمایاں پہلو قابل غور ہیں۔

آج سے نصف صدی پہلے کی بات ہے جب پاکستان میں ریڈیو کی نشریات میں ہر شخص گہری دلچسپی لیتا تھا۔ریڈیو سے انگریزی اور اُردو زبان میں نشر ہونے والی خبریں پُوری توجہ سے سُنی جاتی تھیں۔اُردو زبان میں انور بہزاد اور شکیل احمد جب کہ انگریزی زبان میں انیتا غلام علی کی آواز سے سامعین بہت مانوس تھے۔انیتا غلام علی کو انگریزی زبان کے درست تلفظ، ادائیگی اور زیرو بم پر جو بے پناہ دسترس حاصل تھی اس پر انگریزی کے اہلِ زبان بھی رشک کرتے تھے۔ریڈیو پاکستان کے عہدِ زریں کی اس یادگار آواز کی بازگشت آج بھی سنائی دیتی ہے:

This is Radio Pakistan. The news read by Anita Ghulam Ali

جب تک ریڈیو پاکستان کے کراچی سٹیشن سے خبریں نشر ہوتی تھیں انیتا غلام علی باقاعدگی سے انگریزی خبریں پڑھتی تھیں۔جب ریڈیو پاکستان نے خبریں پڑھنے کا شعبہ وفاقی دارالحکومت اسلام آباد میں منتقل کر دیا تو وہ اس سے وابستہ نہ رہیں۔حیف صد حیف فرشتۂ اجل کے ہاتھوں یہ بے خوف آواز ہمیشہ کے لیے چُپ ہوگئی۔بہ ظاہر یہ خاتون اپنی ذات میں سمٹی ہوئی تھی مگر اس اولوالعزم خاتون کے قلب اور روح میں سمندر کی سی بے کرانی تھی۔ایک تنوع اور بوقلمونی تھی جس نے ان کی شخصیت کو سدا بہار بنا دیا تھا۔انیتا غلام علی نے قسمت سے محروم پس ماندہ طبقے کی خواتین اور چائلڈ لیبر کی مسموم فضا میں کُملا جانے والی کلیوں اور شگوفوں کو گلشن ہستی میں رنگ خوشبو اور حسن و خوبی کے تمام استعاروں کا منبع قرار دیا اور ان کی زندگی کو نکھار اور رعنائی عطا کرنے کے لیے اپنی پوری زندگی وقف کر دی۔پاکستانی خواتین کے لیے ان کی شخصیت اور کردار ہمیشہ قابلِ فخر رہا۔انیتا غلام علی کی وفات کی خبر سُن کر دنیا بھر کی خواتین نے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ہے اب دنیا میں ایسی نادر و نایاب خاتون کہاں جسے انیتا غلام علی جیسا کہا جا سکے۔

کیا لوگ تھے جو راہِ جہاں سے گزر گئے　　جی چاہتا ہے نقشِ قدم چُومتے چلیں

انیتا غلام علی کا تعلق کراچی کے ایک معزز علمی و ادبی خاندان سے تھا۔ اُن کے والد جسٹس فیروز علی، نانا غلام علی سندھ ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ان کی والدہ شیریں نانا کراچی کی خواتین میں بہت مقبول تھیں اور ان کا شمار کراچی کی ممتاز سماجی کارکن خواتین میں ہوتا تھا۔ ان کے دادا نورالدین احمد غلام علی پاکستان کے نامور ماہر تعلیم اور منتظم تھے۔ وہ سندھ کے ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشنز کی حیثیت سے خدمات پر مامور تھے۔ انھوں نے سندھ میں فروغ تعلیم، تعلیمی انصرام اور منصوبہ بندی کے سلسلے میں جو گراں قدر خدمات انجام دیں انھیں علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ بابائے جدید سندھی شاعری شمس العلما مرزا قلیچ بیگ ان کے پردادا تھے۔ مرزا قلیچ بیگ نے اپنی تین سو بانوے (۳۹۲) وقیع تصانیف سے علم و ادب کی ثروت میں جو اضافہ کیا وہ تاریخ کے اوراق میں آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ انیتا غلام علی کے والدین نے اپنی ہونہار بچی کی تعلیم و تربیت پر اپنی توجہ مرکوز کر دی۔ انیتا غلام علی نے ابتدائی تعلیم سینٹ لارنس کانونٹ سکول کراچی سے حاصل کی اعلیٰ تعلیم کے مدراج انھوں نے ایس۔ ایم کالج کراچی میں مکمل کیے۔ نصابی اور ہم نصابی سرگرمیوں میں انیتا غلام علی نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کا شمار فطین، فعال، مستعد، مودب اور باذوق طالبات میں ہوتا تھا۔ بچپن ہی سے انھیں کھیلوں اور گھڑ سواری کا شوق تھا۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ گدھوں پر سواری کرنے میں بھی تامل نہ کرتیں۔ اللہ کریم نے انھیں جسمانی صحت اور قوت سے نوازا تھا۔ باقاعدگی سے ورزش اور کھیلوں میں حصہ لینا ان کا معمول تھا۔ زمانہ طالب علمی میں اُن کا شمار اپنے تعلیمی ادارے کے بہترین اتھلیٹس میں ہوتا تھا۔ وہ نیٹ بال اور بیڈمنٹن کی بہترین کھلاڑی تھیں۔ سکول اور کالج کی سطح پر وہ نیٹ بال اور بیڈمنٹن کی ٹیموں کی کپتان رہیں۔ انھوں نے کراچی اور سندھ کے بڑے شہروں میں طالبات کے متعدد ٹورنامنٹ جیتنے کا اعزاز حاصل کیا۔ وہ سائنسی اندازِ فکر کی حامل تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے شعبہ سائنس میں علمِ نباتات کو اختصاصی مہارت کے لیے منتخب کیا۔ ایس۔ ایم کالج سے ان کی قلبی وابستگی اور والہانہ محبت ان کے مزاج کا حصہ بن گیا۔ اسی وادیٔ جمیل میں انھوں نے ۱۹۶۱ تا

۱۹۸۵ء تدریسی خدمات انجام دیں۔ وہ اس مادرِ علمی میں مائیکرو بیالوجی کی تدریس پر مامور تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ یہ کائنات ابھی ناتمام ہے اسی لیے دمادم صدائے کن فیکون سنائی دے رہی ہے۔ اپنے مضمون پر انھیں عبور حاصل تھا اسی لیے ان سے اکتساب فیض کرنے والی طالبات ان کی بہت عزت کرتی تھیں۔ علم و ادب کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔ وہ عالمی کلاسیک اور پاکستانی ادبیات میں گہری دلچسپی رکھتی تھیں۔ وہ اپنے کالج کی انتہائی قابل اور ہر دل عزیز پروفیسر تھیں۔ ان کی علمی فضلیت، تدریسی مہارت، انتظامی فراست اور پیشہ ورانہ کمال کا ہر سطح پر اعتراف کیا گیا۔ اس عرصے میں ان کی زندگی میں کئی نشیب و فراز آئے۔ شادی بھی ہوئی مگر کوئی اولاد نہ ہوئی اور پانچ سال کے بعد خلع حاصل کر لیا۔ زندگی کے سفر میں جب شریک حیات کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی پیدا نہ ہو سکے تو مسافت رائیگاں چلی جاتی ہے اور سفر کی دھول ہی پیرہن بنتی ہے۔ ٹوٹے ہوئے رشتوں کے اس اُداس اور تلخ تجربے اور جذباتی شکست و ریخت نے اس حساس ادیبہ کی روح کو زخم زخم اور دل کو کرچی کرچی کر دیا۔ اس سانحہ کے بعد انیتا غلام علی نے اپنی تنہائیوں کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا اور باقی زندگی تنہا گزار دی۔

انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے انیتا غلام علی نے بہت جدوجہد کی۔ اساتذہ کی ٹریڈ یونین سرگرمیوں میں انھوں نے بھرپور حصہ لیا۔ دورانِ ملازمت وہ پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن سے وابستہ ہو گئیں۔ اساتذہ کی فلاح و بہبود کے لیے انھوں نے جو موثر اور فعال کردار ادا کیا، اس کی بنا پر انھیں پاکستان کالج ٹیچر ایسوسی ایشن کی نائب صدر کی ذمہ داریاں تفویض کی گئیں۔ ان اہم ترین ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتی رہیں۔ اساتذہ کو معاشرے میں عزت اور وقار کا مقام دلانے کے سلسلے میں انھوں نے جو محنت کی اس کے اعتراف میں اساتذہ نے انھیں پاکستان کالج ٹیچرز ایسوسی ایشن کی صدر منتخب کیا۔ انیتا غلام علی نے سندھ کے کالج اساتذہ کی نمائندگی کرتے ہوئے جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے حریتِ ضمیر سے جینے کی راہ اپنائی اور ہمیشہ حریتِ فکر و عمل کا علم بلند رکھا۔ انھیں اس بات کا قلق تھا کہ بعض نجی تعلیمی

اداروں میں اساتذہ کی توہین تذلیل، تضحیک اور بے توقیری نے لرزہ خیز اور اعصاب شکن صورت اختیار کر لی ہے۔ پاکستان کے نجی تعلیمی اداروں میں اساتذہ کی شرائط ملازمت کو بہتر بنانے کے سلسلے میں انھوں نے بڑی بہادری سے حالات کا سامنا کیا۔ ۱۹۶۰ء کے اواخر میں انیتا غلام علی نے کراچی کے اٹھہتر (۷۸) نجی کالجز میں تدریس پر مامور اساتذہ کے حقوق کے لیے بھرپور جدوجہد کا آغاز کیا۔ ہوائے جور وستم میں بھی حوصلے، اُمید اور وفا کی شمع کو فروزاں رکھتے ہوئے انھوں نے اساتذہ کے دلوں کو ایک ولولۂ تازہ عطا کیا۔ ۱۹۷۰ میں اساتذہ کے حقوق کی جدوجہد میں تیزی آ گئی۔ اساتذہ کے پُرامن جلوس پر پولیس نے تشدد کیا اور جو اساتذہ پولیس کے لاٹھی چارج کی زد میں آئے ان میں انیتا غلام علی بھی شامل تھیں۔ اس موقع پر انیتا غلام علی کو پابند سلاسل کر دیا گیا انیتا غلام علی نے فسطائی جبر کے سامنے سپر انداز ہونے سے انکار کر دیا اور قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ یکم ستمبر ۱۹۷۲ء کو جب حکومت نے نجی تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لے لیا تو انیتا غلام علی بھی سرکاری ملازم ہو گئیں۔ انھوں نے سرکاری ملازمت میں گراں قدر خدمات انجام دیں، جن کا ہر سطح پر اعتراف کیا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں اُن کا تقرر سندھ ٹیچرز فاؤنڈیشن کی مینیجنگ ڈائریکٹر کے منصب پر ہوا۔ ۱۹۹۰ میں جب سندھ ایجوکیشن فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں لایا گیا تو اس کی مینیجنگ ڈائریکٹر کی حیثیت سے انیتا غلام علی کا تقرر ہوا۔ اپنے ماتحت عملہ کے ساتھ ان کا سلوک ہمیشہ ہمدردانہ اور مشفقانہ رہا۔ وہ اپنے ماتحت کام کرنے والے ملازمین کو اپنے اہلِ خانہ کی طرح عزت و احترام سے نوازتیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان ماتحت کام کرنیوالے تمام ملازمین اُنھیں ''انیتا آپا'' کہہ کر پکارتے۔ باہمی احترام، خلوص اور دردمندی کی اساس پر استوار یہ تعلق وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ انھوں نے سندھ گرلز گائیڈز ایسوسی ایشن کی صدر کی حیثیت سے بھی خدمات انجام دیں۔ انیتا غلام علی نے نظامِ تعلیم اور تعلیمی ترقی کے موضوع پر کئی اہم قومی اور بین الاقوامی کانفرنسوں میں پاکستان کی نمائندگی کی۔ وہ ایک عظیم محبِ وطن خاتون تھیں۔ وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ قلبی وابستگی اور والہانہ محبت ان کا بہت بڑا اعزاز و امتیاز ہے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ

مادرِ وطن کے ساتھ محبت ہر پاکستانی کا جزوِ ایمان ہونا چاہیے۔ وطن محض چمکتے ہوئی سنگ و خشت کی بلند و بالا عمارات کا نام نہیں بلکہ یہ تو اہلِ وطن کے جسم اور روح سے عبارت ہے۔ وہ وطن کو ترقی، تعلیم اور خوشحالی کے ارفع مقام پر فائز دیکھنے کی آرزومند تھیں۔ وطن میں فروغ گلشن وصوتِ ہزار کا موسم دیکھنے کی تمنا میں انھوں نے دن رات ایک کر دیا اور پاکستان کی نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ پاکستان میں تانیثیت کے معتبر اور موقر حوالے کی حیثیت سے ان کی ایک منفرد پہچان تھی۔ انسانیت کے وقار اور سربلندی کے لیے انھوں نے جو بے مثال جدوجہد کی وہ ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔ ان کا دبنگ لہجہ ان کے خلوص اور دردمندی کا مظہر تھا۔ پاکستان کے تعلیمی افق پر ان کی یادیں اس طرح بکھری ہوئی ہیں کہ جس طرف بھی نظر اٹھتی ہے اُن کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اُن کی قومی، ملی، تعلیمی اور سماجی خدمات کو عقیدت سے لبریز آنکھیں دیکھتی ہیں اور خلوص سے معمور دل ان کو محسوس کر سکتا ہے۔

انیتا غلام علی سندھ کی وزیر تعلیم بھی رہیں۔ ۱۹۷۶ء میں ممتاز علی بھٹو نے اپنے عبوری دور میں انھیں کیئر ٹیکر وزیر تعلیم سندھ مقرر کیا۔ انھوں نے تین ماہ تک اس عہدے پر خدمات انجام دیں اور کوشش کی کہ سندھ کے نظامِ تعلیم کو جدید خطوط پر استوار کیا جائے۔ جنرل پرویز مشرف نے پروفیسر انیتا غلام علی کو ۱۹۹۹ء میں ٹیکنو کریٹ کی سیٹ پر شعبہ تعلیم کی اہم ذمہ داریاں تفویض کیں تو انھوں نے تعلیم کے شعبہ کی ترقی کی خاطر یہ ذمہ داریاں قبول کر لیں۔ جنرل پرویز مشرف نے جب ریفرنڈم کا اعلان کیا تو انیتا غلام علی حکومت سے الگ ہو گئیں۔ پاکستان میں خواتین، بچوں اور بچیوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے پروفیسر انیتا غلام علی نے طویل جدوجہد کی۔ وہ اس بات پر اصرار کرتی تھیں کہ ظلمتِ شب کا شکوہ کرنے کے بجائے ہمیں اپنے حصے کی شمع فروزاں کرنے میں کوئی تامل نہیں کرنا چاہیے۔ وطنِ عزیز میں چائلڈ لیبر نے تو ہونہار بچوں کی زندگی کی تمام رُتیں ہی بے ثمر کر دی ہیں۔ وہ یہ سماں دیکھ چکی تھیں کہ سمے کے سم کے ثمر نے ان بچوں کی زندگی کو مسموم ماحول کی بھینٹ چڑھا دیا ہے۔ معاشرے سے چائلڈ لیبر کو بیخ و بُن سے اکھاڑ پھینکنے کے سلسلے میں

اُن کی خدمات کا پوری دنیا میں اعتراف کیا گیا۔ ان کی خدمات کے اعتراف میں انھیں ستارۂ امتیاز، پرائڈ آف پرفارمنس اور بے نظیر اکیڈمک ایوارڈ سے نوازا گیا۔

ضعفِ پیری کے باعث اعضا مضمحل ہو جاتے ہیں اور عناصر میں اعتدال کا فقدان ہو جاتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں انیتا غلام علی کو نظام استخواں کی ایسی تکلیف لاحق ہوگئی جس کے باعث وہ چلنے پھرنے کے قابل نہ رہیں اور ان کی نقل و حرکت ویل چیئر تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس تکلیف کے باوجود انھوں نے معذوری کو مجبوری نہ بننے دیا اور عملی زندگی میں انتہائی موثر اور فعال کردار ادا کیا۔ علمی اور ادبی نشستوں میں وہ باقاعدگی سے شرکت کرتیں اور اپنی گل افشانیٔ گفتار سے سامعین کو مسحور کر دیتیں۔ ہر ملاقاتی کے ساتھ اخلاق اور اخلاص کے ساتھ پیش آنا ان کا شیوہ تھا۔ ان کا خلوص اور دردمندی سے لبریز سلوک ملاقاتی کو ان کی عظیم شخصیت کا گرویدہ بنا دیتا۔ پاکستانی خواتین کو حوصلے، اعتماد اور یقین کے ساتھ اپنے حقوق کے لیے جدوجہد پر مائل کرنے اور قومی تعمیر و ترقی کے کاموں میں جوش و خروش سے حصہ لینے پر مائل کرنے میں انیتا غلام علی نے جو اہم کردار ادا کیا وہ ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ دردمندوں، ضعیفوں، مجبوروں، محروموں اور مظلوموں کی خاطر ایثار کی جو مثال انھوں نے قائم کی وہ انھیں منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتی ہے۔ ان کی شخصیت کی دل کشی اور کردار کے حسن و جمال کا راز ان کے انکسار اور ایثار میں پوشیدہ تھا۔ سیلِ زماں سے کچھ محفوظ نہیں، بیتے لمحات کبھی واپس نہیں آتے صرف ان کی یادیں ہی زندگی بھر ساتھ نبھاتی ہیں۔ میری دعا ہے اللہ کریم پروفیسر انیتا غلام علی کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔ رخشِ حیات پیہم رو میں ہے اور ہم سب کمر باندھے ہوئے چلنے کو تیار بیٹھے ہیں۔ ہماری بزمِ وفا سے اُٹھ کر راہی ملکِ عدم ہونے والوں کی طرف ہم سب کو ایک نہ ایک دن عازمِ سفر ہونا ہے۔ بصیرت رکھنے والوں سے یہ حقیقت مخفی نہیں کہ ہمارے رفتگاں کی حسین یادیں ہی فصیلِ دل کے کلس پر مثلِ ستارۂ سحر ضوفشاں ہیں جو ہمارے لیے مشعلِ راہ ہیں۔

بے تیشۂ نظر نہ چلو راہِ رفتگاں　　　ہر نقشِ پا بلند ہے دیوار کی طرح

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

محسن احسان کی غزل کا فکری و فنّی جائزہ

عصری حقائق کا اگر عمیق نظری سے بے لاگ جائزہ لیا جائے تو ہم پر یہ تلخ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ آج کا انسان ہر شعبۂ حیات میں راتوں رات کروڑ پتی بننے کے جنون میں مبتلا ہے۔ اس کے لیے خواہ اسے ہیروئن بیچنی پڑے، سمگلنگ کرنی پڑے، ڈاکہ ڈالنا پڑے یا کرپشن کا کوئی اور راستہ اختیار کرنا پڑے۔ بدقسمتی سے اس ہوس کاری کی زد میں ادب جیسا نیک نام و معتبر شعبہ بھی آ گیا ہے۔ جب شہرت ناجائز ذرائع سے حاصل ہو جائے تو شاعر ہو یا نثر نگار، اسے مطالعۂ کتب اور فنی ریاضت کی کڑی آزمائشوں سے گزرنے کی کیا ضرورت ہے؟

خدا کا شکر ہے کہ ادب کی اس حبس زدہ اور مسموم فضا میں کہیں کہیں نفع و نقصان سے بے نیاز کچھ ایسے دیوانے مل جاتے ہیں جو تخلیقات کے کشت زاروں کو اپنے خونِ جگر سے سینچ کر سدا بہار موسموں سے ہم کنار کرنے میں مصروف رہے ہیں۔ محسن احسان بھی ایسے ہی لوگوں میں تھے۔ ان کا شمار اُردو کے معروف اور ممتاز شعراء میں کیا جاتا ہے۔ وہ ملکی ادبی تقریبات کے علاوہ بین الاقوامی مشاعروں میں بھی پاکستان کی نمائندگی کرتے رہتے تھے۔ انگریزی کے اُستاد ہونے کے حوالے سے تو ان کی انگریزی ادبیات پر گہری نظر تھی ہی، لیکن ان کا فارسی اور اُردو کے کلاسیکی اور جدید ادب کا مطالعہ بھی حیران کُن تھا۔ اسی مطالعے کا فیض ہے جس نے انہیں نہ صرف اپنی تہذیبی روایات سے آشنا ہونے کا موقع دیا ہے بلکہ اُردو زبان و بیان کے تقاضوں کو سمجھنے میں بھی مدد دی۔

محسن احسان کی شاعری میں موضوعات کا تنوع اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی زندگی ہمہ جہت تجربات کی راہوں سے گزری۔ شاعر کی ذات معاشرے سے الگ نہیں ہوتی۔ اسی لیے وہ اپنے جذبہ و فکر کا ترجمان بھی ہوتا ہے۔ اور معاشرے کی زبان بھی کہلاتا ہے۔ محسن احسان نے جہاں اپنے فکری رُجحانات اور جذباتی معاملات کو شعری پیکروں میں متشکل کیا وہاں وہ اپنے

عہد کے انسان کے مصائب و مسائل کا وسیع القصی اور کشادہ نظری سے جائزہ لے کر اپنا نقطۂ نظر نوک قلم پر لے آئے۔ انسان زندگی کے سنگین اور تلخ حقائق سے گھبرا کر خوابوں کی دنیا میں پناہ لینا چاہتا ہے لیکن بقول جوش ملیح آبادی ؎ خواب بھی ہے جذبۂ بیدار کا پالا ہوا

جب وہ آنکھیں بند کرتا ہے تو عالم بیداری کی ناآسودہ خواہشات اور کرب ناک واقعات اس کا تعاقب کرتے ہوئے خوابوں کی دُنیا میں بھی پہنچ جاتا ہے۔ بیداری کے یہ شمشیر بردار دشمن سندر سپنوں کا قتل عام شروع کر دیتے ہیں۔ اس وقت فضا دھواں دھواں اور خوں چکاں ہو جاتی ہے جب انسان دوبارہ وحشت زدہ ہو کر آنکھ کھولتا ہے تو رت جگے اس کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ ہاں وہ رت جگے جو حرماں نصیبوں اور سوختہ جانوں کی تقدیر ہوا کرتے ہیں۔ بقول محسن احسان

کس طرح وہ خواب میں صورت کسی کی دیکھتے ۔۔۔ رت جگے جن سوختہ جانوں کی تقدیروں میں تھے

ذہن ہے سب دھواں دھواں خواب مرے لہولہو ۔۔۔ دل کے افق پہ خیمہ زن ایک مہیب تیرگی

کٹ رہے ہیں کچھ اس طرح شب و روز ۔۔۔ شام بے ذائقہ، سحر بے خواب

مسلسل بے چینی اور مستقل ناآسودگی ایک ایسا خوں خوار عفریت ہے جو انسان کا کہیں پیچھا نہیں چھوڑتا نہ عالم بیداری میں اور نہ دُنیائے خواب میں اس صورت میں انسان خود کو اس بلبلِ پر شکستہ کی طرح سمجھنے لگتا ہے جس کے دل میں بلندیوں کی طرف پرواز کرنے کی حسرت تو موجود ہوتی ہے لیکن اُڑ نہیں سکتا۔ ایسا مردم گزیدہ و آفت رسیدہ انسان فرزانوں کی محفل میں خود کو دشتِ جنوں کا مسافر سمجھتا ہے اور اخلاص و وفا کے دعوے داروں کے شہر میں اپنے آپ کو غریب الدیار شمار کرتا ہے۔ محسن احسان نے زندگی اور موت کے درمیان معلق انسان کے احساسات کی درج ذیل اشعار میں عکاسی کی ہے۔

بلندیوں کی طرف حسرتوں سے دیکھتا ہوں ۔۔۔ کسی نے نوچ لیے ہیں تمام پر میرے

برس رہی ہے نگاہوں سے دل کی ویرانی ۔۔۔ مری بہار بھی محسن خزاں کے ہات میں ہے

ہوائے دشتِ جنون! کچھ سناؤ محسن کی وہ بے مراد، غریب الدّیار کیسا ہے

نہ کوئی لوحِ محبت، نہ کوئی کتبۂ غم مزاروں پہ فقط حسرتیں ہیں مرثیہ خواں

جب خواہشات کے بلوریں پیالے سماج کی بے رحم سچائیوں کے پتھراؤ کی زد میں آجاتے ہیں تو انسان مدد کے لیے اپنے ہمدردوں اور غم گساروں کو پکارتا ہے۔ جب اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے اور کوئی جواب نہیں آتا تو اسے یقین ہو جاتا ہے کہ اس برق رفتار اور مشینی عہد میں ہر شخص صرف اپنی ذات کے حوالے سے سوچتا ہے۔ اسے دوسروں کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ خود غرض لوگوں کے جنگل میں وہ اکیلا ہے۔ بھری محفل میں تنہا ہونے کا احساس جب شدید ہونے لگتا ہے تو سہما ہوا انسان حیرت اور افسوس کے عالم میں سوچنے لگتا ہے کہ میں جہاں رہتا ہوں وہ شہر حقیقت میں شہر خموشاں ہے جہاں لوگ بظاہر زندہ نظر آتے ہیں لیکن غور سے دیکھا جائے تو ان میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ میری آواز صدائے بازگشت بن کر میری ہی سماعتوں کو گھائل کرنے لگتی ہے۔ صرف ایک تنہائی ہی میری دمساز و ہمراز ہے، جو مجھ سے لپٹ کر والہانہ انداز سے پیار کرتی ہے اور ہمیشہ ساتھ نبھانے کے وعدے کرتی ہے۔ مجھے لوگ محفل میں قہقہے لگاتا ہوا دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ یہ شخص بہت خوش ہے کسی نے میرے باطن کی دُنیا میں جھانک کر نہیں دیکھا، جہاں زخم خوردہ آرزوئیں سسک رہی ہیں اور خوشیاں ماتمی لباس پہنے بین کر رہی ہیں۔ مجھے نئی کربلاؤں کا سامنا ہے اور میرے ساتھی ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ہیں۔ جنہوں نے مجھے کبھی سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا اور مجھ پر پھول برسائے تھے۔ وہی تغافل شعار لوگ مجھے تنہائی کے دوزخ میں ڈال کر روانہ ہو گئے ہیں۔ بقول محسن احسان:

جب پکارا ہے تجھے اپنی صدا آئی ہے دل کی دیواروں سے لپٹی ہوئی تنہائی ہے
دل بھی آباد ہے اک شہر خموشاں کی طرح ہر طرف لوگ، مگر عالم تنہائی ہے

جس نے مجھے محفل میں چہکتے ہوئے دیکھا حیرت ہے کہ اس نے میری تنہائی نہ دیکھی

وہی تمکین تغافل ، وہی بیتابیِ شوق　　قربتِ حُسنِ دل آرا پہ بھی تنہا ہوں میں

رات بھر چاند کی ٹھنڈک میں سلگتا ہے بدن　　کوئی تنہائی کے دوزخ سے نکالے مجھ کو

اب سرِ دشتِ خود آرائی کھڑا ہوں تنہا　　میں کہ دلہا تھا کبھی انجمن آراؤں میں

تنہا کھڑا ہوں میں بھی سرِ کربلائے عصر　　اور سوچتا ہوں میرے طرف دار کیا ہوئے

خود غرض لوگ جب اپنے مفادات کی تکمیل کے بعد کسی کو دُنیا کے سمندر میں حوادث کے تھپیڑے کھانے کے لیے تنہا چھوڑ دیتے ہیں تو اس شخص کی حالت ناگفتی اور قابلِ رحم ہو جاتی ہے۔ وہ شخص اس پرندے کی مانند ہوتا ہے جو موسم کے شدائد سے اُڑنے کے قابل نہیں رہتا۔ ایسا شخص دوست نما دشمنوں کے تکلیف دہ رویئے پر احتجاج ہی کرنا نہیں چاہتا انہیں للکارنا بھی جانتا ہے لیکن وہ یہ خوب سمجھتا ہے کہ ابھی تو میرے حریف مجھے صرف چبھتی ہوئی طنز آمیز نظروں سے ہی دیکھ رہے ہیں میں نے اگر زبانِ شکوہ کھول دی تو یہ لوگ وہ خنجر بھی میرے سینے میں آتار دیں گے جو انہوں نے ابھی اپنی آستینوں میں چھپا رکھے ہیں۔ محسن احسان نے بے مہریِ ایام کے ستائے ہوئے انسان کے جذبات کی جس فنی مہارت سے عکاسی کی ہے، اس کا جواب نہیں۔ نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ ہوں

موسم کا رویّہ ہے کہ اس بار پرندے　　اُڑنے کا ہواؤں میں چلن بھول گئے ہیں

جو تری آنکھوں میں تھے، اُن کی چُبھن کچھ اور تھی　　جو مرے سینے میں اُترے تھے وہ خنجر اور تھے

حیران زمانے کو بہت کر گئے ہم بھی　　دشمن کو تو للکارا مگر ڈر گئے ہم بھی

ہر دل میں کدورتیں بھری ہیں　　محسن ! یہ عتاب کی گھڑی ہے

جب سماجی رویوں کی منڈی میں محبت، ایثار اور وفاداری کی اجناس کا قحط پڑ جاتا ہے اور نفرت، بدگمانی، خودغرضی اور غداری ان کی جگہ لے لیتی ہیں تو حساس لوگوں کی زندگی شکست و ریخت کا شکار ہونے لگتی ہے۔ وہ سوچنے لگتے ہیں کہ ہم زندگی نہیں گزار رہے بلکہ مسلسل کوئی گناہ کیے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھیں اپنی آب و تاب کھو کر ایک خشک جزیرے کا روپ اختیار کر لیتی ہیں اور دل بے آب و گیاہ ریگستان بن جاتے ہیں جہاں تاحدِ نظر کوئی ایسا نہیں ہوتا۔ اگر سورج بھی سوا نیزے پر آ جائے تو اس فضا کا کیا عالم ہوگا۔ محسن احسان نے ایک حساس انسان کی ان کیفیات کی اس طرح مصورانہ عکاسی کی ہے۔

اب کہ سورج اُتر آیا ہے سوا نیزے پر   سائے بھی دھوپ میں چیخ اُٹھے ہیں سایا سایا

آنکھ وہ خشک جزیرہ کہ جہاں جسم جلیں   دل وہ صحرا کہ کوئی پاؤں نہ دھرنے پائے

کچھ اس طرح سے گزارا سرائے دہر میں وقت   کہ جیسے زندگی محسنؔ، خطا ہماری تھی

شدت احساس کا مارا ہوا انسان شدت الم کے ہولناک بیابانوں کی خاک چھاننے لگتا ہے۔ وہ صبح سے شام تک مسلسل بادیہ پیمائی کے بعد جب سکون کی تلاش میں اپنے گھر جاتا ہے تو درد و یاس کے مہمانوں کو اپنا منتظر پاتا ہے۔ اس کی امیدوں کی سیپیاں گہر ہائے نشاط سے محروم ہو جاتی ہیں۔ اس کی قیامت خیز آہ اس کے ہونٹوں پر آ کر دم توڑ دیتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ نہ جانے غم کی سیاہ رات کب ڈھلے گی اور کب ستارۂ صبح حجاب ابر سے نکل کر کرنوں کے موتی فضاؤں میں بکھیرے گا۔ اسے یقین ہو جاتا ہے کہ خورشید، مہتاب، جگنو اور ستارے کی آرزو تو صرف ایک سہانا خواب ہے میری شب غم تو صبح محشر کے انتظار میں ہے۔ میں جینے کی ہوس دل میں لیے کسی دن گوشۂ لحد میں اُتر جاؤں گا۔ اور بار حیات سے سبکدوش ہو جاؤں گا۔

محسن احسان کے تلخیِ غم میں ڈوبے ہوئے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

دن بھر کے دکھوں کو لیے ہم اپنی بغل میں   محسن ہوئی جب شام تو پھر گھر گئے ہم بھی

ڈیرہ جمالیا ہے غم و درد و یاس نے — رستہ دکھاؤں کیسے کہ مدّت سے میرے گھر

کنارِ موجۂ احساس رولتا ہے کوئی — کئی دنوں سے اُمیدوں کی سیپیاں مُحسن

ہونٹوں پہ جو آتی نہیں اس آہ کو دیکھو — آشوبِ قیامت میں گرفتار سبھی ہیں

ستم دیدہ والم رسیدہ انسان جب بے مہریٔ روزگار کا شکار ہو کر جذباتی فشار اور ذہنی انتشار میں مبتلا ہوتا ہے۔ تو قدرتی طور پر اس کا دل کوئی ایسی پناہ گاہ تلاش کرنے لگتا ہے جہاں چھپ کر حوادث کی ضرب کاری و سنگ باری سے محفوظ رہا جا سکے۔ اچانک اس کی نظر سانولے رنگ کی ایک موہنی صورت کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ جس کی چشم وصعد ار میں خود سپردگی کے دل آویز اشارے، تکلم میں سُریلے جھرنوں کی تراوش اور اداؤں میں بے باکی و مجذوبی کی دھوپ چھاؤں ہوتی ہے۔ صہبائے دیدار سے سرشار تماشائی اُس نگارِ خوش اطوار کے نقش و نگار کی رعنائی کا مشاہدہ کرتے ہی اک عمر کی تھکن بھول جاتا ہے۔ حُسن کا ابرِ کرم اس کی صدیوں کی پیاس بُجھا دیتا ہے۔

حُسن کی حشر سامانیوں اور جلوہ فشانیوں کی داستان محسن احسان کی زبانی سُنیے

ڈس گئی اپنے تکلم کی ادا سے مجھ کو — سانولے رنگ کی اک موہنی صورت مُحسن

قتل کر گئی ہم کو ہر ادائے محبوبی — کچھ ذرا سی بے باکی، کچھ ذرا سی مجذوبی

ہمارے پاس وہ تشبیہ واستعارا نہیں — بیاں ہو جن میں ترے خال و خد کی رعنائی

وہ اک اشارہ کہ اس چشمِ وصعد ار میں تھا — صبا میں تھا نہ دل آویزیٔ بہار میں تھا

اُس سیہ چشم کو آہوئے رمیدہ لکھوں — بے ☆ نیازانہ میرے پاس سے جو گزرا ہے

☆ بے نیازانہ برابر سے گزرنے والے — تیز کچھ قلب کی رفتار ہوئی تھی کہ نہیں
(ڈاکٹر عندلیب شادانی (ادارہ)

اب تک درودیوار سے خوشبو نہیں جاتی　　　اِک رات یہ محسن مرے گھر کون رہا ہے

کون آیا سرِ صحرائے محبت محُسن　　　ذرّہ ذرّہ مہک اُٹھا گُلِ تر کی صورت

یہ کائنات جلال و جمال کھو بیٹھے　　　جو لمحہ لمحہ مژہ کی کشادوبست نہ ہو

محبوب کے فسوں کارِ حُسن کی کشش جب عاشق کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے تو وہ اپنے تمام دُکھ درد بھول کر، دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر اس کی طرف پروانہ وار لپکتا ہے اور منزلِ مراد حاصل کر لیتا ہے۔ محبوب کی عشوہ طرازیاں عاشق کی آتشِ شوق کو بھڑکا دیتی ہیں۔ عاشق و محبوب کی یکجائی سے صدیوں کی روایتی حسن و عشق کی داستان کا آغاز ہوتا ہے۔ اس داستان میں وصال کے مسرت انگیز و ولولہ خیز ابواب بھی ہیں اور فراق کے دل دوز و جاں سوز واقعات بھی۔ قہقہوں کی روداد بھی ہے اور آنسوؤں کا تذکرہ بھی۔ محسن احسان کی شاعری میں حُسن و عشق کے روابط کی کہانی بڑے سادہ اور فطری انداز میں پیش کی گئی ہے۔

فراق گزیدہ عاشق کی تمنائے وصال کا والہانہ رنگ ملاحظہ ہو۔

دُور رہ کر بھی ہے ہر سانس میں خوشبو تیری　　　میں مہک اُٹھوں جو تُو پاس بُلا لے مجھ کو

جب عاشق کے جوشیلے اظہارِ محبت سے محبوب متاثر ہو کر اس پر مائل ہو جائے تو عاشق کا کیا ردِ عمل ہوتا ہے۔ درج ذیل شعر اس کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔

محسن ہمیں آج اس نے بہت پیار سے دیکھا　　　اک عمر کی تھی جو وہ تھکن بھول گئے ہیں

محبوب کی یہ فطرت ہے کہ جب عاشق اُسے دیوانہ وار چاہنے لگتا ہے اور اس کی شدّت سے پذیرائی ہونے لگتی ہے تو اس کی انا تسکین پا لینے کے بعد باہمی روابط کو نظر انداز کرنے لگتی ہے۔ ایک طرف شکستہ پا عاشق ہوتا ہے اور دوسری طرف گریز پا محبوب۔ ایک طرف ناکام حسرتوں کا غبار ہوتا

ہے اور دوسری طرف خاک اُڑانے کا عمل۔ عاشق بے اختیار پکار اُٹھتا ہے بقول محسن احسان

عشق تنہا دہر میں آیا تھا اور تنہا گیا — حُسن کے ہمراہ دیکھا اک جلوسِ تشنگاں

عاشق وصل کے روح پرور اور دل نواز لمحوں کو یاد کرتا ہے اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی برسات ہونے لگتی ہے محبوب کی حسین یادیں دائمی خوشیوں کا پیغام بننے کی بجائے جان لیوا بن جاتی ہیں۔ محبوب کو بھول جانا عاشق کے لیے نہایت مشکل کام ہے۔ پیار کے رشتے آسانی سے ختم نہیں ہوتے ۔۔ بقول محسن احسان

لیکن وہی تعلق خاطر نظر میں ہے — اس سے جدا ہوئے کئی موسم گزر گئے

مدّت کے بعد آج کوئی پھر نظر میں ہے — اے یادِ شام، دردِ محبت ذرا ٹھہر

دل کے سناٹوں سے آئی تری آواز مجھے — اے مرے بھولنے والے! شب تنہائی میں

خواب دیکھنا انسان کا حق ہے۔ ان پر کوئی پہرے نہیں بٹھا سکتا۔ یہ ایک ایسا دریا ہے جس پر کوئی بند نہیں باندھ سکتا۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہمیں ہر خواب کی حسبِ خواہش تعبیر مل جائے۔ تعبیریں خوش گوار بھی ہوسکتی ہیں اور ناگوار بھی۔ غمِ جاناں سے واسطہ پڑے یا غمِ دوراں سے حقیقت پسند انسان دُنیا کے حقائق کا کُھلی آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور زندگی کے مسائل حل کرنے کے لیے راہِ اعتدال اختیار کرتا ہے۔ خوش فہمیاں اور خود فریبیاں قدم قدم پر اس کا راستہ روکنے کی کوشش کرتی ہیں لیکن وہ خوب سمجھتا ہے کہ محض خوش خیالی اور نیک خواہشات سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ دُنیا ابتلا و آزمائش کی جگہ ہے۔۔ وہ کامیاب بھی ہوسکتا ہے اور ناکام بھی۔ دُنیا بہاروں کا مسکن ہی نہیں خزاؤں کی آماجگاہ بھی ہے۔ جہاں وصالِ محبوب کے نشاط انگیز لمحے ہیں وہاں فراقِ جاناں کی کرب افزا ساعتیں بھی موجود ہیں۔

جو انسان خود بینی، خود پرستی اور انانیت کے خود ساختہ حصار سے باہر نہیں نکلتا زمانے کی مسلسل ٹھوکروں کا نشانہ بن جاتا ہے۔

محسن احسان نے ایک حقیقت پسند شاعر کی حیثیت سے زندگی کے تمام پہلوؤں کا بے لاگ تجزیہ کیا ہے۔ان کے چند اشعار نذر قارئین ہیں۔

انا کے آئینے میں عکس دیکھنے والے　　　تو مُشتِ خاک ہے خودبین و خود پرست نہ ہو

جو اپنی ذات سے باہر نکل نہیں سکتے　　　انہیں بھی ٹھوکریں دو چار، اے زمانے لگا

تری طلب کا دل آویز حادثہ ہم نے　　　بُھلا دیا ہے کئی اور حادثوں کی طرح

تری نگاہ سے اوجھل سہی مگر محسن　　　خزاں کا عکس بھی آئینۂ بہار میں تھا

کب تک غبارِ دشتِ محبت اُڑائیں ہم　　　اچھا ہے اب یہی کہ تجھے بھول جائیں ہم

ایک حقیقت پسند انسان خوب جانتا ہے کہ معرکۂ خیر و شر روزِ ازل سے جاری ہے اور تاقیامت جاری رہے گا۔ جہاں اہلِ خیر عدل، صداقت، ایثار، دیانت داری، اخلاص اور رواداری کو دُنیا میں عام کرنے کے لیے کوشاں ہیں۔ اسی طرح اہل شر ظلم، جھوٹ، خودغرضی، بددیانتی، منافقت اور تعصب کا زہر پھیلانے میں مصروف ہیں۔

انبیاء اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہر دور میں انسان کو متنبہ کرتے رہے ہیں کہ وہ خیر کا راستہ اپنائے اور شر سے بچے۔ خیر و شر میں امتیاز کرنے کے امتحان میں کامیاب وہی لوگ ہیں جو صراطِ مستقیم پر چلے اور شر کے خارزاروں سے اپنا دامن بچاتے رہے۔

محسن احسان کی شاعری کا بیشتر حصہ خیر و شر کے تضادات کی نشان دہی پر مشتمل ہے۔ انہوں نے گندم نما جو فروش لوگوں کے چہروں سے ریاکاری کے نقاب ہٹا کر معاشرے کو ان کی اصل صورت دکھائی ہے۔ وہ ان لوگوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو عیاری و فریب کاری سے بنی نوع انسان کو خوں کے آنسو رُلا رہے ہیں۔ ظاہر و باطن کا تضاد ان کے لیے سوہانِ روح ہے۔ ان کے درج ذیل اشعار میں تضادات کی فضا ملاحظہ ہو۔

لگا کے آگ بدن میں وہ مجھ سے چاہتا ہے | کہ سانس لوں تو فضا کو دُھواں دُھواں نہ کروں

کانٹے ہیں آج مسندِ سبزہ پہ جلوہ گر | پھولوں کو زیرِ خنجرِ خوں خوار دیکھیے

ستم یہ ہے کہ وہ خورشید کاٹنے آئے | تمام عمر ستارے جنہوں نے بوئے نہ تھے

غنچوں کی قبائیں سینے والا | نیزوں میں انہیں پرو رہا ہے

ہم نے جاری کیے فرمانِ کرم بھی محسن | دستِ نااہل میں کمزور قلم ہم بھی تھے

ذہن نے جب کبھی ماضی کے دریچے کھولے | سرد جھونکوں کے عوض گرم ہوا آئی ہے

دن کو سجالی چہرے پہ آسودگی مگر | ہم منہ چھپا کے روئے شبوں کی رداؤں میں

خود تماشا ہوں تو خود محوِ تماشا میں ہوں | اپنا قاتل بھی ہوں میں، اپنا مسیحا میں ہوں

قول و فعل کے تضادات اپنی انتہا پر پہنچ کر منافقت بن جاتے ہیں۔ جب ریاکاری کو مصلحت کیشی کا نام دیا جائے، جھوٹ کو میزانِ فراست میں تول کر طاقِ صداقت میں سجایا جائے، خودداری کے دعوے دار بے ضمیروں سے گٹھ جوڑ کر لیں۔ قاتل مُنصف بن جائیں، دوست صفِ دشمناں میں شامل ہو جائیں، بے ہنر صاحب فن کہلائیں، سگے بھائی دُعا بر لب اور خنجر در بغل ہوں، شانِ درویشی و رقص مجذوبی، شکم پروری و ہوس پرستی کے آلے بن جائیں، ملاح مجبور اور بے وسیلہ مسافروں کو کاغذی کشتیوں پر سوار کر کے طوفاں خیز سمندروں کے طویل سفر پر روانہ کر دے تو اعتماد کے نازک آبگینے چور چور ہونے لگتے ہیں، یقین کے فلک بوس محل دھڑام سے نیچے آ گرتے ہیں اور معاشرتی ترقی و خوش حالی کے تمام منصوبے کسی دیوانے کا خواب بن کر رہ جاتے ہیں۔ محسن احسان کے اشعار دیکھیں اور ان کی شعری بلاغت اور فکری بلوغت کی داد دیں۔

منافقت نے لہو اتنا تن میں گرمایا | کہ گفتگو میں ریاکاریاں سجالی ہیں

مصلحت کیش نہ بن، قتل نہ دانائی کر
اپنے ہر جھوٹ کو میزانِ فراست میں نہ تول

کھیل لائے ہیں پُرانا، نئے آنے والے
جھوٹ کو طاقِ صداقت میں سجانے والے

وہی گلاب چھڑکتے ہیں بے ضمیروں پر
بہت رہا جنہیں پاسِ انا و خودداری

عدل کی اس نے وکالت کی ہے
آستیں جس کی لہو میں تر ہے

یہ زعم تھا، کہ ہے اک مہرباں ہماری طرف
کُھلی جو آنکھ، صفِ دشمناں میں شامل تھا

رکھ دیتے ہیں اک تاج سرِ بے ہنراں پر
ہم مُلکِ سخن کے وہ منافق ہیں کہ ہر صبح

بغل میں ہم ہمیشہ خنجرِ خوں خوار رکھتے ہیں
بہا کر خون بھائی کا لہو میں تر نکلتے ہیں

کیسی شانِ درویشی، کیسا رقصِ مجذوبی
سب شکم کے دھندے ہیں سب ہوس کے پھندے ہیں

سمندروں کے سفر پر کیا روانہ ہمیں
امیرِ شہر نے کاغذ کی کشتیاں دے کر

کیا جو دوست نے، کب وار وہ عدو نے کیا
جو دل پہ چوٹ لگی ہے، وہ ہم ہی جانتے ہیں

ہے میرا نام مگر دوستوں کے تیروں پر
کوئی نشاں بھی نہیں ہاتھ کی لکیروں پر

فاختہ شاخ پر نہیں آتی
سانپ لپٹا ہوا ہے بیل کے ساتھ

پاکستان جس طرح تاریخِ عالم کے ایک بڑے معجزے کی صورت میں دُنیا کے نقشے پر اُبھرا تھا۔ اس طرح اس کا دولخت ہو جانا بھی عالمِ اسلام کے لیے ایک بہت بڑا حادثہ ہے۔ اس حادثے کے پس پردہ عوامل میں ایک بڑا عامل اہلِ سیاست کی منافقت و ہوسِ اقتدار بھی ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد سب سے بڑا المیہ یہ ہوا کہ محسنینِ پاکستان کی بجائے نااہل سیاست دان

کرسی اقتدار پر براجمان ہو گئے۔ جنہوں نے مقاصد پاکستان کو دھن، دھونس اور دھاندلی کے زور پر پس پشت ڈال دیا۔ یہ ظالم جاگیردار، وڈیرے، سمگلر اور صنعت کار ابھی تک پیر تسمہ پا کی طرح قوم کی گردن پر سوار ہیں۔ تمثیل سیاست کے ان مرکزی کرداروں کا حقیقی روپ محسن احسان کے اشعار کے آئینے میں دیکھیں

ہمارے اہلِ سیاست نے کرسیوں کے لیے بنامِ خلقِ خدا پگڑیاں اُچھالی ہیں

وہی ہیں ان دنوں مقبول تمثیلِ سیاست میں جو سارے کھیل میں اک مرکزی کردار رکھتے ہیں

سیاست کے کھیل میں نااہل رہنماؤں نے ہمیشہ لسانی اور علاقائی تعصب کا جنوں پیدا کر کے عوام کو طبقاتی منافرت کی آگ میں دھکیلنے والوں کا رول ادا کیا ہے۔ کرسیوں کے حصول کے لیے شرفاء کی پگڑیاں اُچھالنا ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ محسن احسان ایک محب وطن شاعر کی حیثیت سے ایسے سیاست دانوں کو جو اپنے آپ کو قوم کے ہر دلعزیز رہنما کہلواتے ہیں۔ خبردار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ علاقائیت کا تعصب آفریں جن اگر بوتل سے باہر نکل آیا تو پھر کسی کی خیر نہیں۔ فرماتے ہیں۔

کارواں کے سب مسافر سوچتے ہیں شام سے صبح دم کس سمت میرِ کارواں لے جائے گا

کوئی طوفان آنے والا ہے شہر کے ہیں تمام گھر، بے خواب

گھُن کی صورت یہ تعصب تجھے کھا جائے گا اپنی ہر سوچ کو محسن نہ علاقائی کر

محسن احسان معاشرے میں انصاف کی حکمرانی و بالادستی کے خواہاں ہیں۔ جب محتسب خود خطا کار ہو تو وہ کسی مجرم کا محاسبہ کیسے کرے گا۔ عوام حصول عدل کے لیے کس کا دروازہ کھٹکھٹائیں؟ محسن کے یہ اشعار اربابِ بست و کشاد کے لیے توجہ طلب ہیں۔

میں کس دیارِ سخن پروراں میں ہوں کہ یہاں　　　جو لب کُشا ہو اُسی کو صلیب پر دیکھوں

محتسب جُرم مرا دیکھ کے خاموش رہا　　　خود خطا کار تھا، احکامِ سزا کیا کرتا

لہو میں تر ہے مری زندگی کی دستاویز　　　مرا عدیل مگر منتظر گواہ کا ہے

تمام شہر ہے کاذب گواہوں کا مسکن　　　حصولِ عدل کی کس در پہ جستجو کرتے

آج کے دور میں صرف سیاست کے میدان میں ہی نااہل لوگوں کی اجارہ داری قائم نہیں، زندگی کے تمام شعبوں میں بدعنوان اور بے ضمیر لوگوں کی چودھراہٹ نظر آتی ہے۔ بقول غالب:

بے ہنر عیش میں ہیں، اہلِ ہنر دیکھتے ہیں

کم نظری اور قدر ناشناسی کا یہ عالم ہے کہ جوہریوں کو پتھر اور ہیرے میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ چراغ، سورج کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ بے ہُنر لوگوں کا پُر تپاک استقبال کیا جاتا ہے۔ ہنر مند ذلیل و رسوا ہو کر قریہ قریہ اور شہر شہر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ ادبی دشت گرد جہالت کی تلواروں سے اہلِ علم وفن کے قتلِ عام میں مصروف ہیں۔ شرافت منہ چھپاتی پھر رہی ہے۔ کمینگی سرِ عام دندنا رہی ہے۔ میر تقی میر کو بھی اپنے زمانے میں ایسے ہی حالات کا سامنا تھا اور انہیں بجا طور پر یہ شکوہ تھا کہ قدر دانوں کے تجاہلِ عارفانہ کا کیا ذکر کریں، عزتِ سادات بچانا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ محسن احسان نے بدذوقی حالات کا اشعار میں کیا خوب نقشہ کھینچا ہے۔

یہ عہدِ بے ہنراں ہے کہ دورِ کم نظراں　　　ہے جوہری کو گماں پتھروں کا ہیروں پر

آج کوئی پتھروں کے مول بھی لیتا نہیں　　　ورنہ محسن ہم بھی کل تک بے بہا ہیروں میں تھے

ستم ظریفی تقدیر دیکھنا محسن　　　چراغ ہنسنے لگے آفتاب پر میرے

راہ زن ہے گروہِ بے ہنراں		یوں نہ پھر دولتِ ہنر لے کر

گنگ الفاظ معانی کے لیے چنتے ہیں		زینتِ دار ہوئے شعر سنانے والے

ہے زد میں تیغ جہل کی ناموس آگہی		کچھ کج قیاس، صاحبِ ادراک ہو گئے

فاختاؤں کا تمسخر توبہ		چیونٹیوں کے بھی بہت پر نکلے

مستحق کو حق نہ دینے اور غیر مستحق کو نوازشات کا مرکز بنانے کے رجحان کے نتیجے میں رشوت، ذخیرہ اندوزی، چور بازاری اور ناجائز اقربا پروری جیسی برائیوں کے جراثیم ہمارے معاشرے کے جسم میں داخل ہو چکے ہیں۔ حقدار کو اس کے حق سے مرحوم کر دینا حقیقت میں ظلم کی بدترین شکل ہے۔ ساغر صدیقی نے ستم کی انتہا کر دینے والے لوگوں کے کردار کو یوں بے نقاب کیا تھا۔

جس دور میں لُٹ جائے فقیروں کی کمائی		اس دور کے سلطاں سے کوئی بھول ہوئی ہے

محسن احسان نے ظلم کی داستان اس طرح بیان کی ہے۔

کسی غریب، اپاہج فقیر کی محسن		کسی امیر نے بیساکھیاں چرالی ہیں

کس باغ سے آئی ہے پلٹ کر، کہ لہو کی		تحریر نظر آتی ہے تتلی کے پروں پر

ظلم کا نتیجہ ہمیشہ مظلوموں کی بربادی کی صورت میں سامنے آتا ہے خزاں کے لگائے ہوئے زخموں سے چُور گلستان کی مسیحائی کے لیے اگر نکہت بار پھولوں کی بجائے صلیبوں کی فصلیں اُگنے لگیں تو ناشگفتہ کلیوں کا کیا مستقبل ہوگا۔ جب ہر بستی اور ہر شہر اشک و آہ کے طوفانوں کی زد میں آ جائے تو یہ بات یقینی ہے کہ ہر طرف ویرانیوں اور سناٹوں کا راج ہوگا۔ پھر نہ تماشا ہوگا اور نہ تماشائی محسن احسان نے انسان نما درندوں کے وحشیانہ مظالم کو نوکِ قلم پر لا کر آشوب نگاری کا حق ادا کر دیا ہے۔ چند اشعار دیکھیں

مورخین لکھیں گے نئی روایتِ شہر
زمیں سے سُولیاں اُگتی رہیں تو ہم نفسو!

کچھ ایسی مُردنی دیوار و در پہ طاری تھی
فضا میں گونجتے تھے بستیوں کے سناٹے

اب یہاں کوئی تماشا نہ تماشائی ہے
دل کی بستی میں تم آئے ہو تو کیا پاؤ گے

ہر حسّاس شاعر کی طرح محسن احسان بھی اپنے پہلو میں ایک دل دردمند رکھتے ہیں وہ انسانوں کو ظلم و نفرت کا نشانہ بنتے ہوئے نہیں دیکھ سکتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی آنکھ میں آنسو نہ ہوں اور کسی کے خوابوں کا آئینہ ریزہ ریزہ نہ ہو۔ فرماتے ہیں

اور کسی کا نہ کوئی خواب ہو ریزہ ریزہ
دل یہ کہتا ہے کہ ہر آنکھ کا آنسو پی لوں

پیمانوں میں سب تن کا لہو بھر گئے ہم بھی
یاروں کو شکایت تھی بہت تشنہ لبی کی

ہم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے نہ صرف اپنی بلکہ اقوام عالم کی نظروں میں بھی ذلیل و رسوا ہو چکے ہیں۔ اگر ہم اس رسوائی کے اسباب پر غور کریں تو ہمیں یہ بات بخوبی سمجھ میں آ جائے گی کہ ایک مسلم قوم کے افراد ہونے کے حوالے سے ہم اپنی ذمے داریاں بھلا بیٹھے ہیں۔ اسی مجرمانہ تغافل سے ہمارا تہذیبی تشخص تباہ ہو کر رہ گیا ہے۔ ہم نے اسلامی تہذیب کی اعلیٰ اقدار کو چھوڑ کر مغرب کو اپنا قبلہ و کعبہ بنالیا ہے۔ اس کج روی کے ہم خود ذمے دار ہیں جنہیں اپنی منزل مقصود کی خبر نہیں ہمیں اپنے چراغ خانہ کی بجائے پرائی شمعوں کی چمک دمک زیادہ اچھی لگتی ہے۔ ہم اسلاف کی عظیم روایات کو پس پشت ڈال چکے ہیں۔ ہمارے دل حرص و ہوس کی آماجگاہ بن گئے ہیں۔ اور وہ دستِ ہنر شل ہو گئے ہیں جنہوں نے قصرِ اخلاق کے بام و در مزین کیے تھے۔ توقیر نجابت داؤ پر لگادی گئی ہے۔ ہم دُنیاداری کے نشے میں اس قدر بدمست ہوئے ہیں کہ ہمیں یہ بھی یاد نہیں رہا کہ ہم نے گور وکفن کا مرحلہ بھی طے کرنا ہے اور ایک دن اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب بھی دینا ہے۔ آئین خداوندی سے روگردانی نے ہمیں عظمت کردار سے

عاری کر دیا ہے۔ ہم نتائج سے بے نیاز ہو کر، آنکھیں بند کر کے تباہی کے دہانے پر پہنچ چکے ہیں۔ ہمیں خبر ہی نہیں کہ ایک سیل بلا ہمارے تعاقب میں ہے۔ محسن احسان کو مسلمانوں کی تہذیبی اقدار کا زوال خون کے آنسو رُلاتا ہے۔ ان کی دلی کیفیات کا عکس درج ذیل اشعار میں بہ تمام و کمال نظر آتا ہے۔

ضمیر بے ضمیراں اور دل بیمار رکھتے ہیں ہمارا حال ہے محسن یہ اب اقوام عالم میں

اگر عزیز ہے محسن چراغِ خانہ ہمیں نگاہ پڑتی ہے پھر کیوں پرائی شمعوں پر

وہی دستِ ہنر شل دیکھتے ہیں مزین جس نے بام و در کیے تھے

روایتیں ہی گلستاں کی پھونک ڈالی ہیں خود اپنے آپ سے کد اس قدر ہمیں ہے کہ سب

کہ ہم نے سینوں میں تاریکیاں اُگالی ہیں ہمارے دل ہیں اب آماجگاہِ حرص و ہوس

اب عزت سادات گنہ گار بچائیں داؤ پہ لگا دی گئی توقیر نجابت

ہم مرحلۂ گور و کفن بھول گئے ہیں دستار میں کچھ نشۂ پندار ہے اتنا

جوئے شیریں کا خنک آب بھی کھاری نکلا ہر کوئی عظمتِ کردار سے عاری نکلا

اب اس گھر کو مقفل دیکھتے ہیں وفا جس کے دریچوں میں کھڑی تھی

ہم اپنی منزل مقصود سے نہیں آگاہ نہ دشمنوں کی خطا ہے نہ دوستوں کا گناہ

فقط زباں پہ رہا لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہ دلوں میں حرفِ محبت کبھی اُتر نہ سکا

ہماری قوم کی ذہنی تربیت اگر اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیادوں پر کی جاتی تو مادی و روحانی

بحران ہمارا قومی تشخص تباہ نہ کرتے۔ قیام پاکستان کے فوراً بعد اگر اسلامی نظام نافذ کر دیا جاتا تو قوم یقیناً استحکام پاکستان کی منزل پا لیتی لیکن بوجوہ ایسا نہ ہوا۔ جب مکان کی بنیاد ہی غلط پڑی ہو تو دیواروں کا ٹیڑھا ہونا غیر فطری بات نہیں۔

محسن احسان کے خیال میں ہمیں بحیثیت قوم اپنی غلطیوں کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہیے۔ یہی حقیقت پسندی اور بہادری ہے۔ حق آشنا اور زندہ قوموں کا یہی دستور ہوا کرتا ہے۔ حق کی حمایت اور باطل کی مذمت ضمیر کی بیداری کی علامت ہے۔ محسن کو یقین ہے کہ ہماری سرکشیدہ و عقائد دریدہ قوم اگر ارشادات خداوندی پر صدق دل سے عمل پیرا ہو جائے تو اس کے خدا سے کشیدہ تعلقات خوشگوار مراسم میں تبدیل ہو جائیں۔ اشعار ملاحظہ ہوں

بُنیادِ مکاں غلط پڑی ہے ــــ دیوار ہر ایک کج کھڑی ہے

عدو کے سامنے اپنی شکست مان گیا ــــ بری طرح کا بہادر کوئی نہیں ہے کہ میں

ایسا کوئی تو ہو جسے ہم زندہ کہہ سکیں ــــ تخلیق و آگہی کا نمائندہ کہہ سکیں

میں نے ہر سچ کی حمایت کی ہے ــــ مجھ سے شرمندہ نہیں میرا ضمیر

مرے خُدا مرا سب کچھ تری پناہ میں ہے ــــ میں سرکشیدہ، عقائد دریدہ ہوں لیکن

ہیں کیوں خدا سے کشیدہ تعلقات نہ پوچھ ــــ خدا کی رحمتِ پیہم کے باوجود اپنے

محسن احسان کبھی کبھی متصوفانہ افکار کو بھی بڑے فلسفیانہ انداز سے شعری قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر ہم چشم بصیرت سے دیکھیں تو ہمیں بیج میں درخت اور حباب میں دریا دکھائی دے گا۔ یعنی جزو کا مشاہدہ کُل کی حقیقت کی سمت نمائی کرتا ہے لیکن شکوک اور اوہام کی غبار آلود فضا میں ''کُل'' کا چہرہ نظر نہیں آتا۔ اگر انساں کو اپنی ذات کا عرفاں نصیب ہو جائے تو تلاشِ خُدا مشکل نہیں ہوتی۔ اسے اگر اپنے ''احسنِ تقویم'' وجود کا ادراک ہو جائے تو وہ

بلندیوں پر رہنے والے خُدا کو اپنی شاہرگ سے بھی قریب پاتا ہے۔ انسان کو ذات کے آئینہ خانے میں جب پرتو آئینہ گر نظر آ جائے تو قیاسات کی گرد چھٹنے لگتی ہے اور معمۂ ہست و بود سمجھ میں آنے لگتا ہے۔ بقول محسن احسان

سفر گزیدہ ! غبارِ سفر سے باہر آ ۔۔۔ چھٹے جو گرد تو میں تیری شکل پہچانوں

مرے قریب تو آ، میں بھی ایک دُنیا ہوں ۔۔۔ بلندیوں سے مری سمت دیکھنے والے

کچھ اور روز اگر اپنی جستجو کرتے ۔۔۔ پھر اس کے بعد تلاشِ خُدا نہ تھی مشکل

گر آئینے میں پر تو آئینہ گر نہ ہو ۔۔۔ اسرار کائنات بشر پر نہ کھُل سکیں

روحانی زوال ہو یا مادّی احتیاجات درماندگی و پسماندگی، قوم کے جمیع آلام، مصائب اور حوادث محسن احسان کے لیے باعثِ صدا ذیت وکُلفت ہیں لیکن انہوں نے حوصلہ شکن حالات کے اندھیروں میں رجائیت کی مشعلیں روشن کر رکھی ہیں۔

ان کی جواں ہمتی اور اولوالعزمی انہیں مایوس نہیں ہونے دیتی ان کے کلام میں جابجا جرأتوں اور حوصلوں کو بڑھانے والے پیغامات قاری کو زندگی کی ناہموار پگڈنڈیوں پر ثابت قدم رہنے کا درس دیتے ہیں۔ محسن کے نزدیک پرندہ خواہ پرشکستہ ہی کیوں نہ ہو اس کا شوقِ پرواز ختم نہیں ہونا چاہیئے۔ اُمید کے چراغوں کو جلتے رہنا چاہئے اُس وقت تک جب تک شبِ غم ڈھل نہ جائے اور صبح کے اُجالے کائناتِ زندگی میں نہ در آئیں۔ حالات کتنے ہی نامساعد کیوں نہ ہوں اور آب و ہوا کتنی ہی ناموافق کیوں نہ ہو، بیج اگر جرأت نمو کرلے تو اسے سبز رُتوں کی بشارتیں مل سکتی ہیں۔ محسن احسان کے زندگی کی حرارتوں سے لبریز چند اشعار ملاحظہ فرمائیں

اگر رُکوں تو کنارا، چلوں تو دریا ہوں ۔۔۔ میں ایک عمر کے بعد آج خود کو سمجھا ہوں

ٹوٹے کوئی ستارہ تو مشعل بنائیں ہم ۔۔۔ تاریکیوں میں گزرے گی تا چند زندگی

سوادِ دل میں ہے مایوسیوں کا سناٹا ۔۔۔ مگر یہیں کہیں اُمید کی شعاع بھی ہے

دیکھ میری بُلند پروازی ۔۔۔ اُڑ رہا ہوں شکستہ پر لے کر

کسی خورشید کی اُمید میں ہم ۔۔۔ چراغوں کو مسلسل دیکھتے ہیں

کس میں تھی تابِ دردِ ہجر کس میں تھا غم کا حوصلہ ۔۔۔ ہم ہی یہ دُکھ اُٹھا گئے، ہم ہی یہ درد سہہ گئے

ہم سفرانِ شوق نے راہ میں ہار مان لی ۔۔۔ دشتِ شبِ فراق میں، ہم ہی اکیلے رہ گئے

خدا کا شکر ہے محسنؔ کہ اب مرا بیٹا ۔۔۔ قدم ملا کے میرے ساتھ ساتھ چلنے لگا

مجھے میں ساحلِ اُمید پر بھی دیکھ سکوں ۔۔۔ مکینِ دیدۂ تر! چشمِ تر سے باہر آ

سرور عالم راز سرور (امریکہ)

شہریار کی غزل

کنور اخلاق محمد خاں شہریارؔ (ولادت: ۱۶ جون ۱۹۳۶ء۔ وفات: ۱۳ فروری ۲۰۱۲ء) کا شمار دورِ حاضر کے مشہور اور جانے پہچانے شعرا میں کیا جاتا ہے۔ شہریار نے اپنی شاعری سے اُردو ادب میں ایک نمایاں اضافہ کیا ہے۔ اب تک ان کے کلام کے پانچ مجموعے (اسم اعظم، ساتواں در، ہجر کے موسم، خواب کا دَر بند ہے، نیند کی کرچیں) شائع ہو چکے ہیں جن میں شہریارؔ کی غزلیں، پابند نظمیں، آزاد نظمیں اور نثری نظمیں شامل ہیں۔ ان پانچوں کتابوں پر مشتمل اُن کا کلیات ''حاصل سیر جہاں'' ۲۰۰۱ء میں منظر عام پر آ کر اہل فکر ونظر سے خراج تحسین وصول کر چکا ہے۔ شہریار علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے شعبۂ اُردو میں پروفیسر اور صدر کے عہدے پر فائز تھے اور ملازمت سے سبک دوش ہو کر انھوں نے علی گڑھ میں ہی سکونت اختیار کر لی تھی۔ میرے بڑے بھائی محمود عالم راز مرحوم (سابق پروفیسر وصدر شعبۂ معاشیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) سے اُن کے بہت قریبی مراسم تھے۔ میں جب بھی علی گڑھ جاتا تو محمود بھائی یا تو شہریارؔ صاحب کو اپنے مکان پر مدعو کرتے یا شہریارؔ صاحب اپنے فلیٹ پر مجھ کو بلوا لیتے تھے۔ اس طرح مجھ کو بارہا اُن کی ملاقات اور صحبت سے مستفید ہونے کا موقع ملا۔ ایسی ہی ایک ملاقات پر انھوں نے اپنے کلیات ''حاصل سیرِ جہاں'' کا ایک نسخہ یکم دسمبر ۲۰۰۸ء کو مجھے عنایت کیا تھا۔ زیرِ نظر مضمون اسی کتاب پر مبنی ہے۔

غزل اُردو شاعری کی مقبول ترین صنف سخن ہے اور یہ جتنی مقبول ہے اسی قدر مشکل اور صبر آزما بھی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا لیتی ہے اور پھر ایک محبوبۂ طناز کی طرح اُس کو طرح طرح کی آزمائشوں اور مختلف قسم کے تقاضوں سے پریشان کر دیتی ہے۔ اس کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ کوئی شاعری کرے اور غزل گوئی سے دامن بچا کر بالا

ہی بالا نکل جائے۔ چنانچہ جس شخص نے بھی میدان شاعری میں قدم رکھا اس نے غزل کے دربار میں حاضری ضرور دی ہے۔ اُردو غزل چاہے بقول کلیم الدین احمد صاحب ''نیم وحشی صنف سخن'' یا بقول رشید احمد صدیقی صاحب ''اُردو شاعری کی آبرو'' ہو یا نہ ہو بہرکیف گونا گوں اور متضاد صفات سے متصف ضرور ہے۔ یہ اپنی سرشت میں نرم خو، بامروت، دوستدار اور رحم دل ہے۔

شہریار کے کلیات ''حاصل سیر جہاں'' میں اُن کے کلام کے پانچوں مطبوعہ مجموعے شامل ہیں۔ اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا پہلا مجموعۂ کلام ''اسم اعظم'' ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا اور آخری مجموعہ ''نیند کی کرچیں'' 1995ء میں منظر عام پر آیا جب کہ موصوف کا انتقال ۲۰۱۲ء میں ہوا۔ حالانکہ ''حاصل سیرِ جہاں'' سے اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا ہے لیکن گمان اغلب یہی ہے کہ اُنھوں نے آخری مجموعہ کی اشاعت سے وفات تک کے سترہ سالہ عرصہ میں فکر سخن جاری رکھی ہو گی۔ اس طرح ان کی شاعری کی عمر کم وبیش پچاس سال پر محیط ہے۔ عام طور سے اتنی طویل مدت کی شاعری کے مطالعہ سے شاعر کے ذہنی اور شعری ارتقا کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اکثر اس کی شاعری کو مختلف اُدوار میں تقسیم کرنا بھی ممکن ہوتا ہے۔ لیکن ''حاصل سیر جہاں'' کا بالاستیعاب مطالعہ اس ضمن میں قاری کو مایوس کرتا ہے۔ شہریار کا عام رنگ تغزل، طرز زبان و بیان، واردات وخیالات اور جذبات واحساسات جیسے ان کے شروع کے کلام میں ملتے ہیں وہی کم وبیش ان کے آخری زمانے کی غزلوں میں بھی نظر آتے ہیں۔ قاری اگر زبان و بیان ومضامین کی اس یکسانیت کی منزل ہفت خواں سے صبر واستقلال کے ساتھ گزر جائے تو بھی وہ اُن کی شاعری کو مختلف اُدوار میں تقسیم نہیں کر سکتا اور اس طرح وقت اور حالات کے ساتھ اُن کے شعری وذہنی ارتقا کی شناخت کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ چنانچہ یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وقت اور حالات کیساتھ ان کی شعر گوئی میں اگر فرق آیا تو کیا فرق آیا؟ ظاہر ہے کہ جب اس ''کیا'' کا جواب ہی ممکن نہیں ہے تو پھر ''کیوں'' کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ شہریار نے اپنے آخری مجموعے ''نیند کی کرچیاں'' کی چند غزلیات میں دیسی اور بدیسی الفاظ کو ملا کر نئی اور غیر مانوس

تراکیب گھڑنے کی مختصر سی کوشش کی ہے جو دیگر مجموعوں میں ناپید ہے۔ ان کی اس کوشش پر اظہار خیال آگے چل کر کیا جائے گا۔

''حاصل سیر جہاں'' پر ایک سرسری نظر یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ شہریارؔ کے یہاں غزل کے عام اور روایتی مضامین کا تقریباً مکمل فقدان ہے۔ بہار و خزاں کا قصۂ پارینہ، گل و بلبل کے افسانے، قیس و فرہاد کی داستان، رموز حیات و ممات، ہجر و وصال کی کہانی، معاملات حسن و عشق اور ایسے ہی دوسرے مضامین جو ہمیشہ اُردو غزل کا سرمایہ رہے ہیں اُن کے یہاں بہت اہتمام و التزام سے نظر انداز کر دیے گئے ہیں اور اگر نظر بھی آتے ہیں تو ان کی حقیقت ''برسر راہے'' سے زیادہ نہیں ہے۔ یہ کیفیت شہریارؔ کی سوچی سمجھی اور شعوری کوشش کا نتیجہ معلوم ہوتی ہے ورنہ اُن کی غزلیہ شاعری کے کسی نہ کسی لمحہ میں ان خیالات و مضامین کا غیر شعوری طور پر نظم ہو جانا ناگزیر تھا۔ اس خیال کو مزید تقویت اس بات سے بھی ملتی ہے کہ اُن کی نظموں میں ایسے مضامین کے اشارے جا بجا ملتے ہیں

شہریارؔ کی غزل میں یاس و نا اُمیدی، حرماں نصیبی، زندگی سے بیزاری اور حزن و ملال کا عنصر بہت نمایاں ہے۔ ان کی شاعری کا لب و لہجہ ایک چوٹ کھائے ہوئے بلکہ کم و بیش ایک شکست خوردہ انسان کا لب و لہجہ ہے۔ جس کو زندگی اور دنیا سے اگر بھولے بھٹکے کچھ مل بھی گیا ہے تو وہ ایسا قابل اعتنا نہیں ہے کہ اس کا ذکر کیا جائے۔ ان کی غزل میں محرومی کا احساس و ذکر، زندگی کی غیر منصفانہ رَوِش کا شکوہ، دُنیا کے صبر آزما مسائل کا ماتم اور اپنی نامرادیوں کا نوحہ بہت دکھ بھری زبان و لہجہ میں قدم قدم پر نظر آتا ہے۔ اگر اُن کی غزل کی شناخت اسی حزن و ملال اور احساس نامرادی کو قرار دیا جائے تو مطلق بیجا نہیں ہوگا۔ وہ سراپا رنج و الم کی تصویر ہیں اور یہی قنوطیت ان کی غزل گوئی کا سرمایہ بھی ہے اس رنگ کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

دل دھڑکنے سے خفا ہے اور آنکھیں نم نہیں پیچھے مڑ کر دیکھنے کی یہ سزا کچھ کم نہیں

ایک پل دو قدم کا ساتھ ہی کیا اَب کھلا سایے کی حیات ہی کیا

سیکڑوں خوابوں کی ضرب ☆ تقسیم — اس کا حاصل رہے گی رات ہی کیا
کچھ تمنائیں ، چند پچھتاوے — ہم سے لوگوں کی کائنات ہی کیا

اب تو لے دے کے یہی کام ہے ان آنکھوں کا — جن کو دیکھا نہیں اُن خوابوں کی تعبیر کریں

میں اُس کو دیکھ کے آنکھوں کا نور کھو بیٹھا — یہ زندگی مری آنکھوں سے کیوں نہاں نہ رہی

شہریار اپنا دُکھ درد اتنے نرم اور سبک لہجہ میں ادا کرتے ہیں کہ قاری کو کسی وقت بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ اُن کی آواز تند یا تلخ ہوگئی ہے، البتہ لگتا ہے اُس میں ہلکا سا طنز اور بیزاری ضرور جھلکتے ہیں۔ اسی لب ولہجہ کی وجہ سے اُن کی آواز میں آفاقیت پیدا ہوگئی ہے اور ہر صاحبِ دل ان کی آواز میں اپنی آواز ملانے پر مائل ہو جاتا ہے گویا ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کا ہر غم خود اپنا غم بن گیا ہو۔ اس طرح اُن کی غزل کے ایسے اشعار مولانا سیماب اکبرآبادی کے اس شعر کی تفسیر ہو جاتے ہیں:

کہانی اپنی رُودادِ جہاں معلوم ہوتی ہے — جو سُنتا ہے اُسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

اس مرحلہ پر قاری کے دل میں اس تجسس کا پیدا ہو جانا عین اقتضائے فطرت ہے کہ شہریار کی غزل کا یہ دَرد کہاں سے اور کیوں اُن کی زندگی میں در آیا ہے؟ یہ تلاش عام طور سے شاعر کی زندگی سے ہی شروع ہوتی ہے۔

ہر شاعر کی شاعری پر اُس کی زندگی کے نشیب و فراز اور ماحول کی مہر لگی ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں ہے کہ شاعر کا ذاتی، خانگی، علمی اور سماجی منظر نامہ اس کے تخلیقی عمل کو بہت بڑی حد تک متاثر کرتا ہے اور اس کے کلام کی صورت گری کرنے میں اور اُس میں رنگ آمیزی میں نمایاں اور اہم کردار ادا کرتا ہے۔ شاعری جذبات و احساسات، تجربات و مشاہدات

☆ 'ضرب' رکا متحرک نظم کیا جانا محلِ نظر ہے (ادارہ)

اور حادثات و سانحات کے خوبصورت اظہار کا نام ہے۔ شاعر عموماً فطری طور پر زیادہ حساس اور رقیق القلب بھی ہوتا ہے چنانچہ اس کا اپنی زندگی اور ماحول سے اثر قبول کرنا عین اقتضائے فطرت ہے۔ شہریارؔ خالصتاً ایک شاعر تھے۔ میرے علم کی حد تک انھوں نے نثر میں کوئی قابلِ ذکر کام انجام نہیں دیا ہے اور اُن کی کوئی نثری ادبی تحریر میری نظر سے آج تک نہیں گزری ہے۔ چنانچہ ایک شاعر کی حیثیت سے وہ اپنے حالات و ماحول سے کٹ کر نہیں رہ سکتے تھے۔ اگر ان کے غزلیہ کلام کا جائزہ اور تجزیہ ان کے ذاتی حالات اور سماجی ماحول کے پس منظر میں کیا جائے تو ان کی شاعری کے محرکات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اُن کی شاعری کے عمومی المیہ رنگ و انداز کے اسباب کی جانب بھی اشارے مل سکتے ہیں۔

شہریارؔ کی ساری زندگی خاندانی اور خانگی مجبوریوں، ذاتی محرومیوں اور تنہائیوں سے عبارت رہی۔ انھوں نے اوائل عمر میں ہی خاندانی اختلافات کی وجہ سے گھر چھوڑ دیا تھا اور پھر وہ زندگی بھر واپس نہیں گئے۔ ان کی ازدواجی زندگی بھی انتہائی نشیب و فراز کا شکار رہی اور ان کی عمر کے آخری چند سال تنہائی کے عالم میں ایک مختصر سے فلیٹ میں گزرے۔ اس طرح ان کی زندگی میں سکون و اطمینان اور آسودگی کے لمحات بہت ہی کم آئے۔ گھر والوں سے، خصوصاً والدین اور بھائی بہنوں سے کچی عمر میں ایسا مکمل انقطاعِ تعلق اور اس پر مستزاد اُن کے بے تحاشہ نا مساعد ذاتی حالات ایسے کربناک سانحے ہیں جن کے منفی اثرات کا اندازہ لگانا اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک خود کو بھی ایسے ہی کسی سانحہ سے نہ گزرنا پڑا ہو۔ زیادہ سے زیادہ یہ کیا جا سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے دوسرے الم ناک سانحات کی روشنی میں شہریارؔ کے کرب و اذیت کا اشارہ تلاش کیا جائے اور پھر اُن کے کلام کو اس سلسلہ میں رہنما بنایا جائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے اگر اُن کا غزلیہ کلام دیکھا جائے تو جس ذہنی اور قلبی اذیت کا وہ شکار رہے اس کا اظہار مختلف طریقوں سے جا بجا نظر آتا ہے اور دل کو ملول کر جاتا ہے۔ جس جسمانی اور ذہنی ''خانہ بدوشی'' کا وہ عمر بھر شکار رہے اس کی اذیت ان کے متعدد اشعار میں مختلف حوالوں سے نظر آتی ہے:

اس ہتھیلی میں بہت سی دستکیں روپوش ہیں　　　اس گلی کے موڑ پر اک گھر تھا کل تک، کیا ہوا

شہر جنوں میں کل تلک جو بھی تھا سب بدل گیا　　　مرنے کی خو نہیں رہی جینے کا ڈھب بدل گیا
ساعت خوب وصل کی آنی تھی آ نہیں سکی　　　وہ بھی تو وہ نہیں رہا میں بھی تو اب بدل گیا
میرے سوا ہر ایک سے دنیا یہ پوچھتی رہی　　　مجھ سا جو ایک شخص تھا پتھر میں کب بدل گیا

اسی اُمید پر ہم آج تک بھٹکتے ہیں　　　ہر ایک شخص کا کوئی ٹھکانہ ہوتا ہے

شہر اُمید حقیقت میں نہیں بن سکتا　　　تو چلو اس کو تصور ہی میں تعمیر کریں

کیسا ماضی تھا کیا ہے حال اپنا　　　دیکھنا تھا ہمیں زوال اپنا
اور بھی ہو گئے ہیں ہم تنہا　　　اک ذرا آیا تھا خیال اپنا

اور جب گلی کے موڑ کا وہ گھر نظر نہیں آتا اور اُن کا شہر اُمید حقیقت سے نا آشنا رہ جاتا ہے تو وہ انتہائی کرب سے یہ کہہ کر خاموش ہو جاتے ہیں

عمر کا باقی سفر کرنا ہے اس شرط کے ساتھ　　　دھوپ دیکھیں تو اسے سایے سے تعبیر کریں
آئینے دھندلے ہوئے ماضی کے　　　آنسوؤں سے انھیں دھو دیکھتا ہوں

جذبات کی یہ صداقت اور بیان کی یہ سلاست شہریار کی شاعری کا طرہ امتیاز کہی جا سکتی ہے۔ اُن کی اچھی شاعری وہی ہے جس میں ان کا غم زندگی، احساس محرومی اور غم دُنیا قاری کے دُکھ درد سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ اس سے جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو ہم ''از دِل خیزد، بَر دِل ریزد'' سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہ طرز سخن اُن کی شاعرانہ مطلب برآری کا ضامن بھی ہے اور اُن کی شاعرانہ مشکلات کا باعث بھی شہریار علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں اُردو کے پروفیسر تھے۔ زبان و بیان کے

تمام رموز سے وہ بخوبی واقف تھے۔ ان کی عام بات چیت میں بھی سادہ بیانی کا وہ التزام نہیں تھا جو ان کی غزلوں کا خاصہ ہے۔ اُردو اور فارسی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اہل فکر و نظر جانتے ہیں کہ اچھی اُردو شاعری کے لیے تھوڑا بہت فارسی کا علم لازمی ہے۔ چنانچہ اُردو میں غزلیہ شاعری کرنا اور فارسی الفاظ و تراکیب سے مکمل احتراز برتنا کسی طرح بھی ممکن نہیں ہے۔ شہریار بھی فارسی الفاظ و تراکیب سے مکمل پرہیز نہیں کر سکے ہیں اور انھوں نے جابجا (طوعاً و کرہاً) فارسی الفاظ و تراکیب کا استعمال کیا ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ ایسے الفاظ اور تراکیب اُن کی پہلی ترجیح نہیں معلوم ہوتے بلکہ اُن کی مجبوری محسوس ہوتے ہیں۔

شہریار کی سادہ بیانی کا مثبت پہلو یہ ہے کہ آج وقت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ شاعری کو آسان کیا جائے۔ فی زمانہ اُردو کا معیار و مذاق جس طرح شکست و ریخت کا شکار ہو رہا ہے اس کے پیش نظر کیا شاعر اور کیا قاری سب ہی آسان بیانی کی جانب مائل ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی اُردو شاعری کے ہر دور میں عام فہم انداز میں شاعری کرنے والے نظر آتے ہیں اور کچھ شاعروں نے تو اس فن میں کمال حاصل کر دکھایا ہے۔ میر تقی میر کی سلاست و بلاغت کا تو ایک زمانہ قائل ہے۔ ان اشعار سے کون ناواقف ہے؟

کہا میں نے کتنا ہے گل کا ثبات	کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے	دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

صبح تک شمع سر کو دُھنتی رہی	کیا پتنگے نے التماس کیا

زبان کی یہ سادگی اور بیان کی یہ بے ساختگی میر سے مخصوص ہے اور اُن کے ساتھ ہی ختم ہو گئی لیکن شہریار کے یہاں بھی سادہ بیانی اور لطافت زبان نظر آتی ہے۔ اُن کی چھوٹی بحر کی غزلوں میں خصوصاً سادہ اور اثر انگیز اشعار ملتے ہیں۔ یہ کہنا غلط نہیں ہے کہ اُن کے شاعرانہ جوہر چھوٹی بحروں

میں ہی زیادہ نمایاں ہیں۔ خدا معلوم انھوں نے ایسی بحروں کی جانب قرار واقعی توجہ کیوں نہ کی اور صرف چند چھوٹی بحروں کی غزلوں پر ہی کس لیے اکتفا کیا۔ بہر کیف اُن کے یہاں ایسے اشعار کی کمی نہیں ہے جو جذبات اور احساسات کی شدت سے مملو ہیں لیکن یہ شدت کبھی ایسی تند و تلخ نہیں ہوتی کہ کانوں کو بُری معلوم ہو۔ شہریار بہت نرم لب ولہجہ میں اپنی بات کہنے کے عادی ہیں۔ عام طور پر چھوٹی بحریں اس انداز تغزل کے لیے زیادہ موزوں ہوتی ہیں لہٰذا اُن کے کلام میں بھی یہ صورت نظر آتی ہے۔

ماہ و انجم رہے غمیں شب بھر　　کوئی روتا رہا کہیں شب بھر
اس کے وعدے کا ذکر کیا کیجے　　آہٹیں گونجتی رہیں شب بھر
غم سے گھبرا گئے تو پرسش کو　　کتنی پرچھائیاں اٹھیں شب بھر
آس کا در، اُمید کا دامن　　وحشتیں دیکھتی رہیں شب بھر

کاش پوچھے یہ چارہ گر سے کوئی　　کب تلک اور یونہی ترسے کوئی
کون سی بات ہے جو اُس میں نہیں　　اُس کو دیکھے مری نظر سے کوئی
سچ کہے سن کے جس کو سارا جہاں　　جھوٹ بولے تو اس ہنر سے کوئی

اسی ہلکے پھلکے انداز اور سیدھی سادی زبان میں انھوں نے اچھی شاعری کی ہے۔ اُن کے یہاں آپ بیتی اور جگ بیتی کے درمیان حد فاصل یا تو معدوم ہو کر رہ گئی ہے یا نہایت کمزور ہے۔ مثال کے لیے چند اشعار دیکھیے۔

عمر بھر دیکھا کیے اس کی طرف یوں جیسے　　سارے عالم کی حقیقت نگہ یار میں ہے

دل ترک تعلق پہ بھی آمادہ نہیں ہے　　اور حق بھی ادا اُس سے وفا کا نہیں ہوتا

ساری دنیا کے مسائل یوں مجھے درپیش ہیں　　تیرا غم کافی نہ ہو جیسے گزر اوقات کو

قطرۂ اشک سے آنکھوں کا بھرم باقی ہے چھین لے جائے نہ اس کو بھی ہوا دُنیا کی

تم کہو زیست کو کس رنگ میں دیکھا تم نے زندگی اپنی تو خوابوں کی امانت نکلی

شہریار نے اپنی غزلیہ شاعری کے توسط سے ہم سب کو اپنی زندگی کی مایوسیوں اور اس کے تجربات و مشاہدات کی بھول بھلیوں میں ساتھی بنانے کی کوشش کی ہے۔ اُن کی غزل وہی ماضی کا ایک آئینہ ہے جس کی دھندلاہٹ کو انھوں نے جا بجا اپنے آنسوؤں سے دھو کر ہلکا کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس آئینے کو توڑنے کے قائل نہیں ہیں

وحشتِ دل تھی کہاں کم کہ بڑھانے آئے کس لیے یاد ہمیں بیتے زمانے آئے

ہر طرف اپنے کو بکھرا پاؤ گے آئینوں کو توڑ کر پچھتاؤ گے

فارسی الفاظ وتراکیب سے پرہیز نے ان کو آسان اور سیدھی سادھی زبان استعمال کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ یہ زبان غزل کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکی ہے اور نہ ہی کر سکتی ہے۔

آنچ پھولوں پہ نہ آنے دے مگر خس و خاشاک کو جل جانے دے
چھا رہی ہیں جو مری آنکھوں پر ان گھٹاؤں کو مچل جانے دے

ایسی بارش تو کئی بار ہوئی تھی پہلے کیا غضبناک ہوا تھا کبھی دریا ایسا

جہاں اشلوک پڑھتی اجنبی پرچھائیاں دیکھو وہیں ان کشتیوں سے خواب کی تم سب اُتر جانا

گزرا تھا رات بھی کوئی "دریالبوں" کے پاس سے کتنی عجیب پیاس تھی کم تو ہوئی بجھی نہیں

یہاں تو زخم کے پہرے بٹھائے تھے ہم نے شمیم زلف یہاں کیسے باریاب ہوئی
ہزار پرسش غم کی مگر نہ اشک بہے صبا نے ضبط یہ دیکھا تو لاجواب ہوئی

غم میں دُبلے ہیں تمھارے جو لوگ　　اُن کے سائے سے بھی بچنا یارو

یہ بات قابل غور ہے کہ ان کی چھوٹی بحروں کی غزلیں نسبتاً طویل (آٹھ دس اشعار) ہیں اور اپنی دلکشی اور معنی آفرینی سے یہ غزلیں اُن کی شاعری کو وقار بخشتی ہیں۔ اوپر ایسی غزلوں کے چند اشعار دیے جا چکے ہیں۔ چند اشعار اور یہاں مزید پیش خدمت کیے جاتے ہیں:

شب غم کیا کریں، کیسے گزاریں　　کسے آواز دیں، کس کو پکاریں
سربام تمنا کچھ نہیں ہے　　کسے آنکھوں سے اس دل میں اُتاریں
وہی مبہم سی سر گوشی ہوا کی　　وہی افسردہ شمعوں کی قطاریں
کہاں تک یادِ غمخواری کرے گی　　کہاں تک زلفِ تنہائی سنواریں

منظر دیدہ و دِل بدلا ہے　　مدتوں بعد تجھے دیکھا ہے
یہ تو طے ہے کہ سفر کرنا ہے　　یہ نہیں طے ہے کدھر جانا ہے
کارِ دنیا مجھے مہلت تھوڑی　　کارِ دل، کارِ جنوں کرنا ہے

کچھ ناقدین نے شہریار کی غزل میں بحروں کے تنوع کا ذکر کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے ''نیند کی کرچیں'' کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ ''اب اُن کے یہاں بحروں کا تنوع تو ہے بلکہ بعض جگہ تو وہ عروض کے سخت قاعدوں کو تھوڑا نرم کرنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں لیکن آہنگ میں مزید تنوع لانے کے لیے انھیں زبان میں بھی تنوع لانا ہوگا۔ انھوں نے جان بوجھ کر فارسی تراکیب اور نسبتاً نامانوس الفاظ سے گریز کیا ہے تو اس کا بدل مروج زبان میں تھوڑی بہت توڑ پھوڑ کی صورت میں انھیں حاصل کرنا چاہیے۔''

اس تجزیہ کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ مجموعی اعتبار سے شہریار کی غزل اچھی اور دلکش ہے اور اپنے انداز بیان میں عام فہم بھی ہے اور دلپذیر بھی۔ اگر وہ فارسی الفاظ و تراکیب سے احتراز کو

ضروری نہ جانتے تو نہ صرف ان کے یہاں بیان کی وہ یکسانیت نہ ہوتی جواب ہے بلکہ ان کے مضامین میں بھی وہ تنوع پیدا ہو جاتا جو اپنی سرشت میں بیان کے تنوع کا بھی متقاضی ہوتا ہے۔ یہاں شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کا ایک جملہ دہرانا بے جا نہیں ہے جو انھوں نے ''نیند کی کرچیں'' کے پیش لفظ میں لکھا ہے ''شہریار جیسی شاعری کہنے کے لیے بھی اور پڑھنے کے لیے بھی خاص مشق اور تفکر درکار ہے۔''

ایک اور دلچسپ سوال یہ بھی ہے کہ ''کیا ادب میں ایک ایسا پیمانہ ہونا چاہئے جس سے کسی شاعر کی غزل پرکھ کر اُس کا مقام متعین کیا جا سکے؟'' ظاہر ہے کہ ایسا پیمانہ ریاضی کے کسی مسئلہ کی طرح دوٹوک اور ٹکسالی نہیں ہو سکتا اور بہر کیف وہ غزل پڑھنے اور پرکھنے والے کے علم و تربیت اور ذوق شعری پر منحصر ہوگا۔ مختلف لوگ اس پیمانہ پر مختلف شاعروں کو الگ الگ خانوں میں ڈال سکتے ہیں۔ یہ ایسی کوئی عجیب یا قابل اعتراض بات نہیں ہے۔

*****

محمد فیصل مقبول عجز

احمد فراز۔۔۔انسانی رویوں کا نبض شناس شاعر

عہد حاضر کے جن شعرانے اپنے منفرد لب ولہجہ سے اہل علم وادب کا دل موہ لیا اُن میں احمد فراز کا نام سرفہرست ہے۔مجید امجد، حبیب جالب، شہزاد احمد اور ظفر اقبال کا ہم عصر شاعر جس نے جدید وقدیم شعری روایت کو اپنایا اور اپنے ہم عصر شعرا میں اپنی انفرادیت قائم کی۔اس کی شاعری کی جڑیں فارسی شعری روایت سے جڑی ہیں۔فراز نے قدیم شعری روایات کی بھی پاس داری کی اور عصر حاضر کے پیچیدہ مسائل کو بھی شعروں میں پیش کیا۔

فارسی شعرا کے کلام سے عقیدت اور کلام غالب کے دقیق مطالعے نے اس کا تعلق قدیم شعری روایت سے مزید گہرا کر دیا یہی وجہ ہے اس کی شاعری جس دور میں بھی زیر مطالعہ رہے اور کسی بھی عمر کا فرد مطالعہ کرے اسے ان اشعار میں اپنی واردات قلبی کی جھلک محسوس ہوتی ہے۔فراز کا یہ شعری احساس عوام الناس بالخصوص نوجوان طبقہ میں شدت سے محسوس کیا گیا شاید اسی لیے نوجوانوں نے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا۔خدا اور انسان کے ازلی رشتہ، انسان اور کائنات کے تعلق اور انسانی نفسیات کی بہترین نمائیدگی کلام غالب میں ملتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے دور میں شعرا کو متاثر کیا بلکہ ہر دور میں آنے والے شعرا نے اس کی تقلید کی لہٰذا فراز نے بھی اپنے مختلف شعری مجموعوں میں غالب کی مشہور زمینوں پر غزلیں لکھیں۔فراز نے معنی آفرینی اور اثر انگیزی سے ایسا دل کش اور منفرد اسلوب تخلیق کیا جس کی جڑیں فارسی شعری روایت سے بہت گہری اور مستحکم تھیں لیکن اس نے عصر حاضر کے زندہ مسائل کو موضوع بنا کر اپنی شاعری میں زندگی کی نئی لہر پیدا کر دی۔

فراز کی شاعری میں انسانی رویوں اور دلی جذبات کے گہرے مشاہدے کو تجزیاتی انداز میں بیان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ ہر بڑے شاعر کی شاعری میں روایت کا گہرا شعور بھی موجود رہتا ہے اور یہی شعور ہر باذوق شخص کے دل میں گھر کر جاتا ہے۔ فراز نے اپنے ہم عصر شعرا کے شعری اسلوب کو بھی مدنظر رکھا اور اپنے لیے علاحدہ راستہ بھی ڈھونڈ نکالا جس نے اسے ''نوجوان طبقہ کا نمائندہ شاعر'' کہلوایا۔

جب کسی شاعر کی چند غزلیں اس قدر شہرت حاصل کر لیں اور اسے اہل علم وفن میں ایک خاص مقام حاصل ہو جائے تو عوام الناس کے ذہن پر اس کی ایک چھاپ (نوجوان طبقہ کا شاعر) نقش ہو جاتی ہے۔ فراز کی جو غزلیں (پوری شاعری کو مدنظر رکھتے ہوئے) گائی گئیں وہ بے شک بے مثال تھیں لیکن ان کی شعری قد و قامت کا اندازہ صرف اُن سے نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس کے لیے اُن کے مکمل کلام کا مطالعہ ضروری ہے جس کے بعد ہی ہم اُن کے خاص سخن یا اسلوب بیان کے بارے میں کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں۔

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ　　　آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

یہ عالم شوق کا دیکھا نہ جائے　　　وہ بت ہے یا خُدا دیکھا نہ جائے

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں　　　جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

یہ غزلیں اُن کے دوسرے مجموعہ کلام ''دردِ آشوب'' کی ہیں جسے ۱۹۶۶ء میں آدم جی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فراز کے تمام مجموعہ کلام سے اگر صرف غزلیات کا انتخاب کیا جائے تو ان میں بے شمار ایسے ضرب المثل اور لاجواب اشعار ملیں گے جن میں شاعر نے نہ صرف انسانی رشتوں کی اہمیت بلکہ واردات ہجر و وصال کی صحیح معنوں میں عکاسی کی ہے۔

پروین شاکر نے فراز کو اُردو کا پہلا شاعر قرار دیا جس نے عشق کو آسودگی کا تصور بخشا۔ یہ

آسودگی صرف خیال تک محدود نہیں رہتی بلکہ اس کی حدیں جمال اور وصال سے جاملتی ہیں۔ تصورِ عشق معاملات و کیفیات اور حسن و عشق سے عبارت ہے۔ فراز نے اپنے مخصوص اندازِ بیاں سے عشق میں ٹھہراؤ پیدا کرنے کی سعی کی۔ عشق کے تیز بہاؤ کے آگے پل باندھنے کا کام اُس نے حقیقت ہجر و وصال سے لیا۔ فراز کا ایک محبوب ایک منفرد اور جداگانہ حیثیت کا مالک ہے۔ جس میں وصال کی حدت بھی ہے اور فراق کا حوصلہ بھی۔ اس کا تصورِ عشق وصالِ یار کے مرحلوں سے گزر کر ہجر و فراق کی عکاسی کرتا ہے۔ جہاں وصالِ یار سے دل محظوظ ہوتا ہے فراقِ یار کی حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں۔

تو خدا ہے نہ مرا عشق فرشتوں جیسا دونوں انساں ہیں تو کیوں اتنے حجابوں میں ملیں

خود اپنے آپ کو پرکھا تو یہ ندامت ہے کہ اب کبھی اُسے الزامِ بے وفائی نہ دوں

یہی وہ مقام ہے جہاں دلوں کے پردے شق ہو جاتے ہیں اور دل پر آشکار ہونے والی کیفیات کو شاعر شعروں میں ڈھال لیتا ہے۔ فراز کے اشعار میں یہ خاصیت کثرت سے نظر آتی ہے۔ بلاشبہ فراز کی غزل میں تغزل کا پہلو ہم عصر شعرا سے زیادہ پایا جاتا ہے اور ان کی غزلیات میں غنائیت کا عنصر موسیقی کی سمجھ بوجھ کی غمازی کرتا ہے۔ غزلیات میں انسانی جذبوں کی خوشبو محسوس کی جاسکتی ہے۔ فراز اپنی شاعری کے حوالے سے لکھتے ہیں۔ ''فن کار حساس ہوتا ہے اور ہر جذبے کو شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے۔ میں جذباتی ہوں، مرے اندر ہر جذبہ رونا، ہنسنا، محبت کرنا، نفرت کرنا شدت کے ساتھ آتا ہے۔ اس کی کچھ وجہ میرا شاعر ہونا بھی ہے اور کچھ پٹھان ہونا بھی۔ میری شاعری جذبوں کی کیمیا گری ہے۔'' شاعر اپنی شاعری میں جہاں اپنی دلی کیفیات کا اظہار کرتا ہے وہاں معاشرے کے داخلی و خارجی رویوں، زندگی کے نشیب و فراز، کائنات کے حقائق سے پردہ کشائی جیسے موضوعات ہمیشہ اس کے پیشِ نظر رہتے ہیں۔ فراز کی شاعری بھی ان ہی موضوعات کے گرد گھومتی ہے۔

فراز آج کی دنیا مرے وجود میں ہے　　　مرے سخن کو فقط میرا تذکرہ نہ سمجھ

شاعری بالخصوص غزل میں مطلع و مقطع کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ہر بڑا شاعر اپنے کلام میں مطالع کی ہم آہنگی اور ندرت کو مدنظر رکھتا ہے۔ میرؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، داغؔ، اور اقبالؔ کے مطالع آج بھی پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ لفظوں کا چناؤ اور ان کی ہم آہنگی کا کیا معیار پیش نظر رکھا گیا ہے۔ فراز نے اپنی غزلوں میں مطلع کہتے ہوئے ان شعری اصولوں کی پیروی کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی غزل کا پہلا شعر پڑھتے ہی غزل کے موڈ کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

تیری باتیں ہی سنانے آئے　　　دوست بھی دل ہی دکھانے آئے

تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ　　　لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

فراز نے جوانی میں بہت سے عشق کیے جس کا اعتراف بھی کئی بار کیا۔ ہجر و فراق پر بے مثال اشعار کہے ہیں۔ یہ اشعار انسانی تجربات و مشاہدات کا نچوڑ ہیں جن میں لطافت اور موسیقت بہ درجہ اتم موجود ہے۔ معاملاتِ عشق کا برملا اظہار معاملہ بندی کا اظہار بن جاتا ہے جس کی نمایندگی لکھنوی شعرا کے کلام میں ملتی ہے۔ دہلوی شعرا بالخصوص غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ اور ذوقؔ کے ہاں معاملات عشق کو پردے میں رہ کر بیان کرنے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ داغؔ و امیر کے بعد ریاضؔ، جلیلؔ، حسرتؔ اور جگر نے تصور محبوب کو تہذیب و معاشرت سے ہم آہنگ کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ فراز نے قدیم روایتی مضامین جن میں وارداتِ عشق و حسن اور کیفیات ہجر و وصال (رومانیت پسندی) کا بیان ملتا ہے، کو اپنی سادہ بیانی اور منفرد انداز بیان سے زندگی بخشی۔ فراز کا لب و لہجہ اور اسلوب بیان اس قدر ریختہ اور منجھا ہوا ہے کہ غزل کا ہر شعر پڑھ کر اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ احمد فراز کی تخلیق ہے۔

اگر کسی سے مراسم بڑھانے لگتے ہیں　　　ترے فراق کے دکھ یاد آنے لگتے ہیں

وہ اجنبی تھا تو کیوں مجھ سے پھیر کر آنکھیں　　گزر گیا کسی دیرینہ آشنا کی طرح

فراز کے ہاں تصورِ محبوب فارسی شعری روایت سے مستعار ہے لیکن فراز براہ راست محبوب کو مخاطب کرنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کے نازوادا سے پیدا ہونے والی کیفیات حسن و جمال کو احاطہ تحریر میں لاتے ہیں۔ اشعار میں وارداتِ قلبی کا اظہار تجربات و مشاہدۂ فطرت کا آئینہ دار ہے لیکن اگر ان میں صداقت اور حقیقت موجود ہو تو ہر شعر دل پر اثر کرتا ہے۔ فراز کے لاتعداد اشعار اسی زمرے میں آتے ہیں۔ فراز کو اپنی اس شعری صلاحیت کا بہ خوبی اندازہ تھا۔ لکھتے ہیں ''انسان تین چیزوں سے سیکھتا ہے۔ مشاہدہ، مطالعہ، تجربہ، ظاہر ہے ہر تجربہ آپ پر گزرا نہیں ہوتا لیکن آپ کو لگتا ہے۔۔۔ ''میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی مرے دل میں ہے''۔ میری شاعری میرے تجربے، میرے مشاہدے اور میرے مطالعے کی تفسیر ہے۔''

ہر شاعر اپنے تجربات کو بروئے کار لا کر مطالعۂ فطرت سے اسرارِ کائنات اور زندگی کی پیچیدہ پرتیں کھولنے کی کوشش کرتا رہتا ہے۔ فراز نے بھی انسانی رشتوں کی نزاکت کو زبان عطا کی۔ انسان اس کائنات میں تنہا نہیں بلکہ اس کی زندگی کئی رنگینیوں اور تلخیوں سے مرقع ہے جن میں انسانی رشتوں کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ یہ رشتے ملن اور جدائی، عہد و پیماں اور ترکِ تعلق کے نشیب و فراز سے عبارت ہیں۔ فراز شاعری میں نظامِ فطرت کے حقائق کو انسان کی داخلی کیفیات سے ہم آہنگ کر دیتا ہے۔ انسان بلاشبہ اجتماعیت پسند ہے لیکن اُس کا داخل ہجوم میں بھی تنہا رہتا ہے اور بعض اوقات خلوت میں بھی یادوں کا ہجوم رہتا ہے۔ شاعر کے ذاتی تجربے اور مشاہدات کے تنوع نے ان اشعار میں جان ڈال دی ہے۔ فراز کے اشعار پڑھتے ہوئے قاری اپنے جذبات و احساسات کی منظر کشی کا مشاہدہ کرتا ہے۔

تمام عمر کہاں کوئی ساتھ دیتا ہے　　یہ جانتا ہوں مگر تھوڑی دور ساتھ چلو

نہ اجنبی نہ مسافر نہ شہر والے ہیں　　کوئی پکارو کہ ہم بھی کسی کے ہو جائیں

اپنے رونے کا سبب تو نہیں معلوم مگر لوگ کہتے ہیں کہ تقریب طرب ہے کوئی

اردو شاعری کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہر دور میں شعرا پر اعتراضات کیے جاتے رہے ہیں۔ یہ اعتراضات ناقدین فن اور ہم عصر شعرا کی باہمی چپقلش کے سبب جنم لیتے رہے ہیں۔ کبھی کبھی شاعر کی وجہ شہرت اور کلام سخن کی انفرادیت اہل فن پر ایسے اثرات مرتب کرتی ہے کہ وہ اس کی شاعری کو عشقیہ یا المیہ یا رزمیہ شاعری سے خاص کر دیتے ہیں اور یوں یہ چھاپ اس شاعر کی پہچان متصور کر لی جاتی ہے۔ فراز کو بھی ''نوجوان طبقہ کا شاعر'' یا ''ٹین ایجرز کا شاعر'' کہا گیا لیکن حقیقت میں اس کے مداحوں میں ہر عمر کے لوگ شامل رہے ہیں۔ محمد طہٰ خاں نے فراز کے معترضین کے حوالے سے لکھا کہ ''میں نے ہمیشہ فراز کے معترضین بے تمکیں سے کہا ہے کہ فراز کو مارنا چاہتے ہو تو فراز سے اچھا شعر کہو۔ فراز خود بہ خود مر جائے گا مگر اس سے اچھا شعر کہنے کے لیے تمہیں کئی زندگیاں درکار ہیں۔۔۔۔

فراز کی شاعری میں فارسی شعری روایت کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ وہ اپنی بات کے لیے عام فہم الفاظ اور سہل ممتنع سے کام لیتا ہے۔ اسی لیے وہ کائنات کے اسرار اور انسانی زندگی کے نفسیاتی مسائل کو بڑی خوب صورتی سے شعروں میں بیان کر جاتا ہے اور وہ بات پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتی ہے۔ فراز کی شاعری کی عوام الناس میں اس قدر شہرت کی ایک وجہ اُن کی سادہ بیانی ہے جس کا اعتراف اُن کی شاعری میں ملتا ہے۔ فراز کی شاعری میں ایک خاص کیفیت ملتی ہے اس کیفیت میں عشق کی مستی بھی ہے حسن کی رعنائی بھی۔ وصال یار کا لطف بھی ہے اور فراق یار کی کسک بھی۔ یہی نہیں اس کے ہاں حکمران وقت کے خلاف آواز بلند کرنے کا حوصلہ بھی اور وطن کی محبت میں شوق شہادت بھی۔ شمیم اکرام الحق فراز کی شاعری کو ان الفاظ میں سراہتی ہیں۔ ''فراز نے اپنے شعری، فکری اور نظریاتی سفر میں فرار کی راہ اختیار نہیں کی۔ وہ آخر وقت تک متحرک رہے۔ کہیں ٹھہرے ہوئے نظر نہیں آئے اور اس طرح ابدی سفر پر روانہ ہوئے کہ پیچھے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اب ہمارے سامنے ان کا کلام ہے جس میں وہ ہم کلام نظر آتے ہیں۔''

فراز کا مخصوص لب ولہجہ اس کی شاعری میں انفرادیت پیدا کرتا ہے۔ فراق کی کیفیات اور ان کے قلبی اثرات کو انسانی رشتوں میں تلاش کرنا اور انسانی نفسیات کی بہترین عکاسی اس کی شاعری کے امتیازات کہے جا سکتے ہیں۔ جب شاعری پر حزنیہ عنصر غالب ہو تو شخصیت پر بھی اس کے اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن فراز کی شاعری پر اُداسی یا ناامیدی کی کیفیت نہیں بلکہ وہ تو زندگی کے مثبت رویوں اور پائیدار و دیرپا جذبات کی عکاس ہے۔ آپ ان خیالات سے اختلاف تو کر سکتے ہیں ان کی سچائی پر انگلی نہیں اٹھا سکتے۔ فراز کی شاعری صرف فراقِ یار تک محدود نہیں بلکہ اس نے روایتی موضوع کو انسانی رشتوں کی آفاقیت عطا کرنے کی کوشش کی ہے۔ فراق، جدائی یا عالم تنہائی کی کیفیات والے اشعار اگر زندگی کے حقائق اور انسانی رشتوں کی سچائیوں کا بیان ہیں تو یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ شاعر زندگی کا دقیق مشاہدہ اور انسانی نفسیات پر گہری نظر رکھتا ہے۔

سلیم زاہد صدیقی

جنرل فوبیا

میں ابھی دفتر سے گھر واپس پہنچا ہی تھا کہ میری بیٹی نے جو ساتویں جماعت کی طالبہ ہے، مجھ سے کہا۔ ''پپا ابھی کپڑے تبدیل نہ کریں بلکہ میرے ساتھ دکان چلیں مجھے سائنس کا ''جنرل'' خریدنا ہے'' میں نے حیرت سے بیٹی کی طرف دیکھا اور کہا ''بیٹی! ''جنرل'' تو کسی دکان پر نہیں بکتا۔ اور اگر کوئی جنرل بک بھی رہا ہو تو یہ ہماری اوقات نہیں کہ ہم خرید سکیں خواہ ریٹائرڈ ہی کیوں نہ ہو، ارے بی بی وہ تو ہمیں خرید لے''

بیٹی میری بات سن کر مجھے یوں تکنے لگی جیسے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔

یوں بہر حال ایک بات تو ثابت ہوئی کہ میری بیٹی مجھ سے زیادہ سمجھدار ہے کیونکہ بہت سی باتوں کو نہ سمجھنا ہی سمجھداری ہے۔ آپ لوگوں نے کچھ سمجھا میں نے کیا کہا؟ ۔۔نہیں نا؟ ،،، بہت اچھی بات ہے، نا سمجھنے میں فائدے ہیں وہ سمجھنے میں نہیں ہیں۔ سمجھنے سے کچھ حاصل بھی نہیں ہوتا۔ بلکہ نقصان کا ہی احتمال رہتا ہے۔ ورنہ اطراف میں سمجھنے کو بہت کچھ ہوتا ہے۔ ہمارے ماحول میں تو یہ سب سے بڑا آرٹ ہے کہ آدمی سب کچھ سمجھ کر بھی ناسمجھ بنا رہے۔ ایسے لوگ فائدہ میں رہتے ہیں۔ اگر آپ بھی میری اس خرافات کو نہیں سمجھے تو یقین جانیں آپ بھی فائدے میں رہیں گے۔ بچی نے عجیب نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا ''پھر مجھے بتائیں میں کیا کروں۔ مجھے تو اسکول میں مس نے کہا تھا کہ کل سائنس کا ''جنرل'' ضرور لے کر آنا ہے۔ پپا آپ کہیں سے بھی لا کر دیں'' میں نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا اور کہا ''ارے نیک بخت سن رہی ہو۔ یہ بچی میری بات ہی نہیں سمجھ رہی ہے۔ تم نے اس کو کس اسکول میں داخل کرایا ہے؟''

وہ بولیں ''ہے تو انگلش میڈیم اسکول ہی'' ۔۔ میں نے کہا ''انگلش میڈیم اسکول ہونے کے

بعد بھی اگر وہ ''جنرل'' اور ''جرنل'' کے فرق کو نہ سمجھے تو تعلیم کا اللہ حافظ۔''

نیک بخت نے کہا ''تعلیم کا اللہ حافظ کوئی آج تھوڑی ہوا ہے۔ یہ تو اسی دن ہو گیا تھا جب اسکول اور کالج کی شکل سے بھی نا آشنا لوگ یونیورسٹی کے کونووکیشن میں ''سرٹی فی کیٹ'' تقسیم کر رہے تھے۔ ارے ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ امریکہ کی کسی ''کمرہ یونیورسٹی'' سے ہی کوئی ڈگری خرید لیتے''

یہ کمرہ یونیورسٹی بھی خوب چیز ہے۔ امریکہ میں بہت عام ہیں۔ اور ان کی عطا کی ہوئی ڈگریاں ہمارے ملک کی ترقی میں بہت ''معاون و مددگار'' رہی ہیں۔ مگر بہر حال ان کے کچھ اصول ہیں۔

پہلا اُصول تو یہ ہے کہ یہ یونیورسٹیز کسی مقامی کو داخلہ اور ڈگری نہیں دیتیں صرف فارن کے لوگ ہی اس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ کمال کی بات ہے کہ ہم لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ مقامی اور غیر مقامی کا مسئلہ صرف ہمارے پاکستان یا ہندوستانی حیدر آباد میں ہی ہے۔ حالانکہ یہ عصبیت امریکہ جیسے اعلیٰ سویلائزڈ، معاشرہ میں بھی موجود ہے۔

ان یونیورسٹیز کا دوسرا اصول یہ ہے کہ ڈگریاں فارن کا بھی ہر آدمی نہیں حاصل کر سکتا۔ صرف ''نجیب الطرفین'' قسم کے سرمایہ دار اور نوابین ہی اسے حال کر سکتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ کسی نواب، صنعت کار یا جاگیر دار کا نالائق بیٹا جس کے لیے پاکستان میں میٹرک پاس کرنا بھی قیامت ہو رہا ہو۔ اپنے سرمایہ کے زور پر دو تین پانچ سال کے ورلڈ ٹور کے بعد جب پاک سرزمین کو شرف قدم بوسی بخشتا ہے تو گلے میں کوئی نہ کوئی ڈگری اسی طرح لٹکی ہوتی ہے جس طرح ہم سے پہلے والی فارن ریٹرن نسل کے گلے میں کوئی میم لٹکی ہوا کرتی تھی۔ یہ ڈگریاں بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ اور سنا ہے کہ کئی ریاستوں کا تو بجٹ ہی ان ڈگریوں کے ایکسپورٹ پر ڈپینڈ کرتا ہے۔

تیسرا اُصول یہ ہے کہ ان کا صرف پوسٹ بکس ایڈریس ہوتا ہے۔ یعنی سارا کاروبار ڈاک خانے کی معرفت ہوتا ہے۔ یہاں ایک خط لکھ کر داخلہ لیا جا سکتا ہے۔ اور داخلہ، ٹیوشن، ہاسٹل، لیباریٹری، امتحان وغیرہ کی فیس ادا ہو جانے کے بعد بذریعہ ڈاک خانہ خوبصورتی سے پیک کی ہوئی ڈگری

طالب علم کو گھر بیٹھے حاصل ہو جاتی ہے۔ اس طرح وقت جو انتہائی مہنگا ہوتا ہے کالج۔ اسکول یونیورسٹیز میں غل غپاڑ مچانے۔ لیڈری کرنے میں بلاوجہ ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے اور اسے کسی دوسرے ہنر مثلاً شکار۔ شطرنج۔ چوسر وغیرہ سیکھنے یا سیاحت کرنے میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

ان کا چوتھا اور سب سے اچھا اُصول یہ ہے کہ کسی بھی قسم کی سفارش یا کتنی ہی بڑی فیس ادا کرنے پر بھی یہ یونیورسٹیز ''گھوڑے'' کو ڈگری نہیں دیتی ہیں۔ اس کا علم اس وقت ہوا جب ایک راجہ صاحب نے اپنے لیے ایک مشہور ''کمرہ یونیورسٹی'' سے ایک ڈگری خریدی۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے سوچا کہ ان کے سائیس کو بھی ڈگری یافتہ ہونا چاہیے۔ اس طرح وہ معاشرے میں سربلند ہو جائیں گے عوام ان کی علم دوستی کے چرچے کریں گے لہٰذا انہوں نے ایک ڈگری اپنے سائیس کے لیے بھی خریدی۔ کچھ دنوں بعد انہیں خیال آیا کہ وہ ڈگری یافتہ ہیں۔ ان کا سائیس بھی ڈگری یافتہ ہے کیوں نہ اُن کا گھوڑا بھی ڈگری یافتہ ہو لہٰذا انہوں نے ''کمرہ یونیورسٹی'' کو لکھا کہ ایک عدد ڈگری ان کے گھوڑے کو بھی تفویض کر دی جائے۔ یونیورسٹی والوں نے جواباً تحریر کیا کہ ''جناب معاف کیجئے گا ہم گھوڑے کو ڈگری نہیں دیتے۔'' راجہ صاحب بہر حال راجہ تھے انکار سننا ان کی فطرت کے منافی تھا۔ یہ سن کر بھنا گئے بس نہیں چل رہا تھا کہ یونیورسٹی والوں کو ''کولہو'' میں پلوا دیتے یونیورسٹی امریکہ میں تھی اگر یہاں ہوتی تو کم از کم اس یونیورسٹی کی گرانٹ وہ ضرور بند کرا دیتے بہر حال صرف شکایت ہی کر سکتے تھے۔ اور یونیورسٹی کو لکھا کہ ''بھئی پڑھا ہم نے بھی نہیں ہمارے سائیس نے بھی نہیں مگر تم نے ہم دونوں کو تو ڈگری دے دی۔ اب گھوڑے کو ڈگری دینے میں کیا امر مانع ہے آخر ہم دونوں میں اور گھوڑے میں کیا فرق ہے۔'' یونیورسٹی والوں نے جواب میں لکھا۔

''آپ دونوں میں اور گھوڑے میں کیا فرق ہے۔ ہم یہ بتانے کی جسارت نہیں کر سکتے کیونکہ ہمارے ملک میں محکمہ انسداد بے رحمی مویشیاں کافی مستحکم ہے۔ البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ آپ بہر حال گھوڑا نہیں ہیں۔ فرق آپ خود غور فرمالیں مگر ہمارا مشورہ ہے کہ گھوڑے کو

اس کی اطلاع نہ ہونے دیں کہ آپ خود میں اور گھوڑے میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ اس سے گھوڑے کی دلآزاری ہوگی۔ اور ممکن ہے کہ آپ کو دولتی جھاڑ دے یا محکمہ انسداد بے رحمی مویشیاں میں آپ کی شکایت کردے۔ البتہ اگر آپ کسی گدھے کو ڈگری دلوانا چاہیں تو جس طرح ہم نے پہلے آپ کو مایوس نہیں کیا اب بھی مایوس نہ کریں گے کیونکہ گدھے ووٹ بھی دیتے ہیں۔''

راجہ صاحب جب مایوس ہو گئے تو انہوں نے خود ہی یونیورسٹی کھولنے کی ٹھانی لی اور ایک اصطبل کو یونیورسٹی کا درجہ دے دیا گیا جہاں گھوڑے کی تعلیم کا آغاز کیا گیا۔

راجہ صاحب کی دیکھا دیکھی بہت سارے لوگوں نے اپنے اپنے اصطبل میں اسکول کھول لیے۔ یہ طریقہ آج بھی رائج ہے۔ سنا ہے چنگیز خان جس علاقے کو تاراج کرتا تھا وہاں کے اسکولوں میں اصطبل بنوا دیتا تھا۔ اب جمہوری دور ہے لہٰذا اصطبل میں اسکول بنا دیئے جاتے ہیں۔

میں نے بیوی سے کہا ''نیک بخت اگر اسکول میں ''جنرل'' اور ''جرنل'' کا فرق نہیں بتایا گیا تھا تو کم از کم تم ہی سمجھا دیتیں۔'' بیگم نے کہا ''آپ کو تو بس میری ہجو کے لیے کوئی بات ملنی چاہیے۔ ارے اگر بچی نے ''جرنل'' کو ''جنرل'' کہہ دیا تو ایسی کون سی قیامت آ گئی ہے۔ ظاہر ہے پاکستانی بچی ہے۔ وہ بھی ساری قوم کی طرح جنرل کے سحر کا شکار ہے۔''

میں نے کہا ''مطلب کیا ہے تمہارا؟''

بولیں ''مطلب کیا ہے۔ کیا آپ کو نہیں معلوم کہ ساری قوم کے دل و دماغ پر ''جنرل'' سوار ہے ہر شخص سوتے جاگتے اپنی حیثیت کے مطابق جنرل کے چکر میں رہتا ہے۔؟''

ہم نے کہا ''کس طرح؟''۔۔۔ گویا ہوئیں۔ ''ارے کس طرح کیا؟ دیکھتے نہیں اسکول میں کسی بچے سے سوال کرو کہ بڑے ہو کر کیا بنو گے تو اگلے وقتوں کے بچے جواب میں ڈاکٹر، انجنئر کہا کرتے تھے مگر آج اکثر بچوں کا جواب ہوتا ہے ''جنرل''۔ اور صرف بچوں پر ہی کیا موقوف اب تو ہر آدمی جنرل کا تمغہ سینے پر سجانے کے لیے بیتاب ہے۔ جن کے لیے فوج میں جنرل بننا ممکن نہیں

ہوتا۔ وہ ''اٹارنی جنرل''۔ ''ایڈووکیٹ جنرل''۔ ''آڈیٹر جنرل''۔ ''منیجر جنرل''۔ ''سرویئر جنرل'' بننے کی تگ ودو میں رہتے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کی جنرلی بھی حاصل نہیں کر پاتے وہ کوئی انجمن۔ مذہبی۔ دینی، فلاحی سوسائٹی۔ کھیل کا کلب یا سیاسی پارٹی بنا کر اس کے ''سیکریٹری جنرل'' بن جاتے ہیں جو اس قابل بھی نہ ہو سکیں وہ ''جنرل اسٹور'' کھول کر یا سبزی منڈی میں دکان لے کر آڑھتی کا کاروبار کرنے لگتے ہیں اور خود کو ''جنرل مرچنٹ'' کہلواتے ہیں اور یوں ''جنرل'' ہونے کے مزے لوٹتے ہیں۔ بس میاں صاحب اپنی ہمت اور فکر کی بات ہے۔ عوام اور عام کا تو ذکر ہی کیا سیاستدان بھی گورنر جنرل اور صدر جنرل بننے کے لیے دیوانے رہے ہیں۔ جناح صاحب بھی ''گورنر جنرل'' بن گئے اس کے بعد ناظم الدین۔ غلام محمد۔ اسکندر مرزا بھی ''گورنر جنرلی'' کے چکر میں آ گئے۔ ہم نے ''ہم تمہاری بات نہیں سمجھے۔؟ ''گورنر جنرل'' تو ایک عہدہ تھا اور اس کے چکر میں بہت سے سیاستداں رہے بھی ہیں لہٰذا تمہاری یہ بات تو ہماری سمجھ میں آ گئی۔ مگر ''صدر جنرل''؟ اس کا کیا مطلب؟۔''

منہ پر ہاتھ رکھ کر حیرت سے بولیں۔ ''ہائیں؟ آپ ''صدر جنرل'' نہیں جانتے؟'' ہم نے کہا۔ ''نہیں'' ۔۔۔ ہمارا جواب سن کر خوب خوب ہنسیں اور جب تھک گئیں تو بولیں ''کیا واقعی ۔۔آپ ''صدر جنرل'' نہیں جانتے؟ ۔۔۔ہم نے پھر کہا ''نہیں بھئی نہیں ہم کسی ''صدر جنرل'' کو نہیں جانتے۔ آپ ارشاد فرمائیں؟''

طنزیہ لہجے میں بولیں ''کیا کبھی ''صدر جنرل'' ایوب خان۔ ''صدر جنرل'' یحییٰ خان۔ ''صدر جنرل'' ضیاء الحق''۔ ''صدر جنرل'' پرویز مشروف کا نام نہیں سنا آپ نے؟''۔ بیگم کی بات سن کر میں پہلے رویا اور پھر بہت ہنسا میں نے کہا ''بیگم واقعی یہ کہنا سو فیصد درست ہے کہ عورتوں کی عقل گدھی میں ہوتی ہے۔'' ہم نے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا ''اری نیک بخت یہ ایوب، یحییٰ، ضیاء۔ مشرف کے نام تم نے لیے ہیں وہ سب ''فوج کے جنرل'' تھے۔ پاکستان کے صدر بننے سے پہلے بھی ان جنرلوں کے نام کے ساتھ جنرل لکھا جاتا رہا ہے۔ بات صرف اتنی سی ہے کہ جب ملک

میں مارشل لاء نافذ ہوا اور یہ لوگ صدر بنے تو ان کو اسی نام سے پکارا جانے لگا۔ دراصل جنرل ان کے نام کا لاحقہ تھا صدر کا سابقہ نہیں۔" کہنے لگیں۔ "مگر ملک میں بار بار مارشل لاء لگتا ہی کیوں ہے؟ کبھی یہ بھی سوچا ہے آپ نے؟" ہم نے کہا "ہوتی ہوگی کوئی وجہ"۔ بولیں "اگر ہماری بات مان لی جائے تو کبھی نہیں لگے گا مارشل لاء۔" ہم نے کہا۔ "وہ کون سی بات ہے ضرور بتاؤ۔ ساری قوم تم کو مادر ملت دوئم کا خطاب دے دے گی کوئی معقول طریقہ بتادو۔ جس سے مارشل لاء نہ لگے"

کہنے لگیں۔ "بہت آسان ہے بس آئین میں ایک ترمیم کر کے صدر کی جگہ "صدر جنرل" اور وزیراعظم کی جگہ "وزیراعظم جنرل" لکھوادو۔۔ جب سویلین لوگ "ایڈوکیٹ جنرل" اور "اٹارنی جنرل" کی طرح "صدر جنرل" اور "وزیراعظم جنرل" کہلانے لگیں گے تو کسی فوجی جنرل کو ان عہدوں پر آنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔"

ہم نے حیرت سے بیگم کی طرف دیکھا جیسے ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ اور بھیا سچ یہی ہے کہ فائدہ ہو نہ ہو۔ عافیت بہرحال اسی میں ہے کہ کچھ نہ سمجھا جائے

*****

آصف الرحمٰن طارق (کینڈا)

اکیلا آدمی

تنہائی سے مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ مگر ایسا ڈر نہیں جو بچپن میں کوئی ڈراؤنی کہانی یا واقعہ سن کر دل میں پیدا ہوا یا وہ ڈر جو اُس بچے کے دل میں پیدا ہو جسے رات گئے کسی اندھیری جگہ میں کسی کام سے بالکل اکیلا بھجوا دیا جائے۔ اس قسم کا خوف یا ڈر بے حد وقتی یا عارضی ہوتا ہے۔ اس کا اثر اسی وقت تک قائم رہتا ہے جب تک اس کہانی کا تأثر بچہ کے ذہن میں رہے یا اس وقت تک جب تک وہ بچہ اندھیری جگہ سے دوبارہ روشنی میں نہ آ جائے۔ تنہائی یا اکیلے پن سے مجھے جو خوف آتا ہے اس کی نوعیت دوسری قسم کی ہے یہ ایک عجیب قسم کا ڈر ہے جس کا سمجھانا شاید میرے لیے مشکل ہو۔ مَیں مثالیں دوں بھی تو شاید نہ سمجھا سکوں اس لیے کہ ڈر اور خوف کا تعلق انسانی ذہن اور شعور کے اس حصہ سے ہوتا ہے جس پر اس کا کوئی بس نہیں چلتا۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی کو ایک بلند عمارت کی آخری منزل کی ایک پتلی سی گگر پر جو سڑک پر کھلتی ہو بغیر کسی سہارے کے چھوڑ دیا جائے اور وہ بغیر کسی خوف یا ڈر کے آہستہ آہستہ چلتا ہوا محفوظ مقام تک پہنچ جائے اور اس کو ڈر نہ لگے یا پھر بعض اوقات آدمی بھرے مجمع میں ایک عجیب قسم کا خوف محسوس کرنے لگتا ہے حالانکہ اس کے ارد گرد ہزاروں لوگ جمع ہوتے ہیں پھر بھی نہ صرف وہ اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتا ہے بلکہ اس کو کچھ خوف کا احساس بھی ہوتا ہے۔

آخر یہ تنہائی ہے کیا؟ کچھ لوگ تنہا رہ کر بھی خوش رہتے ہیں اور کچھ مجھ جیسے ہیں جو تنہائی سے خوف کھاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تنہائی کی تعریف میں یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ تنہا وہ نہیں جو بڑی سی عمارت یا مکان میں بغیر کسی دوسرے شخص کے رہتا ہو بلکہ تنہا وہ ہے جو اس بات کے باوجود بھی کہ ہزاروں میں گھرا ہوا اس کرب سے گزرے کہ اتنے انسانوں کے درمیان بھی اس

کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہیں۔

مجھے تنہائی سے کیوں ڈر لگتا ہے اس کا جواب میرے پاس نہیں۔ یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کوئی آپ سے پوچھ بیٹھے کہ آپ کو سرخ یا زرد رنگ کیوں پسند ہے۔ یا یہ کہ آپ میٹھا اس قدر رغبت سے کیوں کھاتے ہیں۔ آپ کا جواب کیا ہوگا۔ یہی کہ یہ ایک فطری چیز ہے جو قدرت نے ودیعت کردی ہے۔ میرا بھی یہی جواب ہے کہ میرے لیے یہ ایک ایسی بات ہے جس پر میرا کوئی اختیار نہیں، شاید تنہائی سے خوف کا یہ احساس میری گھٹی میں پڑا ہوا ہے جواب میرے تحت الشعور کے کسی کونے کھدرے میں پڑا مجھے تنگ کرتا رہتا ہے۔

لیکن ذرا ایک منٹ ٹھہریے۔ شاید میں اس خوف کا جواز پیدا کرسکوں۔۔۔ پہلے میرا خیال تھا کہ میں اس لیے ڈرتا ہوں کہ میں نے آنکھ کھولتے ہی تنہائی دیکھی۔ میرے باپ بہت امیر آدمی تھے اور انہوں نے شادی بھی ایک امیر عورت سے کی جو خود اپنے ساتھ دنیا جہان کے عیش و آرام لے کر میرے بابا کے گھر آئی۔ اس طرح ہمارے گھر میں دو گھروں کی دولت کی ریل پیل ہوگئی۔ مجھے ہر طرح کا آرام و عیش میسر تھا مگر میں اب اپنے ذہن پر زور ڈالتا ہوں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اس تمام دولت کے باوجود ہمارے گھر میں کسی ایک چیز کی کمی تھی۔ میرے ماں باپ دونوں ہی اپنی اپنی جگہ مختصر خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ میرے بابا کے ایک بھائی تھے جو عمر میں ان سے بہت بڑے تھے اور کاروبار کے سلسلے میں ہمیشہ باہر رہتے تھے۔ ان بائیس سالوں میں جب سے میں نے ہوش سنبھالا میں نے ان کو اتنی بار دیکھا کہ چاہوں تو انگلیوں پر گن لوں۔ اس کے علاوہ ماما کا کوئی دوسرا رشتہ دار نہ تھا۔ ان کا حال بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ اپنے خاندان کی اکلوتی بیٹی تھیں اور خالاؤں اور پھوپھیوں کے جھمیلوں سے آزاد تھیں، خدا کی دین تھی کہ میرا اپنا خاندان بھی ہر پھر کر صرف ماں باپ کے اردگرد گھومتا تھا۔ خدا نے نہ مجھے کوئی بھائی دیا نہ بہن، اس قدر بڑے گھر میں ماں باپ کے ساتھ صرف میری اکیلی ذات رہتی تھی۔ بابا میں فطری طور پر رعونت تھی اس لیے لنگڑے لولے جو بھی رشتہ دار تھے وہ ان کی عادت کے پیش نظر ان سے ملنے سے

کتراتے تھے نتیجہ یہ نکلا کہ میں اکیلا کھیلتا اور جب اماں ابا کبھی دعوتوں میں جاتے اور مجھے چھوڑ جاتے تو میں بالکل ہی تنہا ہو جاتا۔ نوکر ضرور تھے مگر مجھ میں بھی باپ کی رعونت آئی تھی اس لیے میں ان کو منہ نہ لگاتا۔ یہ حالات جو میں نے بیان کیے اس کے پیش نظر تو قرین از قیاس یہ بات ہونی چاہیے تھی کہ چونکہ میں زیادہ تر اکیلا رہتا تھا، مجھے اس تنہائی کا عادی ہو جانا چاہیے تھا مگر بات کچھ الٹی ہوگئی بجائے اس کے کہ تنہائی میری دوست اور یار غار بن جاتی مجھے اس سے خوف آنے لگا۔ میں تنہا رہتا اور ایک انجانے، ایک اَن دیکھے خوف اور ڈر کے تحت دبا رہتا۔ اسکول اور کالج میں میں نے تنہائی کو دور کرنے کا راستہ دیکھا، خوب دوست بنائے، نہ یہ دیکھا کہ کون اچھا ہے اور کون بُرا، الٹے تلٹے دوستیاں کیں۔ ہر ممکن کوشش کرتا کہ اکیلا نہ رہوں، کالج کی کینٹین میں کھانا بھی کھانے جاتا تو اپنے گرد ایک برات اکٹھی کر لیتا، مفت خورے مجھے پیسے خرچتے دیکھ کر مجھے بے وقوف سمجھتے، مجھے اور اُکساتے اور میں زیادہ سے زیادہ اپنے گرد بھیڑ اکٹھی کرتا۔ یہ سلسلہ چلتا رہا حتیٰ کہ میری تعلیم ختم ہوگئی، کامیابیاں میرے ساتھ ہمیشہ شانہ بشانہ چلیں، امتحان میں نے بڑے اعزازات کے ساتھ پاس کیے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند سالوں میں ایک قابلِ رشک نوکری کرنے لگا۔ دفتر میں بھی میں نے اپنی اس تنہائی کا خوب مداوا کیا۔ ہمیشہ جمگھٹا لگائے رکھتا، کسی شام اگر گھر میں اکیلا رہنا پڑ جاتا تو ایسے لوگوں کو بلانے سے بھی گریز نہ کرتا جو کسی طرح بھی میرے ہم پلہ نہ تھے۔ مگر ایسا میں صرف اس لیے کرتا کہ جیسے میں نے کہا کہ مجھے تنہائی سے بہت خوف آتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ ذہنی طور پر اب میں تنہا نہیں ہوں۔ دفتر کی مصروفیات کچھ اس نوعیت کی تھیں کہ میں روز نئے لوگوں سے ملتا، دفتر کے ہی سلسلے سے لوگ آئے دن گھر پر بھی آتے اس طرح میں نے تنہائی کے اس جن کو کچھ کچھ قابو کر لیا تھا جو بچپنے سے میرا پیچھا کرتا آیا تھا مگر ہوا یہ کہ یہ تمام کیا کرایا ایک دم دھرے کا دھرا رہ گیا۔ میری کمپنی نے میرا تبادلہ ایک ایسی جگہ کر دیا جو نہ صرف میرے شہر بلکہ میرے ملک سے بھی دور تھی۔ شروع شروع میں ایک نئے ملک جانے کی

مجھے بے حد خوشی ہوئی کہ اب دنیا بھی گھوموں گا اور دل کی چند ایک حسرتیں جو ابھی تک دل ہی دل میں ہیں ان کی بھڑاس بھی نکالوں گا۔ میں نے بہت خوشی خوشی سفر طے کیا اور جرمنی کے بے انتہا پُر رونق اور گہما گہمی والے بڑے شہر میں آن ڈیرا جمایا۔ شہر کا پہلا تاثر بہت خوش کن تھا۔ اس لیے کہ شہر نہ صرف بڑا تھا بلکہ لوگوں کا ایک ہجوم تھا جو سمندر کی طرح ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ نفسیاتی طور پر اس بات نے میرے ذہن پر بڑا خوشگوار اثر کیا کہ تنہائی کا بھوت اگر سوار ہوا تو شہر لوگوں سے ٹھسا ٹھس بھرا ہوا ہے، اور کچھ نہیں تو وقت کا زیادہ حصہ شہر ہی میں گزار کر تنہائی کی اذیت ناک کیفیت کو دور کیا جا سکے گا۔ اور یہ بات کارگر بھی ثابت ہوئی۔ گھر میں گھستا تو گھر کاٹنے دوڑتا، میں لشتم پشتم کپڑے بدلتا اور شہر کا رُخ کرتا۔ مگر یہ کیفیت زیادہ دیر تک برقرار نہیں رہی میں پھر اسی قنوطیت کا شکار ہو گیا جس کا مجھے ڈر تھا۔ گھر کے اندر تنہائی کا احساس ہوتا تھا۔ بھرے پُرے بازاروں میں مجھے خوف آنے لگا، میں نے لاکھ کوشش کی کہ کسی طرح اپنی اس کمزوری پر قابو پالوں مگر تنہائی کے خوف کے احساس کا جو جن مجھ میں گھس بیٹھا تھا اس کو میں کسی بھی طور اپنے ذہن کی بوتل سے باہر نہ نکال سکا۔ میں نے ہار مان لی اور اپنی ماں کو تمام حالات لکھ دیئے اور پھر یہ بھی لکھ دیا کہ مجھے شادی کر لینی چاہیے ورنہ تنہائی کا یہ احساس مجھے مار ڈالے گا۔ میں نے یہ بھی لکھ دیا کہ بیوی کی موجودگی میرے لیے ڈھارس کا باعث ہوگی اور اکیلے رہنے کا جو سہم مجھ پر سوار ہے وہ دور ہو جائے گا۔ ماں جیسے میری اس بات کا انتظار کر رہی تھی۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا کے مصداق انہوں نے میری شادی طے کر دی۔ شادی کیا طے کی ہتھیلی پر سرسوں جمالی، بہت ہی تھوڑے وقت میں لڑکی ڈھونڈی، بات پکی کی، تاریخ طے کی اور مجھے لکھ دیا کہ آ جاؤ۔ میرے لیے اس قدر جلد واپس جانا کارِ دارد تھا اس لیے نئے طور طریقوں کا سہارا لیا، فون پر ہمارا نکاح ہوا اور نکاح کے ایک ہی ہفتے بعد شاہ رخ میری بیوی بن کر آ براجمان ہوئیں، میں ماں کی کارکردگی پر حیران تھا کہ اس قدر جلد اتنی خوبصورت لڑکی کہاں سے ڈھونڈ نکالی۔ میں نے ائرپورٹ پر پہلی مرتبہ شاہ رخ کو دیکھا اور فوراً ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ میرا یہ عشق دن دوگنی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔

شاہ رخ سے مجھے دوہری محبت ہوگئی محبت کا دوسرا سبب اس کے وجود کا احساس تھا جس نے میری تنہائی کو ختم کر دیا تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ میں نے شاہ رخ کو زیادہ بہتر طور سے سمجھنا شروع کر دیا۔ میرے لیے شاہ رخ بالکل اجنبی ہستی تھی اس لیے اس کی ہر بات میرے لیے اور میری ہر بات اس کے لیے نئی ہوتی اور ایک دوسرے کو سمجھنے میں مدد دیتی۔ شاہ رخ خاموش طبیعت کی لڑکی تھی۔ شروع شروع میں میں نے اس کی اس عادت کا مطلب یہ لیا کہ میں لاکھ اس کا شوہر سہی، پر ہوں ایک اجنبی اور ایک اجنبی سے کوئی عورت اس قدر جلد کیسے گھل مل سکتی ہے اور اور وہ بھی اس طرح کہ اس نے شادی سے پہلے اس کو کبھی دیکھا بھی نہ ہو۔ میرا خیال تھا کہ وقت کے ساتھ اس کا یہ خاموش رویہ دور ہو جائے گا مگر ایسا نہ ہوا بلکہ مجھے ایک اور اندازہ ہوا کہ وہ بجھی بجھی بھی رہتی ہے۔ میں نے اس بات کو بھی اس منطق کے حوالے کر دیا کہ ماں باپ اور بہن بھائیوں کو چھوڑ کر کوئی لڑکی بھی شروع شروع میں خوش نہیں رہ سکتی۔ مگر تجربہ نے یہ بتایا کہ طبیعت کا خاموش پن اور بجھا بجھا سا رہنا ایک طرح سے اس کی عادت ثانیہ تھی۔ میری معاشی حالت بہت اچھی تھی۔ اس لیے میں نے اس کے لیے دنیا جہان کی چیزیں اکٹھی کر دیں جو میرے خیال میں اس کو خوش رکھنے کے لیے ضروری تھیں۔

دیکھتے دیکھتے ہم دونوں ماں باپ بن گئے۔ ہماری بیٹی نے ہمارے ساتھ بڑا انصاف کیا۔ اس کی شکل ہم دونوں ہی سے ملتی تھی۔ میں بیٹی کی پیدائش پر شاہ رخ سے زیادہ خوش تھا اس لیے کہ مجھے تنہائی کا احساس قطعاً نہ رہا تھا۔ گو یہ احساس شاہ رخ کی موجودگی نے تقریباً ختم ہی کر دیا تھا پھر بھی جو کچھ چن باقی تھی اس کو ہماری بیٹی نے کھرچ دیا۔ اور میں دندناتا ہوا بغیر کسی خوف اور احساس کے رہنے لگا۔

ہماری بیٹی کی پیدائش کے سال بھر بعد کی بات ہے کہ ایک سہ پہر میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک صاحب کا کارڈ میرے کمرے میں لایا گیا اس پر پاکستان کا پتا لکھا تھا۔ میں جس شہر میں تھ

وہاں پاکستان کے لوگ آٹے میں نمک کے برابر تھے اس لیے اگر کوئی ہم وطن مل جاتا تو بڑی خوشی ہوتی، بلکہ ایک طرح سے ہم ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہم وطنوں کو کونوں گھدروں سے نکال لاتے۔ میرے سامنے جو کارڈ تھا وہ ایک ہم وطن کا تھا۔ میں فوراً ان سے ملنے اپنے کمرے سے باہر آیا اور اپنے ساتھ اپنی میز تک لے گیا اچھی شکل وصورت اور اسمارٹ سا یہ نوجوان مجھے پہلی ہی نظر میں اچھا لگا، تعارف ہوا تو اس کے نام کا پتا چلا کہ اختر رسول ہے، اور یہ طے ہوا کہ میں آپ جناب اور صاحب کا تکلف چھوڑ کر اس کو اختر کہہ کر پکاروں۔

میں نے اختر کی آمد کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ وہ امریکا جا رہا ہے اور راستے میں گھومنے کے لیے اس نے دو تین جگہوں کا انتخاب کیا اور اس طرح وہ اس شہر میں پہنچا۔ میں نے نیا استفسار کیا کہ میرا پتا کیسے چلا تو اس نے بتایا کہ اس کو گھر سے نکلے ہوئے ۱۵۔۲۰ دن ہو گئے ہیں۔ اور بہت دنوں سے کسی پاکستانی سے ملاقات نہیں ہوئی اور بقول اس کے ''انگریزی بولتے بولتے جبڑے دکھ رہے ہیں۔ میرا نام ٹیلی فون ڈائریکٹری میں دیکھا، اتنے ڈھیر سارے اجنبی ناموں میں پاکستانی نام جھٹ سے نظر پڑ گیا، میری کمپنی کا پتا ڈائریکٹری سے اتارا اور فوراً ہی میرے پاس پہنچ گیا۔ میں نے اس کے اس جذبے کی تعریف کی اور فوراً ہی رات کے کھانے کی دعوت دے دی اختر تو جیسے اُدھار کھائے بیٹھا تھا، فوراً حامی بھر لی۔ اس کے اُس طرح جلدی سے حامی بھرنے سے مجھے ہنسی بھی آئی اور اپنا وہ زمانہ یاد آیا جب میں بھی اس شہر میں نیا نیا آیا تھا۔ اور اپنے ہم وطنوں کی تلاش اور ان سے ملنے کی کوشش میں کیسا کانورا کا تورا پھرتا تھا۔

اختر دفتر کے ختم ہونے کے بعد میرے ساتھ ہی گھر آ گیا کہ کہاں ہوٹل واپس جائے گا اور رات میرے گھر کی تلاش میں اس نئے شہر میں مارا مارا پھرے گا۔ گھر پہنچ کر میں نے اختر کا تعارف اپنی بیوی سے کرایا۔ شاہ رخ اختر کو دیکھ کر حیران ہوئی۔ اس کی حیرانی میں خوشی کا عنصر بھی شامل تھا جس کو میں نے بھانپ لیا اور جو بے حد فطری تھا اس لیے کہ وطن سے دور کسی ہم وطن سے ملنے کی خوشی کو وہی سمجھ سکتے ہیں جو اس طرح کے حالات سے دوچار ہوں۔ میں نے شاہ رخ

کو تمام باتیں بتائیں اور پھر یہ بھی بتایا کہ اختر کھانا آج رات ہمارے ہاں ہی کھائیں گے، شاہ رخ نے بڑی خوشی سے اس پروگرام کو قبول کیا اور کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ باورچی خانے سے اس نے مجھے آواز دی کہ ہم دونوں بھی ادھر ہی آجائیں تاکہ وہ اختر سے پاکستان کے متعلق باتیں پوچھ سکے۔ بہت دنوں بعد یہ پہلا موقع تھا کہ شاہ رخ کی طبیعت میں کھلکھلاہٹ پید ہوئی اس کی یہ کھلکھلاہٹ خاص خاص موقعوں پر ہوتی تھی۔ آج اس کی طبیعت کا بجھا بجھا پن جو ہم دونوں کی زندگی کا جزو سا بن گیا تھا اس میں نظر نہیں آرہا تھا۔ اس نے اختر سے بہت ساری باتیں کیں جس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ وہ دونوں ایک ہی کالج کے تھے اور یہ کہ ان دونوں کی کالج میں موجودگی کے دوران کئی سالوں کا فرق تھا۔

شاہ رخ نے اختر کے لیے خاص طور سے چند ایک خصوصی چیزیں پکائیں ایک چیز اس نے بالکل نئی پکائی جو میں نے بھی پہلے اس کے ہاتھ کی پکی نہیں کھائی تھی اور اس نے یہ کہہ کر اختر کے آگے رکھی کہ

''یہ کھائیے یہ آپ کو ضرور پسند آئے گی۔''

وہ ڈش واقعی مزے کی تھی۔ اختر نے پیٹ زیادہ اسی سے بھرا، اختر کی موجودگی میں شاہ رخ نے بھاگ بھاگ کر کام کیے۔ اس نے کھانے کے ساتھ دہی کی لسی بھی بنائی جس کے اختر نے ایک ہی سانس میں کئی گلاس پی ڈالے، میں نے شاہ رخ سے پوچھا۔

''تم کو کیسے معلوم کہ اختر کو لسی پسند ہے۔'' شاہ رخ کا جواب دل کو لگتا تھا

''بھلا کون سا ایسا پاکستانی ہوگا جس کو لسی نہ پسند ہو اور وہ بھی اس طرح کہ کئی دنوں بعد مل رہی ہو۔۔۔۔''

اختر ہمارے گھر رات گئے تک رہا، ہم جب اس کو اس کے ہوٹل چھوڑ کر آئے تو شاہ رخ نے اس کو پھر دوسرے دن کی دعوت دے ڈالی اور یہ بھی کہ وہ جب تک ہمارے شہر میں قیام کرے آتا رہے۔

واپسی پر شاہ رخ خلاف عادت بولتی رہی۔اس کی چند ایک باتوں سے ایسا اندازہ ہوا کہ وہ آج بہت خوش ہے۔مگر گھر پہنچتے پہنچتے اس کی خاموش طبیعت پھر عود کر آئی اور وہ سیدھی کمرے میں جا کر سونے کے لیے لیٹ گئی۔ ہر چند کہ رات زیادہ ہوگئی تھی پھر بھی میں نے محسوس کیا کہ وہ سو نہیں رہی ہے۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے ہوں ہاں کر کے بات ٹال دی۔تھوڑی دیر اور گزر گئی تو مجھے یقین ہوگیا کہ شاہ رخ جاگ رہی ہے میں نے بڑی آہستگی سے اس کی طرف کروٹ لی تو وہ میری طرف پیٹھ کیے لیٹی ہوئی تھی۔

میں نے اس کا شانہ پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف کرنا چاہا تو اس نے مجھے یہ تاثر دیا جیسے وہ سو رہی ہے۔میرے دل میں ایک چبھن سی تھی۔ میں نے بڑی آہستگی سے اپنی ہتھیلی سے اس کا چہرہ اپنی طرف کیا،تو میری ہتھیلی گیلی ہوگئی۔آنسوؤں کے چند قطرے تھے جو اس کے چہرے پر پھیل گئے تھے۔میں نے اس سے ایک سوال کیا۔

''کیا تم اختر کو پہلے سے جانتی ہو؟۔۔۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور میری بات کے جواب میں بہت آہستگی سے اس نے میری طرف سے کروٹ بدل لی۔اس وقت میرے کمرے میں میری بیوی اور میری بیٹی میرے ساتھ تھے۔پھر بھی اچانک مجھے ایسا لگا جیسے تنہائی کا جن پھر بوتل سے باہر آرہا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مجھ پر حاوی ہوگیا اور دو سال بعد مجھے پھر ایسا لگا جیسے میں اپنی بیوی اور بچی کی موجودگی کے باوجود ایک بار پھر سے تنہا ہوگیا ہوں۔

*****

شمع سیّد

خالہ شبّو

شام ڈھلنے میں کچھ وقت باقی تھا۔ جب اُس نے کھونٹی پر لٹکی ہوئی اپنی چادر گھسیٹی اور چادر کو اچھی طرح سر پر جماتے ہوئے اُس نے اپنے گھر کے بیرونی دروازے پر تالا ڈالا اور شبّو خالہ کے گھر کی راہ لی۔ شبّو خالہ محلے کے تمام بڑے بوڑھوں اور بچوں کی یکساں طور پر خالہ ہی تھیں۔ کچھ سال پہلے تک محلے کے تمام معاملات میں اُن کی مشاورت ضروری خیال کی جاتی تھی اور ان کی رائے کو احتراماً اہمیت بھی دی جاتی۔ اب چونکہ اُن کی زندگی کا دِیا بھی ٹمٹمار ہا تھا تو لازمی امر تھا کہ روشنیوں کے مسافر اندھیرے کا ساتھ نہیں دیا کرتے۔

خالہ کا خاندان ہجرت کے بعد پاکستان میں آباد ہوا تھا۔ ہجرت کے وقت بقول اُن کے اُن کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ اور اب اَسّی کے لگ بھگ۔ اس کے باوجود قیام پاکستان اور تحریک پاکستان کے واقعات تمام جزئیات کے ساتھ ایسے بیان کرتیں کہ اُن کی یادداشت پر رشک آتا۔ ایسے لگتا جیسے واقعات نہیں احساس کو زباں مل گئی ہو۔

اور صندل۔۔۔ اپنے نام ہی کی طرح مہکی مہکی سی خوشبو پھیلاتی جسے سُنا کم اور محسوس زیادہ کیا جاسکتا تھا۔ یوں تو شبّو خالہ اور صندل کی عمر میں کوئی تال میل نہ تھا۔ پچیس سال کی عمر میں خالہ جیسی عمر رسیدہ عورت سے دوستی محلے کی عورتوں کے لیے بھی حیران کُن تھی خالہ کی اپنی دو بہوئیں اور پوتے اور پوتیاں بھی تھے۔ وہ سب خالہ کے بیٹے سمیت اُنہیں گھر کا پُرانا کاٹھ کباڑ سمجھ کر ایک کونے میں رکھ کر بھول گئے تھے فرق صرف اتنا تھا کہ کباڑ خانہ عام طور پر گھر کے پوشیدہ حصے میں بنایا جاتا ہے۔ مگر یہ شاید خالہ کی عظمت کا اعتراف تھا کہ اُن کے لیے گھر کا داخلی حصہ مختص کیا گیا

تھا۔ کسی پُرانے تمغے کی طرح اُنھیں گھر کے صدر دروازے پر لٹکایا گیا تھا۔ گھر کے مکینوں سمیت ہر آنے جانے والا جدید رنگ و روغن سے سجی دیواروں پر ٹنگی اس پُرانی اور نایاب تصویر کو پل بھر کے لیئے رک کر دیکھتا۔ سراہتا اور پھر بند دروازے کے پیچھے گم ہو جاتا۔

ان میں صندل صرف ایک ہی تھی جو اس تصویر کے ہر ہر خدو خال کا بہت تفصیل سے جائزہ لیتی۔ وہ خالہ کو تب سے جانتی تھی جب پندرہ سال پہلے وہ بیاہ کر آئی تھی۔ اُس کی اپنی ماں اُس کے بچپن میں ہی بچھڑ گئی تھی صرف دو بہنیں تھیں صندل اور کومل باپ دونوں کو بیاہ کر خود بھی اپنی گھر ہستی دوبارہ بسا چکا تھا۔ سُسرال میں جو ساس سُسر تھے وہ چند سال پہلے یکے بعد دیگرے خالقِ حقیقی سے جا ملے تھے۔ ایسے میں شبّو خالہ گھنی چھاؤں کی طرح اُس پر سایہ کیئے رہیں۔ اب کچھ عرصے سے وہ بستر پر ہی رہنے لگیں تو صندل اس بڑے سے پھاٹک والے گھر میں تسلسل سے آنے جانے لگی۔ وہ اپنی عمر کی عورتوں اور لڑکیوں میں کم ہی بیٹھا کرتی جب بھی فرصت کے پل میسر آتے تو اُس کا دل خالہ کی طرف سے ہمکنے لگتا۔ وہ خالہ سے حالاتِ حاضرہ پر بات بہت کم کرتی۔

اُس کا رشتہ خالہ سے بہت انوکھا سا تھا۔ دل کا، رُوح کا، احساس کا، درد کا۔۔۔ جانے کیسا تھا یہ رشتہ کہ وہ دل کی گہرائیوں سے جُڑا تھا آج بھی وہ اپنے تینوں بچوں کو اکیڈمی روانہ کر کے خالہ سے ملنے چلی آئی تھی۔ بظاہر اُس ملاقات کی کوئی خاص وجہ نہ تھی مگر شاید بہت خاص وجہ بھی تھی۔ وہ اپنے گھر میں بہت مطمئن اور آسودہ زندگی گزار رہی تھی پھر جانے کیوں اُس کے تن من میں کچھ عرصے سے دیمک نے ڈیرے ڈال لیئے تھے۔

یونہی باتوں باتوں میں ایک دن خالہ نے بیٹیوں کی مثال ایک لکڑی سے دے ڈالی۔ اُن کا کہنا تھا کہ بیٹیاں بابل کے آنگن میں جلتی ہوئی انگیٹھی ہیں ایک سُوکھی لکڑی کی طرح ہیں جو جلتی ہیں اور سُلگتی ہیں بھڑکنے کی اجازت نہیں ہوتی جب کہیں آنچ تیز ہوئی انگیٹھی سے کھینچ کر چند چھینٹے پانی کے مارے اور راکھ میں سرد با دیا۔ تھوڑا ٹھنڈا ہونے پر دوبارہ جلنے کا وہی یہی عمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور بعض کو تو جلنے بجھنے کے اس عمل میں اتنا لُطف آتا ہے کہ تمام عمر ہی انگیٹھی سے بندھی رہتی

ہیں۔ نہ آنچ پکڑتی ہیں نہ راکھ بنتی ہیں۔ بس من سے بندھی رہتی ہیں بائل کی انگھیٹی سے۔۔۔

خالہ کی بہوؤں کا خیال تھا کہ اُن کی عمر ہو چلی ہے سو بہکی بہکی باتیں کرنے لگی ہیں صرف ایک صندل تھی جو خالہ کی بے سر و پا باتوں کو معنی کی پوشاک پہنا کر سینت سینت کر رکھتی جاتی۔ اُس کا دل گواہی دیتا تھا کہ خالہ ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ بھی تو ادھ جلی لکڑی کا ایک ٹکڑا ہی تو تھی سُلگا سُلگا راکھ میں دبا ہُوا۔ خالہ نے براہ راست اُسے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ بس وہ اُن کی باتوں کا مفہوم آسانی سے سمجھ جاتی تھی یا شاید سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان کہیں اٹکی رہتی تھی۔ اور یہ ہی پیاس یہ ہی طلب اُسے بار بار خالہ کے دَر تک لے آتی تھی۔ اُسے یقین ہو چلا تھا کہ وہ اُس کی کیفیات کو سمجھتی ہیں۔

اکثر صندل کو اپنے شوہر کے سامنے شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا، جب وہ اُسے احساس دِلاتا کہ وہ بلاوجہ ہی ایک چھوٹی سی بات میں اُلجھی ہوئی ہے یا جب وہ مذاق مذاق میں اُسے خبطی کہہ کر پکارتا۔ ایسے میں اُسے اپنے جذبات اور احساسات کی توہین کا احساس ہوتا باوجود اس کے کہ وہ اپنے شوہر کی بے انتہا عزت کرتی تھی اور شاید شادی کے پندرہ سال گزر جانے کے بعد آج بھی اُسے پچھلے کچھ دِنوں سے ایک احساس ایک انجانا سا خوف ستا رہا تھا۔ جس کے بارے میں اُس کا اپنا خیال یہ تھا کہ وہ اگر کسی بھی باشعور شخص سے اپنا یہ احساس یہ ڈر بانٹے گی تو اُس شخص کو یقینی طور پر اُس کی ذہنی حالت پر شبہ ضرور ہوگا۔ وہ تو شبو خالہ ہی تھیں جو اُس کی انتہائی بے تکی باتوں کے پیچھے چُھپے ہوئے احساس تک رسائی پا لیتی تھیں۔ انہی احساسات میں گھری وہ تیز تیز قدم بڑھاتی خالہ کے گھر کی طرف کھنچی چلی جا رہی تھی۔ وقت کا اندازہ لگانے کے لیے اُس نے آسمان کی طرف نگاہ کی مغرب میں ابھی کچھ وقت باقی تھا۔

عُجلت میں قدم اُٹھاتی وہ لکڑی کے ایک پرانے اور بوسیدہ سے پھاٹک تک پہنچ گئی۔ جس کی بنیادوں میں دیمک جانے کب سے آباد تھی پھر بھی وہ اس قدر تمکنت سے کھڑا تھا کہ اب تو اُسے اس کی جگہ سے ہلانا بھی ممکن نہ رہا تھا۔ کافی عرصے سے یہ پھاٹک آدھا کُھلا آدھا بند اپنے ہونے کا احساس دِلا رہا تھا۔ یا پھر مکینوں کی بے حسی کی کہانی بیان کر رہا تھا۔ پھاٹک سے برآمدے تک کا

فاصلہ اُس نے تقریباً دوڑنے کے انداز میں طے کیا۔ سامنے ہی خالہ تخت نما پلنگ پر نیم دراز اُونگھ رہی تھی۔ اُس نے قریب جا کر دھیرے سے اُن کے شانوں کو چھوا۔۔۔صندل کا لمس بھی جیسے صندل ہی تھا کہ خالہ اطمینان سے اُٹھ کر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھ گئیں۔ خالہ آپ کیسی ہیں۔۔۔ میں ٹھیک ہوں بچی تم کہو میاں اور بچے کیسے ہیں؟ آپ کی دُعا سے سب ٹھیک ٹھاک ہیں خالہ، اللہ کا بڑا کرم ہے۔ ہُوں۔۔۔خالہ نے ایک طویل سانس لیتے ہوئے آسمان کی طرف دیکھا گویا وہ بھی وقت کا اندازہ کرنا چاہتی ہوں۔ اُن کی آسمان کی طرف اُٹھتی آنکھوں میں صندل نے اُن کا اگلا سوال بھی پڑھ لیا تھا۔ جی خالہ۔۔۔شام ہونے والی ہے۔۔۔۔خالہ نے چونک کر نگاہیں اُس کے چہرے پر جما دیں۔ ہاں خالہ یہ ہی اُلجھن ستا رہی ہے کہ شام ہونے کو ہے۔ خالہ کی آنکھوں میں تحیّر اُبھرا۔ کہا، کیا صندل بیٹا؟ اری شام تو روز ہوتی ہے پھر آج کیوں تیرا مَن اُلجھن میں ہے میری بچی! یہ ہی تو سمجھ نہیں پاتی۔ اُسی وجہ سے آپ کی طرف آ گئی کہ شائد دل کو کچھ سکون آ جائے۔ کہو بیٹا کیا پریشانی ہے؟ خالہ بات بہت عجیب سی ہے پر آپ سے نہیں کہوں گی تو یُوں ہی بے چین رہوں گی۔ خالہ نے ایک بار پھر اُسے اُلجھی ہوئی وضاحت طلب نظروں سے دیکھا۔

کچھ دن سے مجھے یہ وہم ہو گیا ہے کہ میری اور مجھ سے چھوٹی بہن کومل کی زندگی ختم ہونے کو ہے۔ اوہ خُدایا۔۔۔خالہ نے بے ساختہ اُسے اپنے پروں میں چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے اُسے اپنے ناتواں بازوؤں میں بھر لیا سیلاب کا ریلا دل کی دیواروں کو مسمار کرتا ہوا آنکھوں سے باہر اُمڈ آیا۔ رو لے میری بچی رونے سے جی ہلکا ہو جائے گا پھر آرام سے کہنا ایسا کیا ہُوا۔۔ خالہ دھیرے دھیرے اُس کی پشت کو سہلاتے ہوئے اُسے تھپکتی رہیں۔

میں نہیں جانتی ایسا کیا ہوا ہے کہ یہ خوف کُنڈلی مارے میری رُوح سے چمٹ کر بیٹھ گیا ہے۔ جانے کیوں مجھے محسوس ہوتا ہے کہ کومل میری ماں جائی کومل کسی گہرے دُکھ میں مُبتلا ہے۔ وہ مجھ سے کہنا چاہتی ہے مگر کہہ نہیں پاتی وہ جب بھی آتی ہے ہم ڈھیروں باتیں کرتے ہیں اکثر تو رات سے صبح ہو جاتی ہے وہ بولتے بولتے تھکتی ہی نہیں پھر بھی مجھے لگتا ہے کہ وہ کہہ نہیں پاتی۔۔۔وہ چُپ

رہنے کے لیے جب بولتی رہتی ہے۔ اُس کے لفظوں کے پیچھے کہیں اُس کی چُپ دم توڑ رہی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھُلتی جا رہی ہے اماں ۔۔۔ خالہ نے پھر چونک کر دیکھا۔ ایک پل میں وہ خالہ سے اماں تک کا فاصلہ طے کر گئی تھی جس سے شبّو کو اُس کے دُکھ کی گہرائی کا اندازہ ہوا۔ ایک انجانا دُکھ آپ مجھے بتائیں میں کومل سے کیسے اور کیا پوچھوں ۔۔؟ وہ اپنے دُکھ کو دبا کر چُپ کے بوجھ تلے دم توڑ دیے گی اور میں اُس کے انجانے دُکھ کے احساس کو سہتے سہتے مر جاؤنگی۔ میں زیادہ دیر ان دیمک زدہ احساسات کے سہارے جی نہیں پاؤں گی۔ میری چھت مضبوط ہے تو کیا ہوا۔ جب دیواریں ہی زمین بوس ہو جائیں گی تو چھت کس آسرے پہ قائم رہے گی۔ وہ اپنے دُکھ کو چھپا کر اور میں اس گھٹن کو سہہ کر جی نہیں پاؤنگی۔ کیسے کھوج لگاؤں اس کے دُکھ اُس کے درد کا۔ دل ڈرتا ہے کہ اگر کچھ نا قابلِ برداشت ہوا تو ۔۔۔۔! میری زبان تک لفظ آتے آتے دم توڑ جاتے ہیں۔

ایک دم اُس نے خالہ کی گرفت کو خود پر ڈھیلا پڑتے ہوئے محسوس کیا خالہ کا چہرہ کرب اور تکلیف کے احساس سے زرد پڑ گیا تھا۔ آنکھوں سے آنسو بھی رواں تھے اُس نے خالہ کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔۔ خالہ ۔۔۔ خالہ کہیں میں پاگل تو نہیں ہوگئی ۔۔۔؟ بولیے نا خالہ ۔۔۔ اُس نے قدرے بلند آواز سے خالہ کو پکارا۔ نہیں میری بچی ایسا سوچنا بھی مت بس کہیں احساس اور درد کا بھوگ زیادہ ہے۔

دیکھ صندل میری بچی ۔۔ ہمارے دل میں جنم لینے والے خدشے اور ڈر رفتہ رفتہ بے بسی میں ڈھلنے لگتے ہیں اور پھر مایوسی پر آ کر ٹھہر جاتے ہیں پھر بھلے ان خدشات کا کوئی وجود کوئی وجہ ہو یا نہ ہو۔ تُو تو جانتی ہے مایوسی سے پرے سوائے اندھیرے کے اور کچھ نہیں۔ موت تو برحق ہے۔ اُسے اپنی طاقت بنا کر جی، اسے ڈر بنا کر مایوسی میں نہ بدل میری بچی۔ مایوسی گناہ ہے اور اس کی آخری کڑی کُفر سے جا ملتی ہے۔ وہ مالک رحیم بھی ہے اور کریم بھی۔ دل کا ڈر اور بے چینی رُوح میں کمزوری بھر دیتا ہے اسی بے چینی کو اپنی ڈھال بنا کر خُدا کی رحمت کو تلاش کر جب تو اپنی بے بسی کو تسلیم کرتے ہوئے مالک کے سامنے جھک جائے گی تو درد کی یہ سرکشی تھم جائے گی۔ پھر کسی سے

کچھ پوچھنے کی ضرورت باقی نہیں رہے گی۔ تُو خود پر اپنی پہچان کا دَر کھول کر دیکھے گی تو تجھے تیرے ہر سوال کا جواب بھی ملے گا اور اللہ رب العزت اپنے کرم سے ایسے راستے ہموار کرے گا کہ تیری تڑپ کو بھی قرار آ جائے گا۔ اللہ پاک نے فرمایا ہے کہ میں تجھے تیرے گمان کے مطابق ملوں گا تو پھر یہ سب۔۔۔؟ کیا تو جانتی نہیں بات کرتے کرتے خالہ کی سانس اُکھڑنے لگی۔ اُن پر کھانسی کا دورہ حاوی ہونے لگا۔

برآمدے سے ملحقہ کمرے کا دروازہ کھلا، خالہ کی بڑی بہو نے خاموشی سے اُدھ کھلے دروازے سے سر باہر نکال کر جھانکا اور پھر اُسی خاموشی سے دروازہ بند کر دیا۔ مایوسی سے آگے کچھ نہیں۔۔۔ صندل کے کانوں میں خالہ کے کچھ دیر پہلے کے کہے ہوئے الفاظ گونجنے لگے۔ ان کی بہو بھی شائد مایوسی کی سیڑھی پر قدم بڑھا چکی تھی۔ شام ڈھلنے والی تھی اور پھر اندھیرا۔

اُس نے خالہ کو سیدھا کر کے بیٹھایا اور اُن کی پشت کو سہلانے لگی۔ رفتہ رفتہ اُن کی سانس بحال ہونے لگی خالہ نے اپنے جسم کو ڈھیلا چھوڑ رکھا تھا۔ جیسے ہی کھانسی تھمی اُنہوں نے جوش اور پوری طاقت سے اپنے جسم کو سیدھا کر کے تکیے کے سہارے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔ اور وہ اپنی کوشش میں کسی حد تک کامیاب بھی ہوئیں۔ اُمید مسکرائی۔۔۔ اور یقین نے اُن کی طرف اپنے قدم بڑھائے۔

ایک الوہی نُور سے بھر یقین اُن کے وجود پر چھانے لگا بولتے بولتے جیسے وہ غنودگی میں جانے لگیں۔۔۔ اُنہوں نے نیم وا آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا۔۔۔ دیکھ صندل شام ڈھلنے والی ہے۔۔۔ اندھیرا چھانے سے پہلے گھر لوٹ جا میری بچی۔۔۔ اس یقین کے ساتھ کہ صبح رات کے دامن سے ہی پھوٹتی ہے۔

صندل نے اپنے وجود کو ہُوا کے دوش پر محسوس کرتے ہوئے اندھیرے سے روشنی کی طرف مُڑنے والے راستے پر قدم بڑھا دیئے۔۔۔۔۔

******

ڈاکٹر احمد اعجاز الدین رحمت علی

شعبۂ اردو مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ جزیرۂ موریشس۔ بحرِ ہند

گنّے کے کھیت

سردی ختم ہونے کو آئی تھی۔ امسال کافی ٹھنڈ پڑی تھی۔ بارش سے زمین خوب سیراب ہوئی تھی۔ دراصل تپتی دھوپ اور کئی مہینوں کی گرمی کے بعد سبھی لوگ ابرِ کرم کا بے صبری سے انتظار کر رہے تھے۔

اب چاروں طرف سرسبز و شادابی تھی اور مناظرِ قدرت کا حسن دوبالا ہو گیا تھا۔ جو شجر اپنے حُسن کھو بیٹھے تھے اب بارش سے جیسے اُن میں تازگی اور جوانی عود کر آئی تھی۔ شاخیں، پتوں اور کلیوں سے ہری بھری لگ رہی تھیں۔ میلوں دور تک سینکڑوں بیگھے ☆ گنّے کے کھیت لہلہاتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ پہاڑوں کا سلسلہ جیسے گنّے کے کھیتوں کی نگہداشت کر رہا تھا۔ ماریشس بنیادی طور پر زرعی مُلک رہا ہے اور گنّے کی کاشت اُس کی آمدنی کا اہم ذریعہ۔

دور سے گنّے کے کھیت سبز جنگل لگ رہے تھے۔ اِن کھیتوں کے درمیان دُور سے ایک لمبی چمنی کے دھوئیں سے اندازہ ہوتا کہ شکر کا کارخانہ اب اپنے پورے آب و تاب سے سرگرمِ عمل تھا۔ گنّے کے کھیت اور شکر کے اِس کارخانے کی وجہ سے یہاں ہزاروں لوگ قرب و جوار کے گاؤں میں آباد تھے۔ انسان اور زمین کے درمیان یہ رشتہ کئی دہائیوں سے استوار تھا۔

گنّے کی کٹائی کا انتظار سبھی لوگ بے صبری سے کرتے تھے کیونکہ یہ اُمیدوں، خوشیوں اور نئی امنگوں کا موسم سمجھا جاتا۔ جن خوابوں کو سال بھر پالا جاتا اب اُن کو حقیقت کا جامہ پہنانے کا وقت

☆ ایکڑ جس طرح پاکستان میں زرعی زمین ناپنے کا پیمانہ ہے۔ اسی طرح ماریشس اور انڈیا میں بیگھہ ہے (ادارہ)

آ گیا تھا۔ مزدوروں کے لیے یہ زمانہ زیادہ محنت اور زیادہ روپے کمانے کا ہوتا ہے۔

طلوعِ آفتاب سے پہلے کھیتوں میں چاق و بند مزدور اپنے گنڈاسوں سے کوئی نغمہ گنگناتے ہوئے گنّوں کو ایک ایک کاٹتے ہوئے آگے بڑھتے۔ کام سے وہ تھکنے اور ہارنے والے نہیں تھے۔ کبھی کبھار کھیتوں سے کسی مزدور کے ٹرانزسٹر سے مقامی ریڈیو سٹیشن سے نشر کیے جانے والے ہندوستانی گانے فضا کو مدہوش کر دیتے۔ دن اور کام کے آغاز کے لیے اِس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہو سکتا تھا۔؟

گنّے کے کھیتوں سے کچھ ہی فاصلے پر ندی کی گود میں پام، صنوبر اور یوکلپٹس کے درخت سورج کی پہلی شعاؤں میں نہاتے نظر آتے۔ مینا، ابابیل، بلبل وغیرہ اپنی چہچہاہٹوں سے ندی کے بہتے ہوئے پانی کی دُھن کے ساتھ جیسے کوئی راگ الاپ رہے ہوں۔ وقتاً فوقتاً مینڈک کے ٹرانے سے پرندے اِدھر اُدھر پھدکتے۔ ہر چند کہ مزدور کے چہروں پر پسینے کی پہلی بوند نمودار ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگتی تھی۔ کمر سیدھا کرنے کے لیے ''ماتلو'' سگریٹ جلانے کے لیے وہ کبھی کبھی اپنے ہاتھ روک لیتے۔ آپس میں کبھی کبھار کوئی مذاق بھی کر لیتے تھے لیکن اکثر اپنی بے کسی اور مفلسی ہی کا رونا روتے۔

دیسی مرغ کی بانگ کے ساتھ آس پاس کی آبادی گوبر کی متعفن بُو سے جاگتی۔ گاؤں میں زندگی بسر کرنے والے لوگ رات کے آخری پہر جاگ جاتے۔ طبیلوں کو صاف کرتے، گاتے اور دیگر مویشیوں کو چارہ ڈالتے۔ عورتیں دودھ دوہتیں، پھر چائے بناتیں جس کے بعد وہ اپنے میاں کی ٹوکری میں چائے کی بوتل کے ساتھ دن کا کھانا رکھتیں جو دو تین پراٹھوں کے ساتھ دال، سبزی اور چٹنی پر مشتمل ہوتا۔ کسی روز اگر شام کے کھانے میں سُوکھی مچھلی کی تلی ہوئی کوئی بوٹی بچ جاتی یا بیوی اپنے حصّہ کی جان بوجھ کر نہ کھاتی تو اگلے روز میاں کا کھانا زیادہ مزیدار ہوتا تھا۔ بعض اوقات جب گھر پر سبزی یا دال نہ ہوتی تھی تو یہ مزدور سوکھی روٹی ہی لیے گنّے کے کھیت میں پہنچ جاتے تھے۔ پھر دو تین گنّوں کا رس نکالتے اور اپنے ٹفن میں جمع کرتے جس سے وہ اپنی روٹی بھگو کر

کھاتے۔ روزانہ شام کو گھر پر چاول ضرور بنتے۔ مسور اور ار ہر کی دال بھی آئے دن بنتی تھی اور اچار کے ساتھ چھوٹی لال مرچ بھی جو کھانے میں اشتہا پیدا کرتی تھی۔ بہر حال بیوی کو اس بات کا احساس تھا کہ کمانے والا ایک اور کھانے والے کم وبیش گھر پر دس تھے، اور اُس سے بہتر کون یہ سمجھ سکتا تھا کہ کس قدر خون پسینہ ایک کر کے گھر کا چولہا جلتا ہے۔ ویسے گائے پالنے کی ذمہ داری بیوی ہی کی ہوتی تھی۔ اسی وجہ سے چارہ لانا اُسی کا کام تھا۔ دودھ دوہنا بھی اُسی کا معمول تھا۔ تنگ دستی سے نمٹنے کے لیے گھر کا بچا ہوا دودھ بیوی گوالے کو بیچ دیتی تھی، جس کے عوض اُسے مہینے کے آخر میں کچھ روپے مل جاتے تھے۔ بعض اوقات زیادہ روپے حاصل کرنے کے لالچ میں عورتیں گھر پر کم سے کم دودھ استعمال کرتی تھیں اور زیادہ سے زیادہ بیچ ڈالتی تھیں۔

پُو پھٹتے ہی گنے کے کھیتوں میں چہل پہل نظر آتی۔ مرد اپنی مزدوری میں لگے ہوئے نظر آتے تو عورتیں درانتی لیے گنے کے پتوں کو پھرتی سے جمع کرتیں۔ اُن کے چہروں کی رونق سے اندازہ ہوتا کہ یہ کس قدر مطمئن تھیں کیونکہ انہیں اپنے جانوروں کے لیے وافر مقدار میں چارہ مل جاتا تھا۔

گنے کے اِن کھیتوں کے درمیان کچی سڑکوں پر چلنے والی بیڈفورڈ لاریوں کے انجن سے جیسے ہنگامہ رہتا تھا۔ مزدور جب دُور سے کسی والکسواگن کار کے انجن کی آواز سنتے تو انہیں اندازہ ہو جاتا کہ ''صاحب'' اپنے گنے کے کھیت دیکھنے آرہے ہیں۔ اُن کی کار نظر آتے ہی سردار مزدوروں کو زیادہ تیزی سے ہاتھ چلانے کی صدا لگاتا۔ جیسے ہی ان کی سفید کار گنے کے کھیت کے سامنے رکتی، سردار فوراً اُن کے استقبال کے لیے گاڑی کے قریب پہنچتا۔ دروازہ کھولتا اور جھک کر سلام کرتا۔ اُن کی موجودگی ہی کافی تھی کہ مزدور اور سردار سب احساسِ کمترین کا شکار ہو جاتے۔ صاحب سفید فام اور فرانسیسی النسل تھے۔ لحیم شحیم ہونے کے علاوہ ان میں احساسِ برتری تھا کیونکہ وہ مزدوروں کو اپنے گھر کے پالتو جانوروں سے بہتر نہیں سمجھتے تھے۔ صاحب کے آباؤاجداد تو آبادکار تھے۔ شکر کے کھیت اور کارخانہ سب ان ہی کی ملکیت تھی۔ صاحب تو سردار سے زیادہ کام کا تقاضہ کیا کرتے تھے وہ کسی بھی حال میں یہ سننے کے لیے تیار نہ تھے کہ کل کے مقابلے میں آج کچھ کم ٹن گنے،

کارخانے بھیجے گئے۔ سردار، صاحب کی تُرش باتوں کو اور کبھی کبھار ان کی گالی گلوچ کو صبر سے سنتا اور ان کے جانے کے بعد گویا وہ بدلہ مزدوروں سے لیتا۔ وہ مزدوروں کو بُرا بھلا اور زیادہ محنت کرنے کے لیے کہتا۔ کئی دفعہ صاحب کو دیکھتے ہی مزدور آپس میں بڑبڑاتے۔ ان کو بددعائیں دیتے لیکن کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ کبھی صاحب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرے۔ گنّے کے کھیتوں کے درمیان صبح سے لے کر شام تک بیل گاڑیاں نظر آتیں، جن کو ہانکتے ہوئے گاڑی بان کارخانے کی جانب جاتے۔ یہ بیل سر جھکائے اپنے مالک کے ہمراہ، بوجھ سے دبے، جھاگ ٹپکاتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے۔

گنے کے کھیتوں میں مزدور اپنی روٹی کے لیے کبھی صبح کی بارش تو کبھی دوپہر کی دھوپ سے بے خوف و خطر گنے کے انبار اپنے کاندھوں پر لیے ایک تختہ نما سیڑھی سے گزر کر لاری میں لادتے۔ عورتیں گنے کے پتوں کے گٹھے سر پر لیے تیز رو اپنے گھر کی جانب قدم بڑھاتیں کیونکہ انہیں نہ صرف گھر کے کام کاج کو نمٹانا ہوتا بلکہ گاؤں کی ندی پر کپڑے بھی دھونا ہوتے۔ جس گھر میں بڑی بیٹی ہوتی وہ زیادہ خوش نصیب سمجھی جاتی، کیونکہ بارہ ایک بجے تک جب وہ گھر لوٹتی، تو اُسے کم سے کم گھر کا رُوکھا سُوکھا تیار شدہ کھانا مل جاتا۔ بیٹیاں گھر پر اس وجہ سے رہتی تھیں کہ انہیں اپنے چھوٹے بھائی بہنوں کو دیکھنا پڑتا۔ بہوؤں کی تقدیر ایسی نہیں تھی کہ شادی کے بعد صرف گھر کی ذمہ داری سنبھالتیں۔ دو ایک سال کے بعد کم و بیش سبھی بہوئیں اپنے میاں کے گنّے کے کھیت میں ہاتھ بٹاتیں یا گائے پالتیں۔ اکثر گھروں کی بہوئیں قریبی جنگل سے لکڑیاں چُن لاتی تھیں۔ گلی محلّے کے واحد سرکاری نل سے روزانہ پانی بھر لانا بھی اُن کی ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ صبح اور شام کے وقت نل کے سامنے محلّے بھر کی عورتیں نظر آتیں۔ سبھی کے ہاتھ میں ڈول یا بالٹی ہوتی۔ نل کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی باری کے انتظار میں یہ عورتیں دنیا بھر کی باتیں کرتیں۔ کون بیمار ہے؟ کس کے یہاں بچہ پیدا ہوا ہے؟ کس کی بیٹی کی شادی طے پائی ہے۔ کون اپنی بیوی کو شراب پی کر زدوکوب کرتا ہے۔ کس کی ساس جابر ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ بعض اوقات ان عورتوں کی گفتگو تو تو میں

میں تک پہنچ جاتی۔ پانی لینے کے لیے یہ عورتیں قطار میں کھڑی نہیں ہوتی تھیں اور جب کوئی جان بوجھ کر یا غلطی سے کسی کی جگہ پر اپنی بالٹی میں نل سے پانی لیتی تو اس پر بھی جھگڑا ہوتا۔ لیکن عورتیں بھی گاؤں کے ان بھولے بھالے بچوں ہی کی طرح تھیں کہ آج جھگڑا کیا اور اگلے روز نل پر ملاقات ہونے پر تمام رنجشوں کو بھول جاتیں۔ گاؤں کے بانکے ترچھے نوجوان شام کے وقت اس طرف سے ضرور گزرتے۔ لیکن شاذونادر ہی کوئی شرافت کی دہلیز کو پار کرتا۔ اگر اس قسم کی کوئی بات ہو جاتی تو یہ بات گاؤں میں آگ کی طرح پھیلتی اور اس کا انجام بھی صنفِ نازک ہی کو بھگتنا پڑتا تھا۔ بچے بھی شام کے وقت اپنی ماں کا لہنگا پکڑے نل تک آتے۔ کبھی آپس میں کھیلتے تو کبھی کسی نٹ کھٹ کی شرارت کی وجہ سے کوئی روتا جس پر عورتیں اپنے بچوں کے لیے بھی ایک دوسری کو لعنت ملامت کرتیں۔ ہر پندرہ روز قرب و جوار کے گاؤں میں خوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔ مزدور اس دن کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتے۔ گورے مالکوں کے دفتر کے سامنے دوپہر کے بعد ایک لمبی قطار نظر آتی۔ دراصل اپنی کڑی محنت و مشقت کے لیے مزدور اپنی اجرت کا انتظار کرتے۔ تنخواہ لینے کے بعد اُن میں سے کئی مزدور گھر جانے کی بجائے اپنے گاؤں کے واحد چینی کی دکان پر جاتے۔ ''کپتان'' سے گاہک بھوجپوری میں بات کرتے اور وہ جواب چینی لب و لہجہ میں اسی بولی میں دیتا۔ بچوں کے لیے ٹافی اور بسکٹ خریدنے کے بعد محنت و مشقت سے جو بدن چکنا چور ہو رہا تھا اُس سے نجات حاصل کرنے کے لیے مزدور اپنے رفقاء کار کے ساتھ گزک اور شراب ہڑکاتے پھر اپنے اپنے گھر کو چل دیتے۔

پھیری لگانے والے بھی اس دن کا بے چینی سے انتظار کرتے کیونکہ یہ اُن کی کمائی کا دن ہوتا تھا۔ وہ گلی کوچے گھوم گھوم کر اپنا سامان فروخت کرتے۔ غرضیکہ زمین کی بدولت سبھی کماتے۔ مزدور جیب میں کچھ نوٹ اور سکے لیے گھر آتے آتے متعدد منصوبے بناتے۔ کوئی اپنے گھر کی توسیع کے بارے میں سوچتا، کوئی بیٹی کی شادی کے لیے فکرمند تھا، کوئی بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی خریدنا چاہتا تھا، تو کوئی اپنی سبکدوشی کے بارے میں سوچتا۔ تاہم ہر کسی کی اپنی چھوٹی سے دنیا آباد تھی۔ لیکن اپنے

علاقہ کی دکان سے ان پندرہ دنوں میں جو کچھ ادھار پر لیا تھا اُس کو چکانے کے بعد ان غریب لوگوں کی تمام امیدوں پر پانی پھر جاتا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کٹائی مزدور اور اُس کے اہل وعیاں کے لیے خوشیوں کی بشارت تھی اور اُس کا اختتام تشویشناک دنوں کا انتباہ۔

مزدور شام کے وقت اپنے دوستوں کے ساتھ گاؤں کے کسی برگد یا پکائین کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر چہ میگوئیاں کرتے۔ کچھ دکان کے برآمدے پر گپ شپ کرتے، تو کچھ نائی کی دوکان پر ادھر اُدھر کی باتیں کرتے۔ ایک طرح سے جیسے یہ گاؤں کی پنچایت تھی کیونکہ گاؤں کے ہر اہم معاملے کو یہیں حل کیا جاتا تھا۔ شادی بیاہ کے موقعہ پر یہیں طے کیا جاتا تھا کہ کس روز گاؤں کے نوجوان شامیانہ لگائیں گے، یا کسی کی وفات پر کیسے اُس کے گھر والوں کی مدد کی جائے گی۔ یہیں پر سارے منصوبے بنائے جاتے تھے۔ چوری یا کسی معاشرتی برائی کے لیے گاؤں کے بڑے بوڑھے ان ہی درختوں کے نیچے جمع ہوتے اور ملزم کو سزا بھی دیتے۔ چور کو اگر پکڑ لیا جاتا تو اُسے یہیں سے مونگے کا ہار پہنا کر سارا گاؤں گھمایا جاتا۔ مسلمان شرابیوں کو بھی یہی سزا دی جاتی تھی۔

مجید شاذ و نادر اپنے دوستوں کے ساتھ درخت کے سائے میں بیٹھتا تھا۔ وہ تو اپنی دکان پر اپنے دوستوں کے ساتھ دنیا بھر کی باتیں کرتا تھا۔ کبھی مقامی سیاست پر بحث ہوتی، تو کبھی کسی مذہبی معاملے کو لے کر بحث اتنی طول پکڑ جاتی کہ نوبت آستین چڑھانے تک آ جاتی۔ لیکن مجموعی طور پر مجید اور اُس کے دوست اپنی غربت اور فلاکت زدگی کی فسانہ خوانی ہی کرتے۔ اس بات پر بھی وہ دکھ اور افسوس کا اظہار کرتے کہ وہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ جو تھوڑی بہت اردو یا دین کی باتیں انہیں آتی تھیں وہ تو مسجد کے امام کی تقریروں سے کسب فیض کیا تھا یا وقتاً فوقتاً ہندوستان سے تشریف لانے والے مبلغین دین سے ہی سیکھی تھیں۔ مجید کے والد بھی مزدور تھے اور اُن کو بھی اپنے تمام دوستوں کی طرح گنے کے کھیتوں میں ہی اپنی روزی روٹی ڈھونڈنی تھی۔ بارہ تیرہ سال کی عمر سے مجید گنے کے کھیتوں میں اپنے والد کا ہاتھ بٹانے کے لیے جاتا۔ لیکن اکثر وہ کام میں پیچھے رہ جاتا جس کے لیے اُسے لعنت ملامت کی جاتی تھی۔ مجید ان باتوں سے دل گیر ہو جاتا اور سوچتا کہ گنے کے کھیتوں

میں کام کرنا اُس کے بس کی بات نہیں۔ وہ دل ہی دل میں کڑھتا اور اس عذاب سے نجات حاصل کرنے کا کوئی ذریعہ ڈھونڈتا۔ ایک روز ہمت کر کے اُس نے اپنے والد سے کہہ ڈالا کہ وہ گنے کے کھیتوں میں کام نہیں کرے گا کیونکہ اُس سے یہ کام نہیں ہوتا۔ پہلے تو اُس کے والد نے اُسے جلی کٹی سنائیں لیکن جب اُس کے نحیف جسم کو دیکھا تو اُس کا کلیجہ موم ہو گیا۔ مجید نائی بننا چاہتا تھا۔ باپ کی رضامندی حاصل کرتے ہی وہ قریب کے کسی گاؤں میں حجام کی دکان پر بیٹھنے لگا اور سال بھر میں وہ بھی حجام ہو گیا۔ اس طرح وہ گورے مالکوں کے کھیتوں میں جانے سے بچ گیا۔ مجید کے والد بہت محنتی آدمی تھے۔ گورے مالکوں کے کھیتوں میں کام کرنے کے علاوہ وہ جزوقتی طور پر دوسروں کے کھیت میں بھی کام کرتے تھے۔ جب اُن کے باقی دوست اتوار کو گھر پر آرام کرتے تھے تو مجید کے والد گاؤں کے سیٹھ کے کھیت میں کام کرتے تھے۔ اس طرح محنت و مشقت کر کے مجید کے والد دو بیگھے زمین خریدنے میں کامیاب ہوئے۔ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ مجید کے والد نے بڑی بیوقوفی کی جو گورے مالکوں سے ایسی پتھریلی زمین خرید لی۔ زمین پتھریلی ضرور تھی اور گورے آباد کار زرخیز زمین کیوں ہندوستانی نسل کے مزدوروں کو بیچتے؟ شکر کے کارخانے میں بھی تو اُن کو نوکری نہیں ملتی تھی۔ ہندوستانی مزدور کے آباواجداد تو ماریشس گنے کے کھیت میں مزدوری کے لیے لائے گئے تھے اور اگر وہ کچھ پیسے جمع کر کے گوروں سے زمین خرید رہے تھے تو اس میں بھی گوروں کا رحم و کرم شامل تھا کیونکہ اگر وہ چاہتے تو یہ زمین انہیں نہ بیچتے۔ بہرحال مجید کے والد نے اپنی لگن اور محنت سے پتھریلی زمین کو ایسے زرخیز کھیت میں تبدیل کر دیا کہ چند ہی مہینوں میں اُس میں ہرے بھرے گنے کے پودے لہلہانے لگے۔

مجید کے والد ساٹھ سال کی عمر تک پہنچتے پہنچتے ایسے شدید بیمار ہوئے کہ بڑھاپے کی ۲۲ روپے کی پنشن کا خواب آنکھوں میں لیے لقمۂ اجل بن گئے۔ آخری سانسیں اپنے گنے کے کھیت ہی میں لی تھیں۔ والد کے انتقال سے مجید بے سہارا ہو گیا اور اُسے لگا کہ نہ صرف گھر کا ستون ہی نہ رہا، بلکہ زندگی کا مردانہ وار مقابلہ نہ کیا جائے تو باقی عمر تنگ دستی میں گزرے گی۔ وہ اپنی دکان پر بیٹھے ان ہی

خیالات میں مستغرق رہتا۔ کم سے کم ایک بات کے لیے وہ خوش تھا کہ باپ کے مرنے سے پہلے اُس نے شادی کر لی تھی۔ مجید اپنے خاندان کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اُس کی تین بہنوں کی شادی ہو چکی تھی۔ وہ سب اپنے اپنے گھر میں خوش تھیں اگر چہ وہ بھی اپنے بھائی ہی کی طرح تنگ دستی اور غریبی کا شکار تھیں۔ جب اُس کی دکان پر کوئی بھولا بھٹکا شخص حجامت بنوانے کے لیے آ جاتا تو وہ ان یادوں سے نکل کر کام میں لگ جاتا۔ اُس کی دکان دوسرے حجاموں کی طرح نہیں تھی۔ ایک معمولی سا کمرہ تھا جو مشکل سے بارہ مربع فٹ کا تھا، جس کی دیواریں اُس زمانے کے فلمی اداکاروں کی تصویروں سے سجی ہوئی نہ تھیں۔ صرف ایک لمبی سی میز تھی جس پر دو بڑے شیشے لگے تھے۔ اس میز پر چار پانچ قسم کی قینچیاں، دو تین اُسترے، کچھ کنگھیاں، غازے کا ایک ڈبہ، الکحل کی ایک چھوٹی سی بوتل نیز صابن اور بیلڈ قرینے سے رکھے تھے۔ بال بنانے کے لیے آئینوں کے عین سامنے دو بڑی کرسیاں تھیں باقی لکڑی کی دو تین معمولی کرسیوں کے علاوہ صابن کا ایک ڈبہ بھی تھا جو لکڑی کا تھا، جس پر بیٹھ کر بچے اپنے بال بنواتے تھے۔ جب مجید کی دکان پر کوئی نہیں ہوتا تو وہ موقعہ سے فائدہ اٹھا کر کبھی اپنی دکان کے سامنے بیٹھ جاتا اور سڑک پر آتے جاتے لوگوں کو دیکھتا۔ کبھی بازو میں درزی یا پنساری سے گپ شپ کرتا یا گھر کے لیے سودا سلف خریدتا لیکن دن خراب گزرتا تو وہ دکان سے یا کچھ نہیں خریدتا یا اُدھار پر دکاندار سے سامان لیتا۔ سارا دن دکان پر بیٹھنے کے باوجود اُسے کبھی کبھار ڈیڑھ دو روپے بھی نہ ملتے۔ لیکن ستر کی دہائی میں ان ڈیڑھ دو روپیوں میں ایک کلو شکر، آدھا کلو دال، ایک کلو آٹا، ایک کلو چاول، صابن وغیرہ مل جاتا تھا۔ سنیچر اور اتوار کو وہ کچھ زیادہ کما لیتا تھا۔

کبھی کوئی تہوار آ جاتا تو اُس موقعہ پر وہ چند روپے مزید کما لیتا تھا۔ لیکن اُس کے واقف کار اور شناسا اتنے سارے تھے کہ وہ بلا جھجک بال بنواتے اور سال کے آخر میں کچھ روپے اُس کے ہاتھ میں رکھ دیتے۔ وہ اپنے معاشرے کے باقی لوگوں کی خستہ حالی سے اچھی طرح واقف تھا اسی لیے وہ نہ تو بال بنانے کا کوئی حساب رکھتا اور نہ اُن سے کبھی معلوم کرتا کہ کیا سال بھر حجامت بنانے

کی رقم اتنی ہی ہوتی تھی؟ بہر حال شادی کے بعد اُس کے کاندھوں پر صرف بیوی اور ماں کی ذمہ داری نہ تھی کیونکہ اب اُس کے پانچ بیٹے تھے۔ اُن کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے وہ کوئی کسر نہیں چھوڑتا۔ وراثت میں جو گنے کے کھیت ملے تھے اب اپنے خالی اوقات میں مجید اُن میں محنت کرتا تھا تا کہ کچھ زیادہ گنے پیدا ہوں اور سال کے آخر میں اُسے کچھ زیادہ روپے حاصل ہو جائیں گاؤں کا دکاندار اسی امید پر اُسے بلا تامل سودا سلف ادھار پر دے دیتا تھا کیونکہ اُسے معلوم تھا کہ گنے کی کٹائی سے اُسے کچھ روپے مل جائیں گے تو وہ اپنا قرض چکا دے گا۔

لائی ٹانگ دکاندار تو جیسے گاؤں کا ساہوکار تھا۔ جن لوگوں کے یہاں شادی وغیرہ ہوتی اُن کو چاول، آٹا اور ضرورت کے دوسرے سامان اُدھار پر دینے کے علاوہ اُن کو قرض بھی دے دیتا تھا اور ضمانت گنے کی کٹائی سمجھی جاتی تھی۔ ابھی چند ہفتے قبل سُکھ دیو کی گا بھن گائے اچانک مرگئی۔ شاید کوئی زہریلی قسم کی گھاس یا بیل کھالی تھی۔ سُکھ دیو کے دکھ میں تو سبھی شریک تھے لیکن لائی ٹانگ دکاندار نے ہی اسے پانچ سو روپے ادھار دیے تھے تا کہ وہ کہیں سے ایک بچھڑی خرید لے۔

مجید کبھی کبھار ماضی کے آئینہ میں دیکھتا تو اُسے اپنی بہنوں کی شادی نظر آتی۔ اُس کے والد نے بھی لائی ٹانگ دکاندار سے چاول، آٹا وغیرہ اُدھار پر ہی لیا تھا۔ دراصل مجید کے والد نے اپنی بیٹیوں کی شادی کے لیے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ویسے تو سبھی لوگ اپنے بچوں کی شادی کے لیے وہ سب کچھ کرتے ہیں جو انہیں کرنا چاہیے لیکن مجید کے ابّو نے تو اپنی حیثیت سے کچھ زیادہ ہی کیا تھا۔ دس دس جوڑے کپڑے، دس بارہ چادریں جن میں عمدہ کڑھائی کی گئی تھی، اُن کے زیورات وغرہ سبھی بیٹیاں اپنے ساتھ لے گئی تھیں۔ پھر محلّے بھر کے لوگوں کو شادی کے روز کھانے کی دعوت۔ شادی سے پہلے رت جگے کا اہتمام اور خواتین کا آپس میں ناچنا گانا کتنا سہانہ منظر تھا۔ ان یادوں کے جھروکوں میں مجید کو اپنے والد کا عکس بار بار نظر آتا۔

اگر چہ مجید کے والد بیٹیوں اور بیٹے میں کوئی فرق نہیں کرتے تھے لیکن اپنے فرزند سے وہ زیادہ ہی لاڈ پیار کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ اولاد میں مجید سب سے چھوٹا تھا۔ بہنوں کا

بھی وہ بڑا لاڈلا تھا لہٰذا جب اُس کی شادی کا وقت آیا تو مجید کے والد نے اگر چہ بیٹیوں کی شادی کے موقع پر مہمانوں کو ''بگھاڑا'' چاول اور دال گوشت کھلایا تھا لیکن بیٹے کی شادی پر مہمانوں کو بریانی کھلائی گئی تھی۔ نکاح کے بعد مہمانوں کو ''کھاجا'' مٹھائی دی گئی جو رت جگے کے دوران ساری رات مجید کے والد کے کسی واقف کار نے بنائی تھی۔ اسی رات عشاء کی نماز کے بعد مجید کے والد کے سبھی دوست اور قرب و جوار کے سبھی لوگ محفلِ میلاد میں مدعو تھے۔ مجید کو یاد ہے اُس موقعہ پر اُس کے والد نے بھی ایک نعت پڑھی تھی۔ دعا کے بعد مہمانوں کو گلگلے، خُرما اور گرم گرم چائے دی گئی تھی۔ غیر مسلم دوست بانس سے بنے شامیانے میں ہنسی مذاق کر رہے تھے اور بریانی بنانے والے خانساماں کے اردگرد بیٹھے پیاز اور آلو کے چھلکے اتارنے میں لگے تھے۔ محفل کے بعد پھر سبھی کو ضیافت میں شریک کیا گیا۔ اُسے یہ بات بھی یاد تھی کہ کس طرح شادی سے دو ہفتے قبل وہ اپنے دوستوں کے ساتھ جنگل سے بانس کاٹ لائے تھے جس کے بعد انہوں نے شامیانہ بنایا تھا۔ پورٹ لوئس سے مجید کے والد اُس کے لیے ''جناح کیپ'' اور سفید ہار بھی خرید لائے تھے۔ رت جگے کے موقع پر اُس کی بہنوں نے اُس کے دائیں ہاتھ کی دو انگلیوں میں مہندی لگائی تھی اور کس طرح وہ اپنی شیروانی میں سج دھج کر نکاح کے لیے اپنے گاؤں کے سب سے امیر آدمی کی گاڑی سے گیا تھا۔ برات میں مشکل سے بیس پچیس لوگ ہوں گے کیونکہ جو لوگ اس کارِ خیر میں شریک بھی ہونا چاہتے تھے اُنہیں سواری کی سہولت حاصل نہیں تھی، کسی کے پاس اچھے کپڑے نہیں تھے یا کرایہ نہ تھا۔ مجید کی شیروانی، جناح کیپ، اُس کی بیوی کا سفید غرارہ اور زیورات آج بھی الماری کے کسی کونے میں حفاظت سے رکھے تھے جنہیں دیکھ کر آج اُن کے بچوں کو ہنسی آتی تھی۔ مجید جب بھی اِن کپڑوں کو دیکھتا تو اُس کی بہت ساری پُرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔ آخر ان ہی کپڑوں میں اپنے باپ کے ساتھ تصویر کھینچوائی تھی اور وہی واحد فوٹو دیکھ کر وہ دو آنسو بہا لیتا تھا۔ مجید کے یہاں غم توانائی کا محرک تھا اور زندگی کی کشمکش اور جدوجہد میں وہ کشاں کشاں سرگرداں تھا۔ جب تک مجید کے بیٹے ابتدائی جماعتوں میں زیرِ تعلیم تھے وہ اُن کے لیے فکرمند نہ تھا کیونکہ سرکاری پرائمری

اسکول میں تعلیم مفت تھی۔ لیکن جب سکنڈری اسکول جانے کا وقت آیا تو اُسے یک لخت محسوس ہوا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُن کے بیٹوں کا مقدر بھی اُسی قلم سے لکھا گیا ہو جس سے نہ صرف اُس کا بلکہ اُس کے اسلاف اور اُس کے گاؤں کے سبھی لوگوں کا رقم کیا گیا تھا۔ وہ ہر قیمت پر زمانے کے تھپیڑوں سے اپنے بیٹوں کو بچانا چاہتا تھا اسی لیے اپنے گنے کے کھیت میں وہ روزانہ خود کام کرتا تھا۔ گنے کے کھیت گھر سے اتنے دور تھے کہ کم سے کم وہاں تک پہنچنے کے لیے ایک گھنٹہ مسلسل چلنا پڑتا تھا۔ مجید ہر سال سوچتا کہ کھیت جانے کے لیے اُسے ایک سائیکل خرید لینا چاہیے لیکن ایک اچھی انگلستانی ریلے سائیکل کے لیے ۳۰۰ سو روپے خرچ کرنے پڑتے مگر اُس کی ترجیحات میں دوسری اہم چیزیں تھیں۔

مجید صبح سے لے کر دوپہر تک گنے کے کھیت میں محنت مزدوری کرتا اور شام کو اپنی حجامت کی دکان پر بیٹھتا۔ اسکول میں تعلیم اگرچہ مفت تھی لیکن بچوں کے لیے کتاب، کاپی، قلم اور دوسری ضرورت کی چیزیں خریدنی پڑتی تھیں۔ اب روزانہ دو بڑے بیٹوں کے لیے بس کا کرایہ، اُن کی ٹیوشن کے لیے فیس وغیرہ کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔ مجید جیسے اس بوجھ سے دبا جا رہا تھا اور اکثر اوقات سوچتا کہ بیٹوں کو اسکول بھیجنا کتنا مشکل کام ہے۔ گاؤں میں اُس کے دوست کے بچے چھ سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد یا تو مزدوری کرتے یا کسی نہ کسی پیشے سے جڑ جاتے اور گھر کا چولہا جلانے کے لیے وہ اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق مدد کرتے تھے۔ کھیت سے تو سال کے آخر میں جب گنے کارخانے بھیجے جاتے تب ہی پیسے ملتے تھے۔ بڑے بیٹے کے امتحان کی فیس بھرنے کا جب وقت آیا تو مجید کی بیوی نے سال بھر جو دیسی انڈے، مرغی انڈے والے کو بیچے تھے وہی پیسے کام آ گئے۔ دوسرے بیٹے کے لیے لائی ٹانگ دکاندار نے مجید کو وہ رقم قرض کے طور پر دے دی تھی جو اُس نے گنے کی کٹائی کے بعد اُسے واپس کیے تھے۔ اب بچوں کی تعلیم کے لیے کبھی کہیں کسی عزیز کی شادی وغیرہ میں جانا ہوتا تو مجید کوئی بہانہ بنا دیتا کیونکہ شادی میں جانے کے لیے نہ صرف بچوں کے لیے نئے کپڑے بنوانے پڑتے بلکہ شادی کے گھر میں خالی ہاتھ جانا اُس کے اصولوں کے

خلاف تھا۔ لہٰذا اُس کے لیے سب سے آسان طریقہ تو یہ تھا کہ وہ کوئی بہانہ کرلے اور شادی ہونے سے معذرت کرلے۔ کبھی کبھار جب مجید کی والدہ بیمار پڑ جاتیں تو اُنہیں کسی نجی ڈاکٹر کے یہاں لے جانا پڑتا تھا۔ سرکاری ہسپتال میں اگرچہ علاج اور دوا دونوں مفت تھی لیکن تسلی بخش نہیں تھی۔ نجی ڈاکٹر کے یہاں علاج کرانے کا مطلب دواخانے سے دوا خریدنا ہوتا تھا۔ بعض اوقات مجید کے یہاں کافی پیسے نہیں ہوتے تھے تو اُسے اپنی ماں سے پیسے لینے پڑتے جو انہیں پنشن کے طور پر ملتے تھے اور جو وہ بچا بچا کر رکھتی تھیں۔ مجید کو اپنی ماں کے علاج کے لیے اُن سے پیسے لینے میں بڑی عار محسوس ہوتی تھی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ ماں کا خیال رکھنا اُس کا فرض بنتا تھا۔ بہرحال مجید کی ماں پنشن کے پیسے سے اپنے پوتوں کے لیے کچھ نہ کچھ خرید لاتی تھیں۔

کبھی کبھار وہ اپنی بیٹیوں کے یہاں جاتیں تو اپنے نواسوں اور نواسیوں کے لیے گھر سے کچھ بنا کر اور دکان سے کچھ خرید کر لے جاتیں۔ آخر ماں تھیں اور نانی بھی۔ اپنی بیٹیوں کی خستہ حالی دیکھتیں تو لوٹتے وقت اُنہیں بھی کچھ روپے دے دیتیں۔ مجید کی والدہ جب بھی اپنے شوہر کا ذکر کرتیں تو اُن کے آنسو اُمڈ آتے اور اُن کی آواز بھرّا جاتی۔ وہ بار بار یہی کہتی تھیں کہ مجید کے والد اگر آج یہ دو بیگھے گنّے کے کھیت چھوڑ کر نہ گئے ہوتے تو ان سب کی کیا حالت ہوتی۔ بعض اوقات مجید کی بیوی کو یہ باتیں گراں گزرتیں لیکن ساس کے سامنے منہ کیسے کھول سکتی تھی۔ پھر جب ٹھنڈے دماغ سے سوچتی تو وہ بھی اسی نتیجے پر پہنچتی کہ اگر گنّے کے کھیت نہ ہوتے تو بچے اسکول جانے سے بالکل محروم رہ جاتے اور سال بھر جو چھوٹا موٹا قرض اِدھر اُدھر سے لیا جاتا تھا اُس کو کیسے چکایا جاتا؟ کئی بار دل میں خیال آیا کہ میاں سے گنّے کے کھیت بیچ ڈالنے کو کہا جائے کیونکہ بہت سارے لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف جا رہے تھے۔ اُن کا یہ خیال تھا کہ جب تک گھر میں پھاوڑا اور درانتی ہوگی وہ تنگ دستی ہی میں زندگی گزاریں گے۔ ''سنا ہے شہر میں نوکری کے بہت سے مواقع ہیں۔ کم سے کم شہر کی طرف نقل مکانی کر جاتے تو کھیتوں کے عذاب سے بچ جاتے''۔ لیکن پھر اُسے اپنے مرحوم والد کی باتیں یاد آتیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ بزرگوں کی خریدی ہوئی زمین کو کبھی

نہیں بیچنا چاہیے کیونکہ ایک دن ایسا آئے گا کہ پیسہ ہوتے ہوئے بھی ہم زمین نہیں خرید سکیں گے۔ مجید کی اہلیہ ان باتوں کو سوچ کر ٹھنڈی آہیں بھرتی۔

کٹائی کے زمانے میں مجید دل ہی دل میں خوش ہوتا کہ اب اُس کے ہاتھ کچھ پیسے آسکتے ہیں۔ جب بھی پورٹ لوئس جاتا اور سیٹھوں کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو وہ جارجیٹ، تافتا اور پاپلین کے نئے ڈیزائین اور رنگ برنگے کپڑوں کو دیکھتا اور سوچتا کہ جونہی کٹائی سے وہ فارغ ہو جائے گا اور اس کے ہاتھ پیسے آجائیں گے تو وہ بیوی اور ماں کے لیے ایک دو جوڑے کپڑے ضرور خریدے گا۔ گویا وہ اِن ہی خیالات سے اپنے دل کو بہلاتا تھا اور گھر لوٹ جاتا تھا۔ اب بچے بڑے ہو گئے تھے، اسکول کے یونیفارم، اُن کے جوتے، کتابیں سب کچھ خریدنا پڑتا تھا۔ گویا روپے نومبر اور دسمبر میں اسی وجہ سے آتے تھے۔ گنے کے کھیت سے زیادہ پیسہ کمانے کے لیے اب مجید کٹائی کے لیے مزدوروں کو نہیں لیتا تھا بلکہ وہ بھی عام مزدورں کی طرح اپنے کھیت کے گنوں کو ایک ایک کر کے کاٹتا تھا۔ مجید کٹائی کے دوران غروب آفتاب تک اپنے کھیت ہی میں رہتا۔ ایک دن گنے کاٹتا اگلے روز اُن کو ٹرک میں لاد دیتا۔ اس طرح وہ ہر سال پچاس ساٹھ ٹن کاٹ کر کارخانے بھیجتا تھا جس کے عوض مزدوری کے پیسے وہ بچالیتا تھا۔ مجید ان پیسوں سے نہ صرف لائی ٹانگ کا قرض چکاتا بلکہ ماں اور بیوی کے لیے پورٹ لوئس سے کپڑے خرید لاتا۔ کبھی کبھار جب فصل اچھی ہوتی تھی اور شکر کے اچھے دام ملتے تھے تو گھر کے لیے برتن، چادر کمبل وغیرہ خرید لاتا تھا۔ پھر اس کی والدہ کو اس بات پر اصرار تھا کہ جب فصل اچھی ہو تو غریبوں کو کھانا کھلانا چاہیے۔ لہٰذا کم وبیش ہر سال کٹائی کے بعد گھر پر قرآن خوانی کا اہتمام کیا جاتا امام صاحب (میاں جی) آتے فاتحہ پڑھتے جس کے بعد بچوں کو ملیدہ ملتا۔ بچے بڑی بے صبری سے فاتحہ کا انتظار کرتے کیونکہ اس سے قبل وہ شیرینی کو ہاتھ نہیں لگا سکتے تھے۔ اُنہیں یہ بتایا جاتا تھا کہ فاتحہ سے پہلے شیرینی کھانے سے منہ ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔ امام صاحب کھانا کھانے کے بعد (سوّیا) سوا روپیہ لیتے پھر مغرب کی نماز سے قبل کھانا کھانے کے بعد چل دیتے۔ قرآن خوانی کے موقعہ پر سادہ چاول اور دال گوشت ہی لوگوں کو کھلایا جاتا تھا جو

بہت ہی خوش حال لوگ تھے اُن کے یہاں ایسے موقعوں پر بریانی بنائی جاتی تھی۔ مدرسہ کے بچے جو امام صاحب کے ساتھ قرآن خوانی کے لیے تشریف لاتے اُنھیں بھی دس دس پیسے دیے جاتے جو وہ خوشی خوشی لیتے اور اپنے دوسرے بھائی بہنوں کے ساتھ قلفی، مونگ پھلی یا ٹافی خریدتے۔ جب تک بی بی جمیرن یعنی مجید کی والدہ کا بس چلتا تھا ہر سال بلاناغہ گنّے کی کٹائی کے بعد پاس پڑوس کے لوگوں کو اور دیگر غرباء کو کم سے کم سال میں ایک بار ضرور کھانا کھلایا جاتا تھا۔ بی بی جمیرن سمجھتی تھیں کہ اسی نیک کام کی برکت سے ہر سال فصل اچھی ہوتی ہے اور ان کے کنبے کے سبھی افراد ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے ہیں۔ ہر جمعرات کو مجید گھر پر مغرب کی نماز کے بعد قرآن شریف کی تلاوت کرتا تھا۔ اگر کبھی کسی وجہ سے وہ اس روز تلاوت نہیں کر پاتا تھا تو اُس کی شامت آجاتی تھی۔ اُس کی ماں اُس پر خوب برستی تھیں دراصل گاؤں میں سبھی لوگ اس روز مغرب کی نماز کے بعد گھر پر اگربتی یا لوبان جلانا باعثِ ثواب سمجھتے تھے۔ جو لوگ خود قرآن شریف نہیں پڑھ سکتے تھے وہ امام صاحب کو گھر بلا کر فاتحہ پڑھوا لیتے۔ یہ اُن کی ضعیف الاعتقادی تھی یا حکمت عملی وہ بہتر سمجھتے ہوں گے۔ لیکن ایک بات طے تھی کہ سبھی کے یہاں جمعرات کو قرآن شریف کی تلاوت ضرور ہوتی۔ مجید کی والدہ اگرچہ پڑھی لکھی نہیں تھی لیکن مغرب کی نماز کے بعد چراغ نامہ، نور نامہ ضرور پڑھتی تھیں جو انھیں زبانی یاد تھیں۔ اسی طرح وہ اپنے پوتوں کو یا کبھی اپنے نواسوں کو بھی حاتم طائی کا قصہ، چہار درویش، علی بابا وغیرہ کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ دراصل یہ کہانیاں بی بی جمیرن بچپن کے زمانے سے اپنے باپ دادا سے سنتی آرہی تھیں اور ایک طرح سے سینہ بہ سینہ یہ کہانیاں محفوظ ہوگئی تھیں۔

مجید کی والدہ اپنے پوتوں کو بہت چاہتی تھیں۔ بعض اوقات وہ اپنے بیٹے اور بہو دونوں پر برس پڑتی تھیں کیونکہ وہ یہ برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں کہ بچوں کو مارا پیٹا جائے۔ وہ سختی کے حق میں تھیں لیکن جسمانی اذیت انہیں!! کبھی کبھار مجید کو بہت غصہ آتا تھا اور اپنی ماں سے کہہ بھی ڈالتا تھا کہ اُن ہی کے لاڈ پیار کی وجہ سے بچے خراب ہو جائیں گے۔ لیکن وہ دادی تھیں اور اپنے پوتوں سے اُن کی محبت فطری تھی۔ بعض اوقات جب مجید کی بہنیں میکے آتیں تو وہ اپنی ماں

سے یہ ضرور کہتیں کہ وہ اپنے نواسوں کے مقابلے میں اپنے پوتوں کو زیادہ عزیز رکھتی ہیں۔ لیکن بی بی جمیرن یہ بات ماننے کے لیے ہرگز تیار نہ تھیں۔ وہ کہتی تھیں کہ سبھی بچوں میں اُن ہی کا خون دوڑتا ہے اور سبھی سے وہ برابر محبت کرتی ہیں۔ ہاں! یہ ضرور ہے کہ صبح و شام تک مجید کے بیٹے اُن ہی کی سرپرستی میں پرورش پا رہے تھے۔

مجید کا بیٹا اب ۱۸ سال کا ہو گیا تھا۔ فارم ۶ کا طالب علم تھا اور جسامت کے اعتبار سے وہ اپنے باپ سے بھی زیادہ بڑا دکھائی دیتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ جب باپ کا جوتا بیٹے کے پاؤں میں آ جائے تو اُسے چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ دادی اپنے پوتے پر جتنا ناز کرتی کم تھا۔ وہ اکثر کہا کرتی تھیں کہ ساجد تو اپنے دادا کی شبیہ ہے۔ اگر چہ ساجد دودھ پیتا بچہ نہ تھا پھر بھی دادی بہو کو تاکید کرتی رہتی تھیں کہ اُسے ہر رات سونے سے پہلے دودھ پی کر ہی سونا چاہیے۔ اگر کبھی ساجد کو اپنی پسند کا کھانا نہ ملتا اور وہ ناک بھوں چڑھاتا تو دادی اُس کی ماں کو اول جلول ضرور سناتیں۔ لیکن ساس کی ان باتوں کا بہو بُرا نہیں مانتی تھی۔ پھر جب ساجد ایچ ایس سی میں کامیاب ہوا تو گھر پر سبھی لوگ بہت خوش ہوئے۔ سن ستر کی دہائی میں تو گاؤں میں شاید ہی کسی کے پاس فون ہوا کرتا تھا۔ دادی کا بس چلتا تو وہ اپنے سبھی رشتہ داروں کو یہ خوش خبری دیتیں۔ لیکن اس کے لیے اُن کے پاس ایک ہی راستہ تھا اور وہ تھا کہ جب گھر پر کوئی مہمان آتا، وہ اِسی خوشی کو اُس کے ساتھ بانٹتیں۔ ساجد اعلیٰ تعلیم کے لیے ہندوستان جانا چاہتا تھا لیکن باپ کو اس بات کی فکر تھی کہ اگر بڑے بیٹے کو بیرون ملک اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیج دیا جائے تو پھر باقی بیٹوں کی تعلیم کا انتظام وہ کیسے کرے گا؟ دادی بھی اس بات کے لیے راضی نہ تھیں کہ ساجد اُن سے دور چلا جائے۔ لہٰذا چند ہی مہینوں کے بعد ساجد کی تقرری اُستاد کی حیثیت سے ہو گئی۔ جس زمانے میں وہ اُستاد بننے کے لیے تربیت حاصل کر رہا تھا اُسے معاوضہ کے طور پر کچھ روپے ملتے تھے۔ اپنے خرچ کے پیسے الگ کر کے وہ تمام روپے ماں کے ہاتھ میں رکھ دیتا تھا۔ ہر مہینے کے آخر میں وہ دادی کے لیے بھی کچھ نہ کچھ خرید لاتا تھا جس کے لیے بڑھیا اُس پر بگڑتی تھیں لیکن دل ہی دل میں بہت خوش ہوتیں۔ ایک شام جب ساجد گھر لوٹا تو اُس

نے دیکھا کہ اُس کے والد افسردہ بیٹھے ہیں۔ پڑوسی بھی جمع تھے اور سبھی کے چہروں پر تشویشناک آثار نظر آرہے تھے۔ ساجد کو گھر میں داخل ہوتے ہی اندازہ ہوگیا کہ کوئی ناگہانی بات ضرور پیش آئی ہے۔ دراصل اُس کی دادی کو اچانک چکر آگیا تھا اور وہ غش کھا کر زمین پر گر گئی تھیں۔ اُس کی والدہ نے اُسے بتایا کہ اب دادی کی حالت کچھ بہتر ہے لیکن دل بہت سُست انداز سے دھڑک رہا تھا۔ مغرب کی نماز کے بعد دادی نے ساجد کو اپنے قریب بستر پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ انہیں اس بات کا علم تھا کہ ضعیفی کوئی بیماری نہیں ہوتی ہے نہ اُس کا کوئی علاج ہوتا ہے۔ اُنہیں یہ بات پسند نہیں تھی کہ گھر کے سبھی لوگ رنجیدہ نظر آئیں۔ لہٰذا پوتے سے مخاطب ہوتے ہوئے اُنہوں نے کہا" بیٹا میں بیمار نہیں ہوں۔ جو پھول کھلتا ہے وہ مرجھاتا بھی ہے۔ میں نے اپنی زندگی کے بہترین دن گزار دیے ہیں۔ غریبی سے خوش حالی دیکھی ہے۔ تمہارے دادا کو مزدور سے کسان ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہارے والد نے تم لوگوں کی پرورش کے لیے خون پسینہ ایک کیا ہے۔ اُس نے مجھے ہمیشہ خوش رکھا ہے۔ تمہیں بھی اُن کا خیال رکھنا چاہیے۔ زندگی میں انسان کی ہر مراد مکمل نہیں ہوتی۔ میں نے مجید کی شادی دیکھی اور تم لوگوں کو بڑا ہوتے ہوئے دیکھا۔ کاش میں تمہاری شادی بھی دیکھتی اور اپنے پر پوتوں کو اپنی گود میں لیتی!" ساجد نے دادی کو دلاسا دیتے ہوئے کہا کہ دادی آپ ٹھیک ہو جائیں گی۔ آپ کیوں ایسی باتیں کرتی ہیں۔ ابو کل صبح شہر کے کسی بڑے ڈاکٹر کو بلائیں گے۔ بی بی جمیرن نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اُن کے حلق سے ایک عجیب قسم کی آواز آنے لگی۔ پھپھی چاچی جو قریب ہی بیٹھی تھی فوراً کہنے لگی کہ بی جمیرن تو ایشور سے بات کر رہی ہیں۔ مجید کی آنکھوں میں آنسوؤں کا سیل اُمڈ آیا تھا۔ اُسے اس بات کا علم تھا کہ اُس کی ماں نزع کی حالت میں تھیں۔ وہ اپنی ماں کے سرہانے بیٹھ کر پتہ نہیں کیا کچھ پڑھنے لگا لیکن وہ اپنی سسکیاں روک نہیں پارہا تھا۔ ساجد کی والدہ بھی سکرات نامہ پڑھنے لگی اور گھر کا سارا ماحول سوگوار لگنے لگا۔

جس وقت مزدور کھیت جانے کے لیے گھر سے نکل رہے تھے اور آس پاس کی آبادی اپنی روزمرہ زندگی کی تگ ودو کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی تھی اُسی وقت مجید کے گھر سے ایک دل فگار صدا

اٹھی جس سے اندازہ ہوا کہ بی بی جمیرن داعیِ اجل کو لبیک کہہ گئیں۔ بی بی جمیرن جس ابدی مسرت کی خواہش مند تھیں اُسی کے لیے اُن کی روح پرواز کرگئی۔ مجید اپنی والدہ کے جسدِ خاکی کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ ہر انسان کا مقدر یکساں کیوں ہے؟ کیا ماں دنیا میں ہمیشہ کے لیے نہیں آسکتی تھی؟

ایک شام جب مجید اپنی دکان سے گھر واپس آیا تو اُس نے بتایا کہ شنکر اپنے بیٹے کو انگلستان ''نرسنگ'' کے لیے بھیج رہا ہے جس کے لیے وہ اپنے دو بیگھے کھیت بیچنا چاہتا ہے۔ بیوی باورچی خانے میں شوہر اور بچوں کے لیے کھانا لگا رہی تھی۔ بچے شوق سے دال چاول کھا رہے تھے لیکن ساجد اپنے والد کی باتیں بغور سُن رہا تھا۔ جب مجید کو اندازہ ہوا کہ ساجد اُس کی باتیں سُن رہا ہے تو اُس سے مخاطب ہوکر وہ کہنے لگا'' کاش ہمارے پاس بیس ہزار روپے ہوتے تو ہم یہ کھیت خرید لیتے اور ۵۰ ٹن گنے کے بجائے ہم ہر سال سوا سوا سوٹن گنا کاٹتے۔ انتوان اور بھائی مناف دکان پر گپ شپ کے لیے آئے تھے تو وہ بتا رہے تھے کہ شنکر کا کھیت زرخیز ہے اور اُس میں بہترین قسم کے گنے لگے ہیں۔ اگر کہیں سے مجھے کچھ روپے مل جاتے تو میں یہ کھیت ضرور خرید لیتا۔ میرے والد نے میرے لیے دو بیگھے کھیت چھوڑے تھے۔ اگر میں بھی آپ لوگوں کے لیے ایسا کرسکتا تو کم سے کم ساجد تم اپنے چھوٹے بھائیوں کو اعلیٰ تعلیم دلا سکتے ہو۔ انہیں بیرونِ ملک انگلستان یا ہندوستان بھیج سکتے ہو۔ ویسے میری والدہ نے ہمیں داغِ مفارقت دینے سے پہلے میرے ہاتھ میں پانچ ہزار روپے رکھ دیے تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر ان پیسوں سے تم گنے کا کھیت خرید سکتے ہو تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ ساجد اپنے والد کو دیکھ رہا تھا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔ دراصل بسترِ مرگ پر دادی نے اپنے تکیے کے نیچے سے کچھ پُرانے نوٹ اور سکّے نکال کر اُس کے ہاتھ میں رکھ دیے تھے اور اُس کے ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ پیسے میری پنشن کے ہیں۔ ویسے تو یہ ۲۲ روپے مجھے تمہارے ابّو کو ہر مہینے آخر میں دے دینا چاہیے تھا لیکن اُس نے کبھی مجھ سے نہ طلب کیے بجز جب مجھے ڈاکٹر کے یہاں جانا ہوتا تھا اور نہ کبھی پوچھا کہ میں ان روپیوں سے کیا کرتی ہوں۔ لہٰذا ان پیسوں پر تم سب کا حق ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ دادی نے مجھے بھی پانچ ہزار

روپے دیے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی یہی کہہ رہی تھیں کہ ان پیسوں سے گنّے کا کھیت خرید لوں۔

ایسا ہے تو کچھ قرض لے کر ہم شنکر کا کھیت خرید سکتے ہیں۔ مجید کی باتوں میں خوش آئند مستقبل کی گویا ایک بشارت تھی۔ گنّے کے کھیت سے جیسے سوزِ عشق کی آگ اُس کے سینے میں دہک رہی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد باپ اور بیٹا شنکر کے ساتھ پورٹ لوئس کے کسی مختار نامہ نویس کے دفتر میں بیٹھے ہوئے تھے۔

*****

ڈاکٹر عالیہ امام

اسلام آباد میں سہ روزہ ایفرو ایشین رائٹرز کانفرنس

اسلام آباد میں تین روزہ انٹرنیشنل رائٹرز کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں افروایشین ممالک کے ادیبوں اور دانشوروں نے شرکت کی کانفرنس کا موضوع تھا۔

(1) " Designs of global cultural hegemony & writers'

(2) Role in defence of Heritage, Culture, and Peace "

کانفرنس کے بنیادی سکریٹری جنرل محمد سلماوے (مصر) اور ہندوستان کے ڈاکٹر علی جاوید تھے۔ پہلے دن اس مسئلے پر غور کیا گیا کہ ثقافتی بالادستی کی جو یلغار ہے ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے پوری زندگی متاثر ہو رہی ہے۔ اس کے متعلق ادیبوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ اس ثقافتی ملوکیت کا کس طریقے سے سدباب کیا جا سکتا ہے۔ اور کس طرح اس نوآبادیت کا سدِ باب کیا جائے آرٹ اور کلچر کا دنیا میں کس طرح تحفظ کیا جائے۔ یہ بھی دیکھا جائے کہ اہل قلم کس عنوان حسن اور سچائی کا تحفظ کر سکتے ہیں اور اپنے خوبصورت ورثہ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔ عوام دشمن رویے کا مقابلہ کس طرح کیا جائے کیونکہ آرٹ اپنے عہد کی پیداوار ہے۔ اس کی تمام خوبصورت روایات کا تحفظ کیا جائے۔

یہ موضوع بھی کانفرنس میں زیر بحث رہا کہ امن کے لیے ادیبوں اور دانشوروں کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے اس کے لیے عوامی طاقتوں کو بڑھاوا دینے کی ضرورت پر زور دیا گیا۔ تاکہ ادیبوں کا پاٹ چوڑا ہو۔ اور وہ تمام افراد جن کے ہونٹ خشک ہیں انہیں سیراب کیا جا سکے۔۔ اس کے لیے افریقی وایشائی ممالک میں دہشت گردی کی قوتیں سرمایہ حیات کو تباہ و برباد کر رہی ہیں اس پر غور کیا گیا اور راستے تلاش کرنے کی کوشش کی گئی۔

پاکستان کی حکومت دہشت گردی کے خلاف جو اقدامات کر رہی ہے اسے سراہا گیا اور کہا گیا کہ ادیبوں کو ایسے نازک وقت میں حکومت کا ساتھ دینا چاہیے۔ پاکستان میں جتنی قومیں ہیں مثلاً سندھی، بلوچی، پشتو اور پنجابی ان کے کلچر، تہذیب کا مکمل تحفظ کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے عالمگیریت (Globlization) کی یلغار کو روکنا اس کا کام ہے اور پاکستان میں تمام زبانیں پشتو، بلوچی، پنجابی، سرائیکی، سندھی سب قومی زبانیں ہیں اور اردو قومی و سرکاری زبان ہے ان کا احترام لازم۔ اردو قومی و سرکاری زبان کے علاوہ رابطے کی زبان "Lingua-Franca" ہے اس لیے حکومت کو اس کی ترویج و اشاعت کی طرف توجہ دینا چاہیئے۔

انگریزی بین الاقوامی زبان ہے اس سے رشتہ رکھنا لازم ہے لیکن اسے دیگر مضامین کے طور پر پڑھایا جائے جیسے تمام ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ ذریعہ تعلیم کے طور پر نہیں پاکستان ایک کثیر اللسانی مملکت ہے اس لیے ہر زبان کا احترام بھی لازم ہے۔

مصر اور افغانستان کی اس کانفرنس میں شرکت امن کی قوتوں کو بڑھاوا دینے میں مددگار ثابت ہوگی۔

ادیبوں نے ہر دور میں اپنی ذمہ داریاں نبھائی ہیں قلم کو ہتھیار بنانا ضروری ہے اس کے علاوہ اپنا رشتہ عوام سے مضبوط کرنا اور ان کی کوششوں میں بھی شرکت ضروری ہے۔ کلچر ہتھیار ہے اسے ہر طور پر استعمال کرنا ہے تاکہ لسانی ملوکیت جو کمزور ممالک کی سیاسی تہذیبی حقیقت کو تباہ کر رہی ہے اسلحے کی تجارت کر رہی ہے۔ انسان کو لہو کا غسل دے رہی ہے۔ اسے ہر سطح پر روکنا وقت کی اہم ذمہ داری ہے۔

*****

محمد اویس جعفری۔ سیاٹل (امریکہ)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ○

الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ ○

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ○

اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ ○

صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ ○

غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ ○

خدا کے نام سے ہے ابتداء جو رحم والا ہے

اُسی کی حمد ہے جو ہے مُربی سب جہانوں کا
جزا کے دن کا مالک ہے، رحیم و مہرباں وہ ہے
عبادت اُس کی کرتے اور مدد کے اس سے طالب ہیں
خدائے پاک سیدھا راستہ ہم کو دکھا دیجے
وہ سیدھا راستہ، لوگوں پہ جو انعام فرمایا
نہ اُن لوگوں کا جن کو لائق تعزیر ٹھہرایا
نہ اُن لوگوں کا جو گم ہو گئے راہِ ہدایت سے

خواجہ شفیق احمد فاروقی (مدینہ منورہ)

نعت

خودسری نفس کی یوں ہم نے مٹا رکھی ہے — اپنی پیشانی بھی سجدے میں جھکا رکھی ہے

ہے یہ کوشش کہ عمل سے بھی غلامی جھلکے — اپنی یہ شکل بھی اُن جیسی بنا رکھی ہے

اب کوئی اور ہوا اُنؐ کے نہیں ہے دِل میں — یادِ سرکارؐ سے محفل یہ سجا رکھی ہے

دیکھتے رہنا اُسے دل کی عبادت ٹھہری — اُنؐ کی تصویر جو سینے میں چھپا رکھی ہے

جان حنانہ☆ کے رونے پہ تصدّق سو بار — اِک لڑی اشکوں کی ہم نے بھی سجا رکھی ہے

میری سانسوں میں جو شامل ہے ہوائے طیبہ — اپنی خوشبو مری مٹی میں بسا رکھی ہے

ہیں یہاں آپ محمدؐ تو وہاں ہیں محمود — آپؐ کے نام میں خود رب نے ثنا رکھی ہے

ہے اِسی نام سے قائم یہ بھرم ہستی کا — اور اِسی اسم میں رُوحوں کی شفا رکھی ہے

میرے اللہ نے آقا کو یہ دی ہے رفعت — عرش سے روضے کی توقیر سوا رکھی ہے

اپنی رحمت کو بھی رکھا ہے خدا نے مشروط — اُن کی مرضی پہ ہی بخشش کی بنا رکھی ہے

جسؐ کو اللہ نے محبوبؐ بنایا ہے شفیق
اُسؐ سے لو ہم نے بھی واللہ لگا رکھی ہے

☆ حنانہ: اسطوانہ حنانہ کی جانب اشارہ ہے جو مسجد نبوی میں ہے۔ یعنی کھجور کے درخت کا وہ تنا جو اس جگہ دفن ہے۔ آپ اُس کے سہارے اپنی پشت مبارک لگا کر خطبہ ارشاد فرماتے تھے۔ منبر شریفہ بن جانے پر جب آپؐ اسے چھوڑ کر منبر پر خطبہ دینے لگے تو اس فراقت پر وہ ایسی دھاڑ مار کر رویا تھا کہ سارے صحابہ بھی تڑپ اُٹھے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے اُسے چمٹا لیا اور اپنے مصلّے کے ساتھ اسے دفن فرما دیا تھا، تا کہ قربت رہے۔

شفق ہاشمی

نعتِ ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وسلم

طیبہ کے چاندؐ، تجھؐ پہ فدا میری کائنات
تیریؐ تجلّیوں سے فروزاں مری حیات

تیریؐ نظر سے خاک مری کیمیا ہوئی
تیریؐ ضیا سے نور فشاں میرے شش جہات

سوچوں کو میری تُو نے عطا کی ہیں وسعتیں
بخشا ہے تیرےؐ فیض نے مجھ کو شعورِ ذات

خود آگہی ملی ہے، خدا آگہی ملی
مجھ پر عیاں ہوئے ہیں مُباحات و منکرات

تُوؐ ہی میرا شرف، مری پہچان بھی تُوؐ ہی
ورنہ ترےؐ بغیر میں اک ذرّۂ حیات

تجھؐ سے جہانِ آدمِ خاکی کی رفعتیں
حقّا کہ تُوؐ ہے باعثِ تکمیل کائنات

ہر آفتاب تازہ سرِ شام ڈھل گیا
لیکن ترےؐ جمال جہاں تاب کو ثبات

تیریؐ پناہ میں ہوں، بڑی عافیت میں ہوں
تجھؐ سے بچھڑ کے ورنہ کہاں تھی مری نجات

میں بے سواد نعتِ شہ دو جہاںؐ لکھوں
عاجز مرا بیان ہے، قاصر مری لغات

میرے نصیب اے میرے آقاؐ سنوار دے
مولاؐ، ترےؐ کرم کی عطا ہو مجھے زکوٰۃ

ماہر اجمیری

نعت

سب سے افضل سب سے اعلیٰ سب سے بہتر آپؐ ہیں
میرے مولا میرے آقا میرے سرور آپؐ ہیں

آپؐ سرِ کُن فکاں ہیں آپؐ وجہِ کائنات
مالک کون و مکاں محبوبِ داور آپؐ ہیں

آپؐ نے بخشا ہے انساں کو شعورِ زندگی
محسنِ انسانیت اللہ اکبر آپؐ ہیں

آپؐ کے در سے کبھی خالی کوئی لوٹا نہیں
منبعِ جود و سخا الطاف پیکر آپؐ ہیں

آپؐ کی امت پہ طاری ہے زبوں حالی کا دور
المدد یا مصطفیٰؐ امت کے سرور آپؐ ہیں

ہم گنہ گاروں کو کافی ہے سہارا آپؐ کا
شافعِ روزِ جزا ساقیِ کوثر آپؐ ہیں

کیوں نہ پہنچے منزلِ مقصود پر وہ کارواں
جس کے میرِ کارواں اور جس کے رہبر آپؐ ہیں

جنبشِ ابروئے حضرتؐ پر ہے رقصاں کائنات
کائنات اک دائرہ ہے اور محور آپؐ ہیں

آپ امام المرسلیںؐ ہیں آپؐ ہیں ختم الرسلؐ
انبیا جس پر ہیں صدقے وہ پیمبر آپؐ ہیں

جس کی خوشبو سے معطر ہے دو عالم کی فضا
گلشنِ کون و مکاں کے وہ گلِ تر آپؐ ہیں

التجا کس سے کرے ماؔہر سوائے آپؐ کے
آپؐ کا بندہ ہے ماؔہر بندہ پرور آپؐ ہیں

رشید آفرین

خیر الانامؐ

نبوت تھی ودیعت جس کو وہؐ ہے برتر و بہتر
وہؐ محبوب خدا جس کو کہیں بحر سخا سارے
سبھی ہیں نقشِ پا جس کے فلک پر چاند اور تارے
بیابانوں کو جسؐ نے کر دیا رشکِ ارم یکسر

نہ ثانی حسن میں کوئی نہ خوبی میں کوئی ہمسر
وہیؐ ہے مطلعٔ انور، وہی شہکار ایزد کا
وہؐ سردارِ رسولاں وہ سلف دلدار ایزد کا
جوؐ ہے کون و مکاں میں تا قیامت ہادی و سرور

زمانے منتظر تھے جس کے وہؐ انوار کا پیکر
وہؐ جس کی زندگی کا ایک اک لمحہ مثالی ہے
بنائے احترامِ آدمیت جسؐ نے ڈالی ہے
ہے جسؐ کے واسطے رطب اللساں قرآن میں داور

حرا سے وحدت و توحید کا لے کر پیام آیا
عروجِ آدمیت کے لیے خیر الانامؐ آیا

محمد طارق غازی

○

خوش ہو کے اٹھا لیں گے پائی جو سزا تم سے
یا بیٹھ کے کر لیں گے کچھ عذر خطا تم سے

وہ میری کہانی تھی مجھ سے تو سنی ہوتی
کچھ تم نے کہا سب سے کچھ سب نے کہا تم سے

یہ حالتِ غم سب نے مل جل کے بنائی ہے
سب راہرواں ہم سے اور راہ نما تم سے

حالات میں تبدیلی اس طرح نہ آئے گی
زحمت نہ اٹھاؤ کچھ ہونے سے رہا تم سے

اک دردِ مسلسل ہے تم دے کے بھلا بیٹھے
اس کھیل میں ہونا تھا کیا اس کے سوا تم سے

لوٹا نہ سکے تم تو اک ہلکا تبسم بھی
یہ قرضِ محبت کا کیا ہوگا ادا تم سے

کرنے کو تو کرتے ہیں چھپ چھپ کے محبت پر
اوروں سے تو کیا مطلب، آتی ہے حیا تم سے

لے کر تو چلا ہے دل اس جادۂ جاناں پر
کھو جائیں گے جب خود سے پوچھیں گے پتا تم سے

لو ہم بھی ذرا دیکھیں اب کون مناتا ہے
تم روٹھے سو روٹھے تھے، وہ روٹھ گیا تم سے

مژگان و نگہ دونوں نشتر بھی ہیں مرہم بھی
درد اٹھے گا جب دل میں مانگیں گے دوا تم سے

ایمان کی پوچھو تو کافی ہے سند اتنی
جو کچھ بھی سنا ہم نے جاناں وہ سنا تم سے

احزاب ہوں یا طارق وہ عاد کا قصہ ہو
صرصر کی زبانی کچھ کہتی ہے صبا تم سے ☆

☆ غزوۂ احزاب کے موقعہ پر جب بادِ صرصر نے مشرکین کی خیمہ گاہیں اکھاڑ پھینکی تھیں تو خندق کی دوسری طرف مدینہ منورہ میں بادِ صبا چل رہی تھی، اور جب بادِ صرصر قوم عاد کے محلات اور قلعوں کو مسمار کر رہی تھی تو حضرت ہُود علیہ السلام اور ان کے ساتھ تقریباً ۴۰۰۰ مومنین ساحل سمندر پر ایک باغ کے احاطہ میں بادِ صبا کے نرم جھونکوں کا لطف لے رہے تھے۔

مضطر اکبرآبادی

O

یہ زمیں بچھونا ہے کمبل آسماں اپنا
اور تو بجز اس کے کچھ نہیں یہاں اپنا

ایک دن وہ آئیگا اور ضرور آئیگا
وہ بھی وہم تھا اپنا یہ بھی ہے گماں اپنا

ہیں اسی تذبذب میں حالِ دل کہیں کس سے
ہم سخن کوئی اپنا اور نہ راز داں اپنا

پیچ وخم سے رستوں کے آگہی جو رستہ ہو
ہے وہی حقیقت میں میر کارواں اپنا

بجلیوں سے ہے اب تو صرف دوستی اپنی
بجلیوں کا ہے مسکن اب تو آشیاں اپنا

زلزلوں کی ہیبت پر ہم یقیں نہیں رکھتے
عزم ہے بلند اپنا حوصلہ جواں اپنا

حادثوں سے ٹکرانا ہے قدیم خو اپنی
کیا بگاڑ سکتی ہیں تند آندھیاں اپنا

جس سے کچھ توقع تھی وہ بھی ہو گیا رخصت
سب یہاں پرائے ہیں ہے کوئی کہاں اپنا

جب سے کوئی بچھڑا ہے راہِ زیست میں مضطر
خونچکاں ہیں یہ آنکھیں دل دھواں دھواں اپنا

محشر زیدی

O

ہر لحظہ یقیں اُس کو اَن ہونی ہُوا چاہے
یہ دل بھی عجب دل ہے دشمن سے وفا چاہے

ہیں تان پہ مُرلی کی سب گوپیاں متوالی
بیٹھے گی سنگھاسن پر وہ جس کو پیا چاہے

وعدے سے نہیں ہوگی تقویت دل جاناں
بیمار محبت کا دامن کی ہوا چاہے

ہیں عقل کی چٹکی میں آثار قیامت کے
بس دیر ہے لمحوں کی ہنگامہ ہُوا چاہے

آنچل ہو کہ دامن ہو سب طرزِ کُہن ٹھہرا
اب حسنِ ستم پیشہ انداز نیا چاہے

گلشن کے سنورنے کا ہم وقت گنوا بیٹھے
ہے جس پہ بہار آخر وہ گُل بھی کِھلا چاہے

اِک موجِ تبسم ہو اِک وعدۂ فردا ہو
بندہ یہ محبت کا اور آپ سے کیا چاہے

جو رنگ و نفاست کا معیار تھا گلشن میں
وہ برگِ گُلِ تر بھی تلوار ہوا چاہے

خود بانٹنے والا تھا جو نُور بصیرت کا
وہ طائر لاہُوتی جگنو کا دیا چاہے

سب کچھ تو دیا اُس نے محشر تجھے بن مانگے
کچھ بھید نہیں کھلتا کیا فکر رسا چاہے

پرتو روہیلہ

O

حاکموں غاصبوں کی علّت میں — وحشتیں آگئیں حقیقت میں
بند کر دینا سیدھے رستوں کا — ہو گیا لازمی حکومت میں
عدل کا خون کر رہے ہیں آپ — کون جا کر کہے عدالت میں
وہ جو فرماں روائے اعلیٰ تھے — آج پکڑے گئے بغاوت میں
مفتیِ وقت کا ہے یہ فتویٰ — قتل شامل ہوا عبادت میں
آدمی آدمی کو کافی تھا — کیوں فرشتوں کو ڈالا زحمت میں
آپ بھی چپ رہیں تو بہتر ہے — ہم بھی خاموش ہیں ندامت میں
زندگی ایک لفظِ بے معنی — سوچئے کیا لکھیں عبارت میں
عہدِ الفت کیا تو کس سے کیا — دوست مارے گئے حماقت میں
وطن آشوب بن گئے آخر — جو قصیدے تھے تیری عظمت میں
اب جو الزام دیں تو کس کو دیں — سب ہی شامل ہیں اس شراکت میں
کھیل تو یہ ہے کٹ مریں پیدل — شاہ بیٹھا رہے حفاظت میں

اک خراشِ نفس نہیں پرتو
زخمِ دل بھی ہے اس کی قدرت میں

سید مشکور حسین یاد

○

کیا خوش خبر ہو کے رہ گئے ہیں
ہم دربدر ہو کے رہ گئے ہیں

ہم سب کو دکھائی دے رہے ہیں
منظورِ نظر ہو کے رہ گئے ہیں

ہے عرش نہ فرش کی ضرورت
ہم خاک بسر ہو کے رہ گئے ہیں

پوچھے کوئی کس لیے ہمیں اب
ہم درگزر ہو کے رہ گئے ہیں

ہے دیدنی تازگی ہماری
خطرات میں تر ہو کے رہ گئے ہیں

ہم نکلے تھے خیر کی خبر کو
شرمندۂ شر ہو کے رہ گئے ہیں

○

ہمارے خُوں میں سلامتی ہی سلامتی ہے
اِس ارغنوں میں سلامتی ہی سلامتی ہے

اگر دروں میں سلامتی ہی سلامتی ہے
تو پھر بروں میں سلامتی ہی سلامتی ہے

جنوں بظاہر دکھائی دیتا ہے اک قیامت
مگر جنوں میں سلامتی ہی سلامتی ہے

اگر مزاجِ جناب ہے تو بہ تو کا قائل
تو گونا گوں میں سلامتی ہی سلامتی ہے

غمِ فزوں غور کیجئے انبساطِ جاں ہے
غمِ فزوں میں سلامتی ہی سلامتی ہے

سوال کرنا تو یاد ہے بس نہال کرنا
کہ کیا میں کیوں میں سلامتی ہی سلامتی ہے

عقیل دانش (لندن)

○

حسن کی تحسین کا اِک اور منظر دیکھنا
آشیانے کی جُنت میں مُور کے پر دیکھنا

سنگ باری گھر سے شیشے کے ہو لیکن سوچ کر
لوٹ بھی آتے ہیں دیواروں سے پتھر دیکھنا

دوستوں میں دور تک کوئی نظر آتا نہیں
دشمنوں میں ایک سے ہے ایک بڑھ کر دیکھنا

ہر طرف جنگل گھروں کا اُگ رہا ہے شہر میں
لوگ پھر بھی ہو گئے ہیں کتنے بے گھر دیکھنا

گریہ بختوں کے ہر دُکھ درد میں ہم ہوں شریک
کیسے ہو جاتے ہیں اپنے دل منور دیکھنا

اُن کا چہرہ کھل اُٹھے گا اک نئے انداز سے
سامنے اُن کے ہمارا نام لے کر دیکھنا

دوست دشمن سب کے ہونٹوں پر تمھارا نام ہے
دانش اپنی شاعری کا یہ مقدر دیکھنا

○

وہ ہو بھی سامنے تو بیشتر نہیں ہوتا
نظر جو آئے سدا معتبر نہیں ہوتا

ہر ایک لمحہ بدلتا ہے رنگ فطرت کا
جو ایک بار ہے بارِ دگر نہیں ہوتا

جو نالہ دل سے نکل کر زباں پہ آتا ہے
سنائی دیتا نہ ہو بے اثر نہیں ہوتا

حصار میں جو دیانت کے ہوں یہاں اُن پر
کوئی بھی وار چلے کارگر نہیں ہوتا

ہو حبس جس کے مقدر میں ایسی بستی کے
کسی محل میں بھی دیکھو تو در نہیں ہوتا

ثمر ہوں شاخوں پہ رشتہ مگر زمیں سے نہ ہو
جہاں میں ایسا تو کوئی شجر نہیں ہوتا

جو قوم خون سے تاریخ لکھ سکے دانش
تو ذکر اُس کا کہیں بے اثر نہیں ہوتا

صابر عظیم آبادی

O

دماغ و ذہن سے سازش نکالو
پرانی چیز کی خواہش نکالو

تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں
تم اپنے دل میں گنجائش نکالو

زمیں کو تازہ دم رکھنے کی خاطر
ہوا کے جسم سے بارش نکالو

ترقی کی تمنا ہے تو دل سے
خیال عیش و آسائش نکالو

دلوں کے ناپنے کی ہے ضرورت
کوئی ترکیب پیمائش نکالو

تم اپنے ذہن کی گہرائیوں سے
کبھی تو گوہر دانش نکالو

تعلق کا کنول کھلنے سے پہلے
دلوں سے کینہ و رنجش نکالو

غزل میں رنگ بھرنا ہے تو صابر
نئے معنی نئی بندش نکالو

O

کھڑکیاں بند کر دو باہر کی
پھر صدا آرہی ہے صر صر کی

خون بہنے لگے تو یہ سمجھو
آبرو رہ گئی ہے پتھر کی

جتنی وسعت ہے تیری آنکھوں میں
اتنی وسعت کہاں سمندر کی

سلسلہ ٹوٹتا ہے یادوں کا
جب شکن ٹوٹتی ہے بستر کی

تشنگی ، بھوک ، مفلسی ، افلاس
ایسی حالت نہ تھی مرے گھر کی

اس کو دیکھوں تو ایسا لگتا ہے
ہو غزل جیسے اک سخنور کی

عیش و عشرت میں لٹ گئی صابر
جو کمائی تھی زندگی بھر کی

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

O

فغاں کہ سجدے شناسا نہیں جبینوں سے
انگوٹھیاں ابھی محروم ہیں نگینوں سے

غریبِ شہر کے خوں کا حساب کیا لیں گے
ٹپک رہا ہے لہو جن کی آستینوں سے

نظر کو حُسنِ مناظر سے روشناس کرو
ملے گی دولتِ نایاب ان خزینوں سے

نگاہ رہتی تھی بالائے بام جن کی سدا
اُتر رہے ہیں بصد احتیاط، زینوں سے

متاعِ علم و ادب میرا اصل ورثہ ہے
یہ بات کوئی کہے میرے جانشینوں سے

وہ ایک پل نہ رُکا جس کو دیکھنے کے لیے
ترس رہی تھیں نگاہیں کئی مہینوں سے

بقدرِ ظرف عطا کر غمِ جہاں یارب
چھلک پڑے کہیں صہبا نہ آبگینوں سے

جلالؔ سازشِ گرداب و ناخدا ہے یہی
کہ موج موج اُلجھتی رہے سفینوں سے

شفق ہاشمی

O

دھوپ کنارے تنہا، گُم سُم، سایہ بھی ہے کب تک ساتھ
دیس بدیس سدھارے پنچھی، بوڑھا، برگد خالی ہاتھ

گھر کے سُونے آنگن میں اب اڑتی ہے ماضی کی دھول
جانے والے لوٹ آئے ہیں بیت گئی ہے جب برسات

اپنی خاک اڑی اور اڑ کر دیکھو پہنچی کہاں کہاں
گلشن گلشن پھول کھلے ہیں، عام ہوئی اپنی سوغات

جیون کی اس بازی میں ہے کیسی ہار اور کیسی جیت
ہارے ہیں سو ہار گئے ہیں، جیتے بھی تو بازی مات

حسن طلب کی جھولی بھی ہو، دامنِ دل بھی ہم پھیلائیں
ان کے حسن کا فیض ہے جاری، پل پل بٹتی ہے خیرات

غم کیا ڈوب گئے جو شفق ہم، مشرق و مغرب اپنا رنگ
سورج ساتھ گیا ہے دیکھو روشن کرنے اپنی رات

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

O

اس کی آنکھوں میں مچلتے ہوئے آنسو دیکھے
یا سرِ شاخِ مژہ رات میں جگنو دیکھے

یوں تو ہر شخص کو ادراک ہے خوشبو کا مگر
اس کی خواہش ہے کہ وہ آنکھ سے خوشبو دیکھے

خواب میں دیکھے دمکتے ہوئے آئینہ بدن
روح کے رِستے ہوئے زخم بھی ہر سُو دیکھے

حُسنِ کردار کسی پیکرِ خاکی میں ملے
یوں تو کہنے کو چمن زادوں میں خوش رُو دیکھے

کیا عجب ہے مرا پندارِ وفا بھی ٹوٹے
میرا انجام نہ اے کاش وہ بدخو دیکھے

آگہی کرب کی ہر رخ سے نمایاں تھی حسنؔ
صبح دم گھر سے نکلتے جو کبھی تو دیکھے

O

رہیں مدام جو روشن وہ آفتاب آنکھیں
کہاں سے لائیں مگر دیکھنے کی تاب آنکھیں

جو میرے شہر کے بیمار کی مسیحا تھیں
نہاں پہن کے ہیں وہ خاک کی نقاب آنکھیں

وہ جس نے خواب اجالوں کے پیرہن بانٹے
اسی کو ڈھونڈتی پھرتی ہیں بے حساب آنکھیں

وہ کم سخن کہ اسے خامشی پسند آئی
وہ چپ ہوا بھی تو کرتی رہیں خطاب آنکھیں

اسی کے دھیان میں دن رات کی تمیز اٹھی
اُچاٹ کر گئیں نیندیں وہ نیم خواب آنکھیں

اسی غزال کی میں جستجو میں نکلوں گا
کہ جس کے غم میں مری ہوگئیں سراب آنکھیں

کرامت بخاری

O

وہی جو شخص ہرجائی بہت ہے
یہ دل اُس کا تمنائی بہت ہے

جسے دیکھا تھا ہم نے دیکھا دیکھی
طبیعت اُس پہ اب آئی بہت ہے

سنبھل کر دِل کے دریا میں اُترنا
کہ اس ظالم کی گہرائی بہت ہے

بظاہر چُپ ہے کالی رات لیکن
سکوتِ شب میں گویائی بہت ہے

بہت ہے پیار اُن رستوں سے دل کو
وہ جن رستوں پہ رسوائی بہت ہے

صبا زنجیر پا تھی پھر بھی لیکن
چمن میں رنگ و بولائی بہت ہے

نہیں قائل قیامت کے جو اُن کو
ترے قامت کی انگڑائی بہت ہے

بالآخر پا ہی لیتے ہیں وہ منزل
کہ دیوانوں میں دانائی بہت ہے

O

محبت کا محل مسمار کرنا
بہت مشکل ہے دل پہ وار کرنا

اگر نفرت کی دیواریں گراؤ
مجھے بھی تم شریک کار کرنا

میں سچائی سرِ بازار کہہ لوں
خوشی سے پھر سپرد دار کرنا

یہاں پر دوسری باری نہیں ہے
جو کرنا ہے وہ پہلی بار کرنا

بہت گہرا ہے دریا زندگی کا
بدن کشتی بنا کر پار کرنا

ازل سے چاند چہروں کی ہے عادت
کبھی چھپنا کبھی اظہار کرنا

کرامت ہو سکے تو زندگی بھر
ہمیشہ زندگی سے پیار کرنا

سلیم زاہد صدیقی

O

کھلتا نہیں کہ کیا ہے
صر صر ہے یا صبا ہے

فطرت ہے آدمی کی
ماضی میں جھانکتا ہے

پیدل کی مات ہو گی
نقشہ وہ بن گیا ہے

نصف النہار سورج
ظلمت میں جا گرا ہے

ہونا ہے جو وہ ہو گا
پھر اس کی فکر کیا ہے

اس دورِ کم نظر میں
ہر شخص پارسا ہے

میرا ہے یہ زمانہ
اچھا ہے یا بُرا ہے

کیا زائچہ بنانا
دیوار پر لکھا ہے

کیا حال میں بتاؤں
چہرے پہ سب لکھا ہے

O

آپ کو بانٹنی ہے جب خیرات
کیوں فقیروں کی پوچھتے ہیں ذات

دن کے امکان ہو گئے معدوم
اس تواتر سے آ رہی ہے رات

بات کہنی مجھے نہیں آتی
جیت اپنی کہوں کہ اس کی مات

وصل کی دلفریب ساعت میں
بھول پائے نہ ہجر کے لمحات

تم بھی سائے میں گر جلے ہوتے
جان لیتے ہمارے احساسات

میں تو لہجے کے سحر میں گم تھا
میں کہاں سن سکا ہوں ساری بات

میں امیدِ سحر پہ زندہ ہوں
گو کہ موہوم ہیں یہ امکانات

آپ کا فیض ہے کہ دنیا سے
ہم نے پائے عجیب القابات

سر پہ آکر ٹھہر گئی زاہد
ظلم و جور و جفا کی لمبی رات

محمد طارق غازی

○

اتنا یقین ہے ہمیں کوئی ہمارے پاس ہے
حرف امید کے قریب سر بسجود یاس ہے

لٹنے کا غم نہیں ہے اب دے دی اسے متاع سب
عقل ہے جس کے زیر لب ملتی ہی کے پاس ہے

تیرے قریب آکے سب لفظ مرے بکھر گئے
ریگ خیال کے تلے رُودِ بیاں کا طاس ہے

دیکھ تو سجدہ گاہ کے ذروں میں زندگی کا رقص
عالم امر کا مدام دہر میں انعکاس ہے

بھٹکے بہت یہاں وہاں، دیکھ لیا ترا جہاں
دشت نوردی چھوڑ دی اب ترا کوچہ راس ہے

شہر عروج کا پتا برج بلند میں نہیں
فکر کے ریگزار میں ذروں کے آس پاس ہے

اشکوں میں آگ کیا جلے بجھ گئی آہ لب تلے
کیسا ہجوم یاس ہے چار طرف ہراس ہے

سر پہ گھٹا کا سائباں، زیر قدم ندی رواں
اور ہجوم بے کراں، ہونٹوں پہ پیاس پیاس ہے

بٹ گئے تو قافلے کے لوگ کٹ گئے تو قافلے سے الگ
عید کے چہچہوں میں بھی شہر کا شہر اداس ہے

پرتو روہیلہ

○

ہر سایۂ خفیف سے ڈرتا اِدھر اُدھر
پھرتا ہوں بستیوں سے گزرتا اِدھر اُدھر

اب اپنے گھر میں بند ہوں محفوظ تو ہوں دوست
ورنہ سڑک پہ راہ میں مرتا اِدھر اُدھر

اچھا ہوا کہ ساتھ ہی خود لے کے مر گیا
ورنہ گنہ کا بار میں دھرتا اِدھر اُدھر

مٹ جائیں اپنی آنکھ میں جس رخ کے خد و خال
کس آئینے میں جا کے سنورتا اِدھر اُدھر

بگڑا ہوا تھا روز ازل سے مرا نصیب
دو چار دن میں کیسے سُدھرتا اِدھر اُدھر

غالب ہی بن کے رہ گیا اک غنچۂ نگاہ
ورنہ گُل اور بھی میں کترتا اِدھر اُدھر

جمعیتِ دروں جو رہا مطمحِ حیات
پرتو رہا سدا میں بکھرتا اِدھر اُدھر

فیصل مقبول عجز

○

عکسِ جمالِ یار کو تصویر میں دیکھا
گویا کہ اُن کی خواب کی تعبیر میں دیکھا

دل گردشِ ایام سے گھبرا گیا آخر
جب تلخیٔ دوراں کو بھی تقدیر میں دیکھا

محفل میں مری آئے ہیں وہ غیر کے ہمراہ
تعظیم کا پہلو مری تعزیر میں دیکھا

محبوب کی زلفیں، کبھی دُنیا کی محبت
دیوانے کو ہر حال میں زنجیر میں دیکھا

جب عجز کے اشعار کو دیکھا تو یہ بولے
محبوب کے ہر روپ کو تحریر میں دیکھا

○

ترے در پہ داغِ جبیں بھی نہیں تھا
سکوں بھی نہیں دلِ حزیں بھی نہیں تھا

اُسے ڈھونڈتا جب میں پہنچا وہاں تک
مکاں بھی تھا خالی مکیں بھی نہیں تھا

تمہیں جھوٹ سچ کی خبر کیسے ہوتی
کسی بات کا جب یقیں بھی نہیں تھا

فلک، چاند، تارے، زمیں، پھول، آنگن
حسیں آپ جیسا کہیں بھی نہیں تھا

مرے عجز کی کیا خبر اُن کو ہوتی
نہ دل تھا اگر، دل نشیں بھی نہیں تھا

امین راحت چغتائی

لگ گئی سب کو زمانے کی ہوا
طرۂ و دستار، کیا آنچل ، ردا

ابتدا میں ہر کوئی تھا باخدا
دل ہجومِ بت گراں میں کھوگیا

جانے کس نے کان میں کیا کہہ دیا
ہرکوئی کچھ کہتے کہتے رُک گیا

پھروہی اَوجِ ثریا پر گیا
ایک پل دہلیز پر جو سر جھکا

حادثہ جب ہو چکا تو غُل اٹھا
کیا ہوا کیونکر ہوا کیسے ہوا

سر جھکائے ہم اِدھر بیٹھے رہے
وہ اُدھر کرتے رہے اپنی ثنا

شہر کی پہچان یوں آساں ہوئی
ہرگزرگہہ منزلِ آہ و بُکا

آئینے میں اپنی صورت یوں لگی
جیسے ناکردہ گناہوں کی سزا

وہ اُٹھے تو ساری محفل اُٹھ گئی
کون کس سے پوچھتا کس کا پتا

وہ بھی ہے رطب اللساں درمدحِ شیخ
ایک راحت تھا یہاں مردِ خدا

انور شعور

نہ جانے کیا تیرا نظارہ ہم نے کہ دیکھا
قیامت کا شہ پارہ ہم نے

بڑے لاڈ سے پال کر اپنے دل کو
بنایا ہے ہاتھوں سے ناکارہ ہم نے

غم عشق میں چارہ گر سے زیادہ
کسی کو نہیں دیکھا بیچارہ ہم نے

ہزاروں پہ سرمایۂ دل لگا کر
کمائے ہیں غمخوار دس بارہ ہم نے

محبت کا نعرہ نہیں صرف نعرہ
بجایا ہے دراصل نقارہ ہم نے

ہمارا گرہ ہے بہشتوں سے بہتر
اگر سُکھ سے رکھا یہ سیّارہ ہم نے

عجب ہے ترا روئے رنگین و روشن
کبھی پھول پایا ، کبھی تارہ ہم نے

شعور آیا، قیس آیا، فرہاد آیا
گلے سے لگایا ہر آوارہ ہم نے

اعتذار: جناب امین راحت چغتائی اور جناب انور شعور کی مندرجہ بالا غزلیں (مطبوعہ علی الترتیب 'الاقربا' سالنامہ ۲۰۱۴ء اور شمارہ اکتوبر۔دسمبر ۲۰۱۳ء) کمپوزنگ کے تسامحات کی تصحیح کے بغیر شائع ہوگئی تھیں جنھیں ضروری تصحیح کے بعد مکرر شائع کیا جارہا ہے اس کوتاہی پر ادارہ صمیمِ قلب سے معذرت خواہ ہے (ادارہ)

ڈاکٹر سیّد قاسم جلال

ارضِ فلسطین

اس دورِ پُر آشوب کے بے رحم فراعین
ہیں توڑ چکے آج شرافت کا ہر آئین
مسلم کے لیے ان کے دساتیر و فرامین
ہیں امن کی تذلیل، ہیں انصاف کی توہین
دامانِ غزہ خونِ شہیداں سے ہے رنگین
ہے خاک بسر ، زخم بپا ارضِ فلسطین

جب عالَمِ اسلام بھی غفلت میں ہو مدہوش
او آئی سی بھی ہو جہاں لب بستہ و خاموش
جب کوئی ادارہ نہ حمایت میں ہو پُر جوش
تنظیم ملل کیوں نہ ہو کور اور گران گوش
ارواحِ ستم خوردہ کی فریاد سنے کون؟
یہ قصۂ غم ، ظلم کی روداد سنے کون؟

اک خواب ہے اب عافیت و امن کی خواہش
ہر لحظہ نئے رُوپ میں ہے کفر کی سازش
تھمتی ہی نہیں آتش و بارود کی بارش
مٹ جائے یہ خطہ، ہے یہ اغیار کی کوشش

آمادہ بہ جنگ آج ہے پھر لشکرِ اعدا
کر اہلِ فلسطیں کی حفاظت مرے مولا

شفق ہاشمی

پیامِ امروز

اے مری قوم کے مردوزن، جان وتن ۔۔۔ کیوں یہ سیلِ بلا تم پہ ہے موج زن
آسماں تم سے ناخوش ، زمیں تم پہ تنگ ۔۔۔ حالتِ خوف ہے امن ہو یا کہ جنگ
کھیتیاں کیوں وہ سونا اگلتی نہیں ۔۔۔ شمع کیوں کُنجِ دہقاں کی جلتی نہیں
کارخانوں میں آہن پگھلتا تھا جب ۔۔۔ رائیگاں خونِ مزدور بہتا ہے اب
تم نے رونق بڑھائی ہے بازار کی ۔۔۔ اور دکانیں سجائی ہیں گفتار کی
زیبِ تن کیسے ملبوس ہیں نت نئے ۔۔۔ زیبِ سر کیسا طُرّہ ہے، دستار ہے

لیکن اے قوم کے مردوزن، جان وتن ۔۔۔ کیا گھروں میں بھی وہ ذوقِ پندار ہے
کیا دلوں میں بھی وہ جوشِ کردار ہے؟ ۔۔۔ کیا سروں میں بھی وہ فکر بیدار ہے ؟

یہ جو موجِ بلا ہے گزر جائے گی ۔۔۔ جس طرح پہلے گزرا ہے طوفانِ نوح☆
چھوڑ جائے گی عبرت نشاں داستاں ۔۔۔ تاکہ جسموں میں بیدار ہو تازہ روح

اے مری قوم کے مردوزن، جان وتن ۔۔۔ آؤ مل کر بدل دیں نظامِ کہن
اٹھو خوابِ گراں سے ، خدا را اٹھو ۔۔۔ ورنہ سیلاب ہوگا تمہارا کفن
خود پہ تم نے مسلط کیے بازی گر ۔۔۔ سامری کو دیا اپنا مال اور دھن
بے زروں کو کیا تم نے بے بال و پر ۔۔۔ زر پرستوں کو تم نے کیا اہرمن
بڑھ کے تاجِ شہی ان سے اب چھین لو ۔۔۔ دیکھ لیں وہ بھی جمہوریت کا چلن
آؤ پھر دین کا بولا کریں ۔۔۔ رشکِ جنت بنے پھر یہ ارضِ وطن

☆ یہاں ایک اشتباہ دور کرنا ضروری ہے۔ قوافی ''نُوح'' اور ''رُوح'' میں ''ح'' بظاہر وزن سے ساقط ہے مگر اساتذۂ فن کے اپنے معیارات سہی، میری رائے میں ردیف میں اگر دو ساکن حروف یکجا ہوں تو آخری حرف وزن سے خارج نہیں ہوتا۔ اس لیے بالفرض 'ح' کو دونوں مصرعوں سے حذف کر دیا جائے تو 'نُو' اور 'رُو' پر جب تک stress نہ ہوگا وزن نامکمل رہے گا۔ یہی وہ stress ہے جس کی تکمیل آخری ساکن حرف ''ح'' کر رہا ہے (شفق ہاشمی)

پروین شیر۔(کینیڈا)

میرا وجود

کون ہے جو مسیح کی مانند
پارہ پارہ وجود کو میرے
جوڑتا ہے، سمیٹ لیتا ہے
جب بھی احساس کے دریچوں سے
جھلملاتا ہے کوئی درد کا چاند
اپنے ٹھنڈے نحیف ہاتھوں سے
کرچیاں میری ساری چنتا ہے
اور یہ ریت کا مکاں میرا
اک تحفظ کا دیتا ہے احساس
کچے دیوار و در کے شانوں پر
سر ٹکا کر میں جب بھی روتی ہوں
کوئی بڑھتا ہے پھر مری جانب
باندھتا ہے حصار بانہوں کا
میری پلکوں سے اپنے دامن میں
ساری شبنم سمیٹ لیتا ہے

کون ہے وہ کہ میرے زخموں سے
ایسے واقف ہے جیسے میرے غم
اس نے اپنے بدن پہ جھیلے ہوں
میں نے اشکوں سے، بھیگی آنکھوں سے
اک نظر بھر کے دیکھنا چاہا
میرے چاروں طرف نہ تھا کوئی
صرف میرا وجود تھا اپنا
اپنی ہی کرچیوں کو میں نے چنا
ہاتھ میرے ہی خوں سے سرخ ہوئے
میری پلکوں کو چومنے والا
دامنِ تر بھی میرا اپنا تھا
ایسے عالم میں میرا اپنا وجود
تھا حقیقت میں غم گسار اپنا

محمد اویس جعفری سیاٹل (امریکہ)

التماس

مولانا احمد عبدالمجیب قاسمی ندوی کی خدمت میں شکاگو سے سیاٹل منتقل ہونے اور مقامی مسجد 'الفاروق' میں امامت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کی درخواست

سحر سجائیں گے تزئینِ شام کر لینگے ــــ صبا سے بات گلوں سے کلام کر لینگے

جو آپ آئیں تو مہکے روش روش گلشن ــــ بہار آکے نہ جائے وہ کام کر لینگے

خطاب آپ کریں گے تو ہم سرِ محفل ــــ سماعتوں کے لیئے اذنِ عام کر لینگے

امامت آپ کرینگے تو مقتدی ہم لوگ ــــ صحیح رکوع و سجود و قیام کر لینگے

اُٹھا کے لائیں خُم بادۂ اخوت آپ ــــ ہم اختلاف ہر اک غرقِ جام کر لینگے

ہم آپ کے لبِ معجز بیاں کے صدقہ میں ــــ حدیث مستی و عرفاں کو عام کر لینگے

جو شمع طاقِ حرم سے اٹھا کے لائیں آپ ــــ کتاب زیست کو ہم اس کے نام کر لینگے

ہے انتظار کوئی صاحب نظر آئے ــــ ہے یہ یقین اسے اپنے نام کر لینگے

نہ آئے آپ تو بستی کے بدنہاد شیوخ ــــ فساد و فتنہ و شر پھر سے عام کر لینگے

جناب آپ شکاگو سے آئیں تو سیاٹل ــــ خدا گواہ ہر ایک اہتمام کر لینگے

ہے فخر آپ کو دارالعلوم ندوہ پر ــــ ہمیں یہ زعم کہ ہر بت کو رام کر لینگے

ہے جن کو ساقیِ کوثر کے نام سے الفت ــــ وہ اور دینِ محمدؐ کو عام کر لینگے

خدا جو چاہے تو عبدالمجیب آئینگے
اویس کیا ہیں جو کچھ انتظام کر لینگے

اویس الحسن

راتیں غم کی!

جانے ادراک میں کیسا تھا خیالی پیکر — ہم جو نادیدہ محبت میں گرفتار ہوئے
اُن کے رستے میں دیئے روز جلائے ہم نے — اور پھر روز ہی درشن کے طلبگار ہوئے

اپنے دامن میں جو تھے لال نچھاور کر کے — اُن کے قدموں سے اُٹھا لائے تھے پتھر جا کر
اُن کی خواہش تھی کہ جگنو ہوں نہایت ارزاں — ہم وہ سادہ کہ سجا لائے تھے آنسو جا کر

ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے نہ دیکھو ہم کو — دل کا یہ ضبط کہیں ٹوٹ نہ جائے آخر!
اُن کے فرمان پہ چلتا یہ نظامِ عالم — اپنی گردش سے کہیں چھوٹ نہ جائے آخر

کس نے پہنا تھا سرِ شام گلابی جوڑا! — بزم تاروں کی سجی، چاند بھی کامل نکلا
اک تلاطم میں گرفتار سمندر دیکھا — بے خودی چھا سی گئی، موج میں ساحل نکلا

دل میں آئے ہوئے ارمان سنائیں کس کو! — شہر کا شہر اُجڑتا ہوا دیکھا ہم نے
جس طرح ہم نے کتابوں میں پڑھا قصۂ گل — ہو بہو دل کو بکھرتا ہوا دیکھا ہم نے!

لُطف پھر دینے لگیں آج یہ باتیں غم کی
جیسے دھیمی سی سُلگتی ہوئی راتیں غم کی

نظم

اویس الحسن

تم چلے آؤ

جانے افلاک کے پردوں پہ اُبھرتا سورج یوں سمندر میں سرِ شام اُترتا کیوں ہے؟
پھر اندھیرے میں دمکتا ہوا جگنو بن کر عشق کے در پہ بڑی دیر چمکتا کیوں ہے؟

اک حسیں جھیل کے پانی کا طلسمی منظر آج آنکھوں میں کوئی خواب سجانے نکلے!
جیسے صحرا کی کہیں ریت میں لپٹا مجنوں ! اپنی لیلیٰ کو حسیں گیت سنانے نکلے !

سات رنگوں سے سجی قوسِ قزح کے لمحے اشک تھمتے ہی میرے دل کی زمیں پر اُترے!
دلفریبی نے ابھی پھول کھلانے ہوں گے تم جو چاہو تو میرا تخت یہیں پر اُترے !

جھلملاتے ہوئے تاروں کی ضیا پاش نظر ایک سیدھی سی گزرگاہ سے گزری ہے ابھی!
اک پری جھیل سے یادوں کی جو اُڑ کر آئی ! اِن فضاؤں سے میرے دِل پہ وہ اُتری ہے ابھی!

میرے دامن میں جو گرتے ہیں مچل کر آنسو! ان کو ڈوری میں پروتے ہوئے سوچا دِل نے!
اتنے نایاب نگینوں سے بنا کر گہنے ! کیا خوشی غم کی نگاہوں سے لگی ہے ملنے!

اتنی مانوس فضاؤں میں اکیلا میں ہوں !
تم چلے آؤ خیالوں میں اکیلا میں ہوں !

صابر عظیم آبادی

رباعیات

دنیا کی نگاہوں سے چھپا لیتا ہے
ہر آن کلیجے سے لگا لیتا ہے
وہ مجھ کو محبت کا سمجھ کر موتی
گرتا ہوں تو پلکوں سے اٹھا لیتا ہے

☆☆☆

دنیا میں سنبھلنے کا یہی ہے نسخہ
کانٹوں سے نکلنے کا یہی ہے نسخہ
ہر لمحہ جلاتے رہو محنت کے چراغ
تقدیر بدلنے کا یہی ہے نسخہ

☆☆☆

کیسے دل ناشاد کو سمجھائیں ہم
کس چیز سے کس بات سے بہلائیں ہم
یہ آخری منزل ہے ہماری جاناں
اب اٹھ کے ترے در سے کہاں جائیں ہم

☆☆☆

ہر اُگتی ہوئی فصل کو ویران کیا
اعمال کی جانب نہ کبھی دھیان کیا
آباد کیا دنیا کی ہر کھیتی کو
افسوس کہ عقبیٰ کا نہ سامان کیا

تاریک شبستاں میں پڑے مت رہنا
ہر بات پہ اپنی تو اڑے مت رہنا
دینا ہے اگر مہر و محبت کو فروغ
نفرت کے دوراہے میں کھڑے مت رہنا

☆☆☆

رخسار کی گرمی سے پگھل کر آنسو
دامن پہ گرا آنکھوں سے ڈھل کر آنسو
آیا ہے مرے غم کا مداوا کرنے
تہہ خانۂ خلوت سے نکل کر آنسو

☆☆☆

آلام کے تپتے ہوئے منظر سے نکل
کیوں بیٹھا ہوا گھر میں ہے تو گھر سے نکل
گر چاہتا ہے جبر مسلسل سے نجات
نادان ! سرابوں کے سمندر سے نکل

☆☆☆

آمر کے ہوں یہ ہاتھ کہ جمہور کے ہاتھ
کہتے ہیں کہ انمول ہیں مزدور کے ہاتھ
دیتا ہے کہاں کوئی کسی کو صابر
خالی ہی رہا کرتے ہیں مجبور کے ہاتھ

نقد و نظر

کتاب	:	حرف معتبر (ادبی اداریہ نویسی)
مصنّف	:	سید منصور عاقل
مبصّر	:	پروفیسر ڈاکٹر غلام شبیر رانا
ناشر	:	مکتبہ الاقرباء فاؤنڈیشن۔ اسلام آباد
قیمت	:	۶۰۰ روپے

سیّد منصور عاقل کی ادارت میں اسلام آباد سے ۲۰۰۱ میں اپنی اشاعت کا آغاز کرنے والے ادبی مجلّے الاقربا نے پوری دنیا میں اپنی افادیت کا لوہا منوایا ہے۔ اس رجحان ساز علمی و ادبی مجلّے کے ادارتی کلمات جس انداز میں فکر و نظر کو مہمیز کرتے ہیں اس کی اہمیت و افادیت کا ایک عالم معترف ہے۔ سید منصور عاقل نے اپنے ادارتی کلمات میں ہمیشہ اس امر پر توجہ مرکوز رکھی ہے کہ قارئین ادب میں عصری آگہی کو پروان چڑھایا جائے، ان کے ذوق سلیم کو صیقل کیا جائے اور ان میں مسائل عصر کے بارے میں مثبت شعور پروان چڑھایا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ الاقرباء کے اداریے ہمیشہ توجہ سے پڑھے جاتے رہے ہیں۔ ادبی اداریہ نویسی کی یہ منفرد اور نادر جہت قارئین ادب کے دلوں کو ایک ولولۂ تازہ عطا کرتی ہے جس کے معجز نما اثر سے جہد و عمل کی نوید ملتی، جمود کا خاتمہ ہوتا ہے۔ قطرے میں دجلہ اور جزو میں کل کا منظر نامہ پیش کر کے سید منصور عاقل نے ید بیضا کا معجزہ دکھایا ہے۔ ان اداریوں میں ''ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلّی'' کا منظر نگاہوں کو خیرہ کرتا ہے۔

سید منصور عاقل کا شمار عالمی شہرت کے حامل ممتاز پاکستانی دانش وروں میں ہوتا ہے جنھوں نے خون دل دے کر ''فروغ گلشن و صوت ہزار کے موسم'' کی دید کو یقینی بنانے کی مقدور بھر سعی کی۔

الاقربا میں شائع ہونے والے سید منصور عاقل کے اداریے قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے والی اثر آفرینی سے لبریز ہیں۔ایک زیرک تخلیق کار کی حیثیت سے سید منصور عاقل نے جس دردمندی اور خلوص سے قومی، ملی، بین الاقوامی، تہذیبی، تاریخی، ادبی، ثقافتی، تعلیمی، معاشی، سماجی، سیاسی، معاشرتی اور متنوع انسانی مسائل پر اپنے عالمانہ خیالات کا اظہار ان ادارتی کلمات میں کیا ہے اس کا ''کرشمہ دامن دل کھینچتا'' ہے۔الاقرباء کا اداریہ لکھتے وقت وہ اپنی تحریر کو قلب اور روح کی اتھاہ گہرائیوں میں اتر جانے والی اثر آفرینی سے مزین کرتے ہیں اور حرف صداقت کے اعجاز سے قارئین کے دلوں کو مسخر کر لیتے ہیں۔ حال ہی میں سید منصور عاقل کے لکھے ہوئے الاقرباء میں شائع ہونے والے (۲۰۰۱ تا ۲۰۱۳ء) اداریے ''حرف معتبر'' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ مکتبہ الاقربا فاؤنڈیشن اسلام آباد نے تین سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب نہایت اہتمام سے شائع کی ہے۔

تاریخی اعتبار سے اردو میں ادبی اداریہ نویسی کے ابتدائی نقوش سرسید احمد خاں کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی مجلے ''تہذیب الاخلاق'' (۱۸۷۰) میں موجود ہیں۔اس کے بعد اردو ادب میں اداریہ نویسی کے یہ ابتدائی رجحانات مختلف ادوار میں ارتقائی مدارج طے کرتے رہے۔ایام گزشتہ کی تاریخ کے صفحات کے مطالعہ سے یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ ابتدا میں روزانہ اخبارات اور ہفت روزہ مجلّات کی اشاعت کے وقت باقاعدہ اداریہ نویسی پر بہت کم توجہ دی جاتی تھی۔تاہم ان اخبارات کے مالک و مدیر جب کبھی محسوس کرتے مسائل عصر کے بارے میں اپنے مختصر نوٹ بھی شامل اشاعت کر لیتے۔اس نوعیت کی تحریروں کو جنھیں اداریہ نویسی کے ابتدائی دھندلے نقوش سے تعبیر کیا جاسکتا ہے اس صنف ادب کے ارتقا کو سمجھنے میں مقیاس کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مسائل عصر کی تمازت کے زیر اثر انسانیت کے وقار اور سربلندی کی تمنا کے جذبات کا پرتو لیے تحریروں اور اداریوں کے سوتے اسی ادبی سوچ سے پھوٹتے ہیں۔یہ بات بلاخوف تردید کہی جاسکتی ہے کہ ابتدائی دور میں مدیران جرائد نے جو طرز فغاں ایجاد کی اسی کے معجزنما اثر سے

اُردو میں اداریہ نویسی کی صنف پروان چڑھی۔ مدیران جرائد کے تکلم کے یہ ابتدائی نقوش ارتقائی مدارج طے کرتے ہوئے اور فکر ونظر کو مہمیز کرتے ہوئے قارئین ادب کو حکیم یوسف حسن کے مجلّہ نیرنگ خیال، اختر شیرانی کے مجلّہ رومان عبدالحلیم شرر کے مجلّہ دل گداز، نیاز فتح پوری (نیاز محمد خان) کے مجلّہ نگار، (۱۹۲۱)(۱) دیا نرائن نگم کے مجلّہ زمانہ، ابوالکلام آزاد کے مجلّات الھلال و البلاغ، میاں بشیر احمد کے مجلّہ ہمایوں، مولانا ظفر علی خان کے مجلّہ زمیندار، چودھری برکت علی کے مجلّہ ادب لطیف، مولوی سید احمد کے مجلّہ اخبار النسا، راشد الخیری کے مجلّہ عصمت، رازق الخیری کے مجلّہ بنات، امتیاز علی تاج کے مجلّہ کہکشاں، عبدللہ فاروقی کے مجلّہ محشر، حافظ محمد عالم کے مجلّہ عالم گیر، صہبا لکھنوی کے مجلّہ افکار، ممتاز شیریں اور صمد شاہین کے مجلّہ نیا دور (۲) مولانا صلاح الدین احمد کے مجلّہ ادبی دنیا، شاہد احمد دہلوی کے مجلّے ساقی (۳) نسیم درانی کے مجلّے سیپ، احمد ندیم قاسمی کے مجلّے فنون، ڈاکٹر وزیر آغا کے مجلّے اوراق، محمد طفیل کے مجلّے نقوش، مجید لاہوری کے مجلّے نمک دان، خالد احمد کے مجلّے بیاض، عذرا اصغر کے مجلّے تجدید نو، شورش کاشمیری کے مجلّے چٹان، ڈاکٹر ناصر رانا کے مجلّے ادب معلیٰ، منصورہ احمد کے مجلّے بیاض، اقبال سحر انبالوی کے مجلّے رشحات، احسن سلیم کے مجلّے سخن زار، شبنم رومانی کے مجلّے اقدار، رضیہ مشکور کے مجلّہ دیدہ ور، تاب اسلم کے مجلّے ید بیضا گلزار جاوید کے مجلّے چارسو، اور موجودہ دور کے متعدد ادبی مجلات میں دکھائی دیتے ہیں۔ اداریہ نویسی کے ابتدائی رجحانات کو ہر دور میں نئی تاب وتواں حاصل ہوتی رہی اور مجلّات کے مدیروں نے ''خونِ دل میں اپنی انگلیاں ڈبو کر'' اپنے علمی و ادبی جنوں کی ''حکایاتِ خونچکاں'' لکھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ اداریہ نویسی ارتقائی مدارج طے کرتی ہوئی قارئین ادب میں بے حد مقبول ہو گئی۔ اس طرح عصر حاضر میں ادبی اداریہ نویسی نے ایک مضبوط اور مستحکم روایت کی صورت اختیار کر لی ہے۔

حرفِ معتبر میں سید منصور عاقل کے الاقربا میں شائع ہونے والے ترپن (۵۳) اداریے شامل ہیں۔ ان تمام اداریوں میں موضوعات کا تنوع قارئین ادب کو متوجہ کرتا ہے۔ سید منصور

عاقل نے افکار تازہ کی مشعل تھام کر سفاک ظلمتوں کو کافور کرنے اور جہان تازہ تک رسائی کا جو عزم صمیم کر رکھا ہے وہ ان اداریوں کے موضوعات سے صاف ظاہر ہے۔ سید منصور عاقل نے اپنے ادبی مجلّے الاقربا میں ہمیشہ نئے مضامین، اچھوتے خیالات، دل کو چھو لینے والے موضوعات، عصری آگہی کی آئینہ دار ادبی تخلیقات اور منفرد اسالیب بیان کو ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ تقلید کی روش سے اپنا دامن بچاتے ہوئے انھوں نے ''نئے زمانے، نئے صبح و شام پیدا کرنے'' کی سعی کی ہے۔ حرف معتبر میں شامل اداریوں کے دامن میں عصری آگہی کے جو گنج ہائے گراں مایہ پوشیدہ ہیں وہ اس اعلا ترین ذہن و ذکاوت کے مرہون منت ہیں جو قدرت کاملہ نے سید منصور عاقل کو عطا کی ہے۔ انھوں نے اپنے سماج، معاشرے، ملک و قوم اور بنی نوع انساں کو درپیش مسائل کا نہایت خلوص اور دردمندی کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔ ان اداریوں میں مقامی، قومی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں قارئین ادب میں مثبت شعور و آگہی کو پروان چڑھانے کی سعی کی گئی ہے۔ قارئین ادب کے فکر و نظر کو مہمیز کرنے کے سلسلے میں ان اداریوں نے بلاشبہ ایک کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ معاشرتی زندگی میں جس برق رفتاری کے ساتھ تغیر و تبدل کا سلسلہ جاری ہے اس کے بارے میں سید منصور عاقل نے اپنے فکر پرور اور بصیرت افروز خیالات کا برملا اظہار کیا ہے۔ حق گوئی و بے باکی ہمیشہ ان کا شعار رہا ہے۔ ان کی عقابی نگاہ کسی ایک مدار تک محدود نہیں رہتی بلکہ حیات و کائنات کے جملہ مسائل، سماج اور معاشرے کے تمام نشیب و فراز، دیہاتی اور شہری زندگی کے سب معاملات، محروم، مجبور اور پس ماندہ طبقے کے مصائب و آلام اور ان کے ساتھ روا رکھی جانے والی شقاوت آمیز ناانصافیوں پر ان کی دلی کیفیات اور جذبات و احساسات کا واضح اظہار ان اداریوں میں جس خلوص کے ساتھ کیا گیا ہے۔ ان میں قومی فلاح، ملی شعور اور انسانیت کے ساتھ والہانہ محبت کا عنصر نمایاں ہے۔ تہذیبی و ثقافتی سطح پر ان کا یہ اسلوب ایک منفرد اور نئے انداز فکر کو سامنے لاتا ہے انھوں نے زندگی کی اقدار عالیہ کو پروان چڑھانے کی مقدور بھر سعی کی ہے۔ یہ اداریے ادب کی ان درخشاں روایات کے امین ہیں جن کے وسیلے سے اصلاح اور مقصدیت کی شمع

فروزاں رکھی جا سکتی ہے۔ یہ اداریے جس تجزیاتی اندازِ فکر کے مظہر ہیں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ سید منصور عاقل کا دبنگ لہجہ قاری کے لیے فکر و نظر کے نئے دریچے وا کرتا چلا جاتا ہے۔ وہ کوئی لگی لپٹی نہیں رکھتے بلکہ کھرے اور کھوٹے کو الگ کر کے دکھاتے ہیں۔ ملمع سازی اور خوابوں کی خیاباں سازی سے انھیں شدید نفرت ہے۔ وہ زہر ہلاہل کو کبھی قند نہیں کہہ سکتے۔ حریت ضمیر سے جینے کے لیے اسوہ شبیرؑ کو ہمیشہ پیش نظر رکھنے والے اس جری تخلیق کار نے ہوائے جور و ستم میں بھی جبر کا ہر انداز مسترد کرتے ہوئے حق و صداقت کا علم بلند رکھا ہے۔ حریت فکر کے اس مجاہد نے وطن، اہل وطن اور پوری انسانیت کے ساتھ جو عہد وفا استوار کیا اسی کو علاج گردش لیل و نہار سمجھتے ہوئے اس پر صدق دل سے عمل پیرا ہے۔ ان کی اداریہ نویسی ایک خاص نوعیت کی محاکمہ نگاری بن جاتی ہے جس میں وہ فسطائی جبر کے سامنے سینہ سپر ہو کر برملا یہ کہتے ہیں کہ ان کے ظلم کا پرچم بالآخر سرنگوں ہو کر رہے گا۔ سیل زماں کے ایک تھپیڑے کی دیر ہے اس کے بعد جعلی کر و فر اور جاہ و جلال کی داستانیں قصۂ پارینہ بن جائیں گی۔ اردو ادب میں اداریہ نویسی کی یہ جہت لائق صد رشک و تحسین ہے۔ اداریہ نویسی کی اس بے مثال اور منفرد جہت نے سید منصور عاقل کو اکیسویں صدی کے منفرد اداریہ نویس کے منصب پر فائز کیا ہے۔ یہ وہ اعزاز ہے جس میں کوئی ان کا شریک و سہیم نہیں۔ انھوں نے ستاروں پر کمند ڈالی ہے اور ان کے اسلوب نے پتھروں سے بھی اپنی تاثیر کا لوہا منوایا ہے۔ انھوں نے ادبی اداریہ نویسی کو معیار اور وقار کی جس رفعت سے آشنا کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کا اسلوب ان کی ذات ہے اور ان کے مسحور کن انداز بیاں کی مثال پیش کرنا اوروں سے تقلیداً بھی ممکن نہیں۔ بہ قول اختر الایمان:

کون ستارے چھو سکتا ہے　　　راہ میں سانس اکھڑ جاتی ہے

سیّد منصور عاقل کے ادارتی کلمات جبر کے ایوانوں پر لرزہ طاری کر دیتے ہیں۔ ۲۰۱۲ء میں وفاقی حکومت کے ایک وزیر کو جب جامعہ کراچی نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری سے نوازا تو کسی نے اس حادثۂ وقت کے بارے میں کچھ نہ لکھا اور راوی نے چین ہی چین لکھ کر چپ سادھ لی۔

سید منصور عاقل نے اپنے اداریے میں اس پر کڑی تنقید کی اور "جامعہ کراچی کی غلط بخشی" کے عنوان سے الاقرباء میں اپنے اداریے میں لکھا:

"موجودہ ہیئت حاکمہ جسے ملکی تاریخ میں بدترین نظام حکم رانی کے الزامات کے ساتھ ساتھ ہمہ گیر تنقید کا بھی سامنا ہے، ایک مقتدرترین وزیر کو عطائے اعزاز کی ایک خصوصی اور پر شکوہ تقریب میں کراچی یونیورسٹی کی جانب سے پی ایچ۔ڈی کی ڈگری پیش کی گئی۔ وزیر موصوف کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ انھیں پہلی اور غالباً آخری بار کابینہ کے اجلاس کے آغاز سے قبل قرآن حکیم کی تلاوت کی دعوت دی گئی چنانچہ انھوں نے اپنی جیب سے ایک پرچہ نکالا اور سورۂ اخلاص کی تلاوت کرنے کی کوشش فرمائی جو صرف چار آیتوں پر مشتمل ہے لیکن 'قل ھو اللہ احد' کی پہلی آیت سے شروع ہونے والی اس سورہ کی تلاوت وہ نہ فرما سکے جب کہ ان کی وزارت کے اس عہد زریں میں ملک کے کروڑوں عوام کی آنتیں بھوک اور افلاس کے سبب دن رات 'قل ھو اللہ' پڑھتی رہتی ہیں۔ لیکن صحیح تلاوت نہ کر سکنے میں وزیر صاحب کا کوئی قصور نہ تھا بہ قول ان کے یہ سورۃ ہی انھیں غلط لکھ کر دی گئی تھی۔" (۴)

معاشرتی زندگی کے تضادات اور قباحتوں کے بارے میں سید منصور عاقل نے ہمیشہ قلم بہ کف مجاہد کا کردار ادا کیا ہے۔ ان کے اداریے قومی دردمندی، خلوص، اصلاح اور تعمیری اقدار کے مظہر ہیں وہ ان درخشاں روایات کو پروان چڑھانے کے آرزومند ہیں جن کے اعجاز سے حق گوئی و بے باکی، بے لوث محبت، بے باک صداقت، خلوص، مروت، ایثار، انسانی ہمدردی اور انسانیت کے وقار اور سربلندی کو یقینی بنایا جا سکے۔ جب عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف میں آجائیں تو زندگی کی حیات آفریں اقدار کو شدید خطرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ اس پر اپنے غیظ و غضب کا برملا اظہار کرتے ہیں اس نوعیت کے کٹھن حالات اور سخت مقامات کی وہ تاب نہیں لا سکتے اور معاشرتی زندگی سے حق و انصاف کو بارہ پتھر کرنے والوں اور انسانیت پر کوہ ستم توڑنے والوں پر کاری ضرب لگانے میں کوئی تامل نہیں کرتے۔ ممتاز شاعر محسن بھوپالی نے اس قسم کے حالات پر

اپنے غم وغصہ کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا:

جاہل کو اگر جہل کا انعام دیا جائے　　اس حادثۂ وقت کو کیا نام دیا جائے
مے خانے کی توہین ہے رندوں کی ہتک ہے　　کم ظرف کے ہاتھوں میں اگر جام دیا جائے

اس کتاب کا پیش لفظ امین راحت چغتائی نے لکھا ہے۔ اس تحقیقی اور تجزیاتی پیش لفظ میں امین راحت چغتائی نے سید منصور عاقل کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی مجلّے الاقربا کی اہمیت، افادیت اور اس کی علمی، ادبی اور قومی خدمات پر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ سید منصور عاقل کے اسلوب کے اہم پہلوؤں کو قارئین ادب کے سامنے پیش کیا ہے۔ اپنے جامع اور وقیع مضمون میں انھوں نے یہ واضح کیا ہے کہ سید منصور عاقل کے ادارتی کلمات کا اولین مقصد اصلاح ہے۔ وہ تعمیری انداز فکر اپناتے ہیں اور معاشرتی زندگی میں امن و عافیت کے خواہش مند ہیں۔ ان کا اسلوب اس حقیقت کا مظہر ہے کہ وہ اپنے ملک، قوم، معاشرے بلکہ پوری انسانیت کی فلاح کے لیے اپنے ذہن و ذکاوت کو بروئے کار لاتے ہیں۔ ان کے جذبات و احساسات اپنے عہد کے حالات و واقعات کی حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں اور ہر مکتبۂ فکر کے قارئین کے خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اس کتاب کے آغاز میں محمود اختر سعید نے الاقربا کے اداریے کے عنوان سے مدلل انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے ان کی موثر تحریر معاشرتی زندگی کے انتشار اور دہشت کی کثیف فضا میں بھی تازہ ہوا کے جھونکے کا لطیف احساس دلاتی ہے۔ محمود اختر سعید ابتدا ہی سے الاقربا سے وابستہ رہے ہیں اس لیے ان کی تحریر کو اولین اور بنیادی ماخذ کا درجہ حاصل ہے۔ سید منصور عاقل نے ''گزارش احوال واقعی'' کے عنوان سے الاقرباء کے اداریے اور ان کے تخلیقی محرکات کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ حرف معتبر میں افتخار عارف کا لکھا ہوا سید منصور عاقل کا تعارف بھی شامل ہے۔ الاقربا نے آزادیٔ اظہار کو اپنا مطمحِ نظر بنا رکھا ہے۔ قارئین کے خطوط کا حصہ اس مجلّے کا دلچسپ حصہ خیال کیا جاتا ہے جس میں قارئین اس مجلّے میں شامل مضامین اور دیگر تخلیقات کے بارے میں اپنی بے لاگ رائے دے کر مجلس ادارت کو راہ

راست پر رکھنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ حرف معتبر میں قارئین الاقرباء کے پچھتر (۷۵) مکاتیب سے اقتباسات شامل کیے گئے ہیں۔ پوری دنیا میں موجود الاقربا کے لاکھوں قارئین میں سے الاقربا کے یہ پچھتر قارئین ایسے ہیں جن کی فہم وفراست اور ذوق سلیم کا ایک عالم معترف ہے۔ ان زیرک قارئین ادب نے اپنی مسلسل مراسلہ نگاری سے یہ ثابت کر دیا ہے کہ وہ عالمی ادبیات کے نباض اور قارئین ادب کے مزاج آشنا ہیں۔ ان تمام مراسلہ نگاروں نے الاقربا کی مختلف اشاعتوں کے اداریوں کے بارے میں جو رائے دی ہے اسے شامل اشاعت کر کے اس کتاب کی ثقاہت میں اضافہ کیا گیا ہے اور یہ واقعی حرف معتبر ثابت ہوئی۔

سائنس اور ٹکنالوجی کے عروج کے موجودہ زمانے میں الاقربا نے اقتضائے وقت کے مطابق اپنی اشاعت کو پرنٹ اور سائبر دونوں صورتوں میں پیش کیا ہے۔ اس مجلّے کے تمام شمارے اس کی ویب سائٹ پر پی۔ڈی۔ایف فارمیٹ میں موجود ہیں ان کا براہ راست آن لائن مطالعہ بھی کیا جاسکتا ہے اور ڈاؤن لوڈ کر کے ان کا پرنٹ بھی لیا جاسکتا ہے۔ ای۔میل کے ذریعے مجلس ادارت سے فوری رابطے کا اہتمام بھی کر دیا گیا ہے۔ اس اعتبار سے یہ مجلّہ اکیسویں صدی کے تقاضوں کے مطابق تخلیق ادب کو متعدد نئی جہات سے آشنا کرنے میں پیہم مصروف عمل ہے۔ اداریہ نویسی میں بھی مجلّے نے ایک منفرد انداز اپنایا ہے۔ سید منصور عاقل نے یہ کوشش کی ہے کہ معاشرتی زندگی کو رنگ، خوشبو اور حسن وخوبی کے استعاروں سے مزین کر کے زندگی کی حقیقی معنویت کو اجاگر کیا جائے۔ انھوں نے ان اقدار وروایات کے فروغ اور ترویج واشاعت پر توجہ دی ہے جن سے زندگی کی رعنائیوں میں اضافہ ممکن ہے۔ زندگی کی یہی درخشاں اقدار و روایات مہذب معاشرے کا امتیازی وصف ہیں اور ان ہی کی اساس پر کسی بھی قوم یا ملک کے کلچر کا قصر عالی شان تعمیر ہوتا ہے۔ سید منصور عاقل نے الاقربا کے اداریوں میں فنون لطیفہ میں قومی کلچر کی اہمیت کو اجاگر کرنے کی جو مساعی کی ہیں وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ ان اداریوں میں صداقت، خلوص، دردمندی، حریت فکر، بے باکی اور انسانی ہمدردی کے جذبات کی فراوانی نے انھیں حرکت وعمل کا نقیب بنا دیا ہے۔

قارئین ادب اور تخلیق کاروں کے ساتھ اخلاق اور اخلاص کے ساتھ پیش آنا سید منصور عاقل کا شیوہ ہے۔ الاقربا کے اداریوں میں جو توازن، اعتدال اور منصفانہ طرز عمل پایا جاتا ہے۔ وہ سید منصور عاقل کی عظیم شخصیت کا لائق صد رشک پہلو سامنے لاتا ہے۔ معاشرتی زندگی میں پائی جانے والی بے اعتدالیوں، تضادات اور شقاوت آمیز ناانصافیوں پر وہ چپ نہیں رہ سکتے۔ ہوائے جور وستم میں بھی وہ حرف صداقت کی مشعل فروزاں رکھتے ہیں اور سفاک ظلمتوں کو کافور کرنے میں اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے ظلم وناانصافی کہیں بھی ہو اس کے خلاف آواز بلند کرنا ہر باضمیر ادیب کا فرض ہے۔ ظلم کو سہنا اور اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہ کرنا نہ صرف ایک اہانت آمیز فعل ہے بلکہ اس سے ظالم وسفاک، موذی ومکار استحصالی عناصر کو کھل کھیلنے کا موقع ملتا ہے۔ جب معاشرے میں ذاتی مفاد کو قومی مفاد پر ترجیح دی جانے لگے تو بے حسی کی یہ کیفیت قومی ترقی کے لیے بہت بُرا شگون ہے۔ اپنے ایک اداریے 'ہوس کو ہے نشاط کار کیا کیا'' میں سید منصور عاقل نے لکھا ہے:

''بد قسمتی سے سربراہ حکومت نے جنھیں عوام الناس میں اپنے اوصاف حمیدہ کے باعث اعتماد واحترام حاصل ہے محض اس لیے ایک مطلقاً قانونی اقدام کو کالعدم قرار دے دیا کہ اس سے ایک ایسا شخص متاثر ہو رہا تھا جو ادب کے حوالے سے سرکار کا اعزاز یافتہ بھی ہے اور اثر ورسوخ کا حامل بھی۔ چنانچہ قانون وانصاف کی اس بے حرمتی پر اہل نظر کبیدہ خاطر ہی نہیں بلکہ حیران وششدر بھی ہیں جب کہ اسی سانحہ کے مضمرات بے شمار دیگر دادخواہوں کو مایوسی و بے اعتمادی کے آسیب میں مبتلا کر سکتے ہیں۔ بہ قول محسن احسان:

جہاں انصاف بکتا ہے جہاں آئیں نہیں رہتا   وہاں پر ضابطے کی دھجیاں اڑتی ہی رہتی ہیں
پھر ایسے مجرموں کا جُرم بھی سنگیں نہیں رہتا   ذرا سی منصفوں سے آشنائی کی ضرورت ہے

فطرت اور تاریخ کے مسلسل عمل پر سید منصور عاقل کی گہری نظر ہے۔ حرف معتبر کے اداریے قومی زندگی کے جملہ نشیب وفراز اور اسرار ورموز کے بارے میں عوامی انداز فکر کو ایک کلیت کی

صورت میں صفحۂ قرطاس پر منتقل کر کے قومی سوچ کی ترجمانی کرتے ہیں ان کے ذریعے قارئین ادب میں قومی مسائل کے بارے میں مثبت شعور و آگہی پروان چڑھانے میں مدد ملے گی مثال کے طور پر وہ ایک اداریے جس کا عنوان ''قومی زبان کی تذلیل۔۔۔حمیت باختہ سفارت کاری'' ہے میں لکھتے ہیں:

''اردو کے طلبا کو استنبول میں پاکستانی قونصل خانے بھیجا تاکہ ایک پروگرام کے مطابق وہ پاکستانی عملے سے روابط کے دوران اپنی اُردو بول چال کے معیار کو بہتر بنا سکیں، نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ اولاً تو ان طلبا کی اردو میں گفتگو کا جواب انگریزی میں دیا گیا اور پھر یہ کہہ کر کہ ''کیا پاگل ہو گئے ہو؟ اردو کیوں سیکھ رہے ہو؟ کیا تمھیں دنیا میں اور کوئی کام نہیں؟'' (۶)

اس اداریے میں سید منصور عاقل نے استنبول کے قونصل خانے میں تعینات پاکستانی سفارتی عملے کے اس منفی طرزِ عمل پر کڑی تنقید کی ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جب بڑے عہدوں پر چھوٹے لوگ اونچی مسند پر نیچی سوچ کے حامل بالشتیے اور عقابوں کے نشیمن میں زاغ و زغن غاصبانہ طور پر جا گھسیں گے تو اس قسم کی بوالعجبیاں اور طرفہ تماشے روزمرہ کا معمول بن جاتے ہیں۔ سید منصور عاقل نے اسی اداریے میں اس طرزِ عمل پر گرفت کرتے ہوئے جو استفسار کیا ہے وہ چشم کشا صداقتوں سے لبریز ہے:

''اب ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ بیرونِ ملک ہمارے سفارتی دفاتر کے مقاصد کیا ہیں اور کیا ان کے فرائض میں سیاسی سفارت کاری کے علاوہ پاکستان کی تہذیب و ثقافت کو متعارف کرانے میں جس میں قومی زبان ہمیشہ سرِفہرست ہوتی ہے کوئی کردار ہے بھی کہ نہیں؟'' (۷)

زندگی کی اقدارِ عالیہ سے دلی محبت کرنا سید منصور عاقل کا مطمحِ نظر رہا ہے۔ وہ اس امر کی جانب توجہ دلاتے ہیں کہ وطن اور اہلِ وطن کے ساتھ قلبی وابستگی اور والہانہ محبت کا شمار ہمہ گیر نوعیت کی اقدار میں ہوتا ہے۔ اسی کی اساس پر قومی وقار اور ملی عظمت کا دارومدار ہے۔ ہمارے ان سفارت کاروں کی کورمغزی اور بے بصری کا کیا ٹھکانہ جو قومی تخریب میں مصروف ہیں اور اسی شجر

سرمایہ دار کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں لگے ہیں جو ہم سب کے سر پر سایہ فگن ہے اور ہمیں آلام روزگار کی تمازت سے محفوظ رکھتا ہے۔ یہ لوگ مادر وطن کی تہذیب و ثقافت کو اپنی ہفوات سے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ان کی کوتاہ اندیشی ملک دشمن عناصر کو خوش کرتی ہے اور وہ مادر وطن کے ان دشمنوں اور آستین کے سانپوں کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتے ہیں۔ مادر وطن کی تہذیبی اور ثقافتی اقدار کے خلاف تہمت لگانے والوں کے بارے میں یہی کہا جا سکتا ہے۔

تہمت لگا کے ماں پہ جو دشمن سے داد لے   ایسے سخن فروش کو مر جانا چاہیے

ادب کے وسیلے سے معاشرتی زندگی کو امن، راحت اور سکون کا گہوارہ بنانے کی تمنا میں سید منصور عاقل نے الاقربا کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کر کے علم و ادب کی جو خدمت کی ہے وہ تاریخ کے اوراق میں آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔ ہوس زر اور جلب منفعت نے معاشرتی زندگی کو جس مایوسی، محرومی، انتشار اور مسموم صورت حال کی بھینٹ چڑھا دیا ہے اس نے تمام رُتیں ہی بے ثمر کر دی ہیں۔ حرف معتبر کے اداریے سید منصور عاقل کی حب الوطنی، انسانی ہمدردی اور دور اندیشی کے مظہر ہیں۔ وہ حالات حاضرہ پر تحقیقی و تنقیدی نگاہ ڈالتے ہیں اور اس سے اپنے تخلیقی عمل بالخصوص ادارتی کلمات کے لیے مواد حاصل کرتے ہیں۔ یہ اداریے ان کے تبحر علمی، وسعت نظر اور قومی حمیت کے آئینہ دار ہیں۔ ان ادارتی کلمات میں انھوں نے جو دھنک رنگ منظر نامہ پیش کیا ہے وہ قاری کے قلب و نظر کو مسخر کر لیتا ہے اور اس کو ایک جہان تازہ کی جانب لے جاتا ہے۔ مضامین اور موضوعات کا تنوع، ندرت اور تازگی فکر و خیال کے نئے گوشے سامنے لاتی ہے۔ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت میں 'حرف معتبر' کو سنگ میل کی حیثیت حاصل ہے۔

حواشی

۱ نیاز فتح پوری کی ادارت میں شائع ہونے والے ادبی مجلّے ''نگار'' نے پہلے آگرہ سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا اس کے بعد یہ مجلّہ کچھ عرصہ بھوپال سے شائع ہوتا رہا کچھ عرصہ یہ لکھنؤ سے مسلسل شائع ہوتا رہا۔ نامور ادیب نیاز فتح پوری کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں بھارتی حکومت کی جانب سے انھیں ۱۹۶۲ء میں پدما بھوشن ایوارڈ عطا کیا گیا۔ قیام پاکستان کے بعد مجلّہ نگار کراچی سے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی ادارت میں ۲۰۱۳ء کے وسط تک شائع ہوتا رہا۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے تاریخی ادبی مجلّے ماہ نامہ نگار، کراچی کے چار سو سے زائد اداریے لکھے۔

۲ ممتاز شریں اور ان کے شوہر صمد شاہین کی ادارت میں شائع ہونیوالے اس مجلّے نے ۱۹۴۴ میں بنگلور (بھارت) سے روشنی کے سفر کا آغاز کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ممتاز شریں اپنے شوہر کے ساتھ کراچی آ گئیں اور ''نیا دور ۱۹۵۲'' تک کراچی سے شائع ہوتا رہا۔

۳ شاہد احمد دہلوی کے دادا ڈپٹی نذیر احمد اردو کے عناصر خمسہ (سرسید، حالی، شبلی، نذیر احمد، محمد حسین آزاد) میں شامل ہیں۔ مجلّہ ساقی قیام پاکستان سے پہلے دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد اس تاریخی مجلّے نے شاہد احمد دہلوی کی ادارت میں کراچی سے اپنی اشاعت کا آغاز کیا۔ ساقی اپنے عہد کا مقبول و موقر ادبی مجلّہ تھا جس میں اپنی ابتدائی ادبی تخلیقات پیش کرنے والے تخلیق کاروں نے بعد میں اپنی خداداد صلاحیتوں کی بنا پر شہرت حاصل کی۔ عصمت چغتائی کا پہلا افسانہ ۱۹۳۸ء میں ساقی میں شائع ہوا

۴ سید منصور عاقل: حرف معتبر، اداریہ الاقربا ''جامع کراچی کی غلط بخشی'' اکتوبر۔ دسمبر ۲۰۱۱ء، الاقربا فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۲۰۱۳ء، صفحہ ۲۲۶

۵ ایضاً صفحہ ۹۳

۶ ایضاً صفحہ ۲۲۳

۷ ایضاً صفحہ ۲۲۴

کتاب : جنوبی ایشیا میں طباعت کا آغاز وارتقا

مصنف : ڈاکٹر معین الدین عقیل

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : صیغۂ مطبوعات۔ شعبۂ ابلاغ عامہ۔ جامعہ کراچی

قیمت : (درج نہیں)

صدر نشین، شعبۂ ابلاغ عامہ جامعہ کراچی ڈاکٹر طاہر مسعود اپنے تقریظی کلمات بعنوان ''کتاب یا شمع'' میں کتاب اور صاحب کتاب کے بارے میں فرماتے ہیں:

- ''ڈاکٹر معین الدین عقیل اردو زبان وادب کے ایک ایسے محقق ہیں جنھوں نے اپنی کُل زندگی کو علم وتحقیق کے لیے وقف کر رکھا ہے۔''
- ''انھوں نے زیر نظر مختصر سی کتاب میں گویا سمندر کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔''
- ''ڈاکٹر عقیل نے اس معلومات افزا کتاب کو اردو کے مشہور ناشر نول کشور کے نام معنون کیا ہے۔ منشی مرحوم اسلام اور مسلمانوں کے عظیم محسن تھے۔''

بلاشبہ صاحب کتاب ایک بلند مرتبہ دانشور۔ محقق ومعلّم اور نقاد ہیں۔ وہ ملک میں اور بیرونِ ملک معروف جامعات میں درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے ہیں۔ اردو زبان وادب کے اکثر مخفی گوشوں پر اُن کی تحقیقی کاوشوں نے طلباء وطالبات اور تشنگانِ علم کو جغرافیائی حدوں سے ماوراہو کر بھی فیضیاب کیا ہے جب کہ زیر نظر تحقیق ایک ایسا گنجینۂ معارف اور جامعیت کا مرقع ہے جسے بجا طور پر ڈاکٹر طاہر مسعود نے 'سمندر کو کوزے میں بند کر دینے' کے مصداق ٹھہرایا ہے۔ فاضل مصنف کی اعلیٰ ظرفی ہے کہ انھوں نے اپنی اس بھرپور کاوشِ علمی کو بہ اعتبارِ موضوع منشی نول کشور جیسی عظیم ہستی سے منسوب کیا ہے۔ اور بہ این الفاظ خراجِ تحسین پیش کیا۔

''انیسویں صدی میں علوم اسلامیہ اور عربی و فارسی اور اردو زبان و ادب کے سب سے بڑے محسن و ناشر منشی نول کشور کے نام کہ جن کی خدمات کا اعتراف قومی و ملی سطح پر عالمِ اسلام اور مملکت اسلامیہ پاکستان میں نہ کیا جا سکا۔ ایسا اعتراف مسلم ملت پر قرض ہے۔''

واقعی یہ قرض ایسا ہے کہ منشی نول کشور کی عظیم الشان خدمات کے پیش نظر مسلسل اعتراف و توصیف کے باوجود بھی یہ قرض آئندہ مسلمان نسلوں پر باقی رہے گا۔ اس ضمن میں میرے مرحوم رفیقِ کار محمود اختر سعید کا ایک مبسوط تحقیقی مقالہ بعنوان ''قیصرِ ہند منشی نول کشور'' سہ ماہی 'الاقرباء' شمارہ اپریل۔ جون ۲۰۰۷ء میں شائع ہو چکا ہے۔ انھیں ''قیصرِ ہند'' کا خطاب انگریز حکومت کی جانب سے اعترافِ خدمات کے طور پر عطا کیا گیا۔ مزید ایک اور خطاب 'سی۔ آئی۔ ای' (Companion of the most exalted order of the Indian Empire") ۱۸۸۸ء میں مرحمت کیا گیا۔ اسی مقالے میں میرے مرحوم دوست نے فاضل مصنف کے حوالے سے بھی تحریر کیا ہے کہ ''ڈاکٹر معین الدین عقیل نے اپنے ایک مقالہ بعنوان 'سورج کے دیس میں اردو کا چاند' میں پروفیسر سوزوکی تاکیشی جو ٹوکیو یونیورسٹی میں صدر شعبۂ اردو تھے اور آج کل ٹوکیو یونیورسٹی آف فارن لینگویجز میں سینئر اُستاد ہیں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ پروفیسر تاکیشی نے منشی نول کشور کی ادبی خدمات کی نشان دہی کرتے ہوئے بڑے پُر مغز مقالے لکھے ہیں'' یہی نہیں 'الاقرباء' میں مطبوعہ مذکورہ مقالہ میں 'منجملہ دیگر' منشی نول کشور کو خراجِ تحسین پیش کرنے والے مسلمان اہل علم و قلم کا ذکر کیا گیا ہے اُن میں مرزا اسداللہ خاں غالب سرِ فہرست ہیں۔ مرزا فرماتے ہیں:

''خدا نے ان کو حسنِ صورت اور حسنِ سیرت دونوں سے نوازا تھا'' دیگر اسمائے گرامی میں سر سید احمد خان (رسالہ تہذیب الاخلاق یکم جمادی الثانی ۱۲۸۰ھ)، مولانا عبدالمجید سالک (مضمون بعنوان 'علمی و ادبی ذخیرے کی حفاظت' مطبوعہ 'نیرنگِ خیال' جوبلی نمبر ۱۹۵۰ء) نجیب اشرف ندوی (مقالہ 'اودھ ریویو' مطبوعہ رسالہ نوائے ادب بمبئی۔ اکتوبر ۱۹۵۷ء) ناظر کاکوروی (مصنف کتاب 'اردو کے ہندو ادیب'') امداد صابری (مؤلف کتاب 'تاریخ صحافتِ اردو'')

ڈاکٹر حنیف نقوی۔ منشی انوار حسین تسلیم (مضمون مطبوعہ ماہنامہ تعمیر ہریانہ نول کشول نمبر جولائی۔ اگست ۱۹۷۹ء) ڈاکٹر محمد حسن (مقالہ) پروفیسر ندیم اشرف ندوی (مضمون مطبوعہ نوائے ادب بمبئی اکتوبر ۱۹۵۷ء) یہاں میں ایک مختصر اقتباس ''انسائیکلو پیڈیا پاکستان نیکا'' مؤلفہ سید قاسم محمود سے پیش کرنا چاہوں گا جس کا حوالہ مرحوم محمود اختر کے مقالے میں موجود ہے اور جو ڈاکٹر معین الدین کی زیر تبصرہ کتاب کے انتساب کو مکمل جواز مہیا کرتا ہے:

''قرآن مجید اور اس کی مختلف تفاسیر کی اشاعت کے سلسلہ میں منشی نول کشور کی خدمات کسی بھی مسلمان اور پاکستانی ناشر سے کم نہیں ہیں۔ اُن کے پریس میں قرآنِ مجید کی طباعت کا انتظام اتنا پاکیزہ تھا جو آج تک کسی بھی مسلمان اشاعتی ادارے کو نصیب نہیں ہو سکا۔ منشی جی غیر مسلم ہونے کے باوجود ملازمین کو جب تک انھوں نے غسل نہ کیا ہو اور باوضو نہ ہوں مشین کے قریب نہیں آنے دیتے تھے۔ طباعت کے بعد وہ پتھر جن سے چھپائی ہوتی تھی دھوئے جاتے تو ان کا پانی ایک حوض میں جمع کیا جاتا اور وہاں سے دریائے گومتی کے بیچوں بیچ لیجا کر بہایا جاتا۔ اشاعت کے دوران قرآن مجید کے جو صفحات خراب ہو جاتے اُنھیں بھی چن چن کر جمع کیا جاتا اور دریا میں ٹھنڈا کیا جاتا۔''

تحقیق و جستجو کی شاہکار ڈاکٹر معین الدین عقیل کی زیر نظر تصنیف فصاحت و بلاغت کا ایک ارفع نمونہ بھی ہے جو اُن کے دو مقالات پر مشتمل ہے اور ''معروضہ'' کے زیر عنوان ان کی مہیا کردہ معلومات کے مطابق اول الذکر مقالہ پہلے فارسی اور انگریزی میں شائع ہوا بعد از آں لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز (LUMS) کے تحقیقی مجلّے ''بنیاد'' کے شمارہ ۴، ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔ اور ایک سال بعد دوسرا مقالہ بھی منظر عام پر آیا۔ فاضل مصنف فرماتے ہیں کہ کتاب میں ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے جو ''تقریظ مصباح الہدایت'' بلکہ اس سے بھی قدیم تر اور نادر و نایاب ایک ایسی تحریر پر مشتمل ہے جسے نامور مورخ مرزا ابو طالب اصفہانی نے لکھا تھا۔ ضمیموں میں مصنف کا انگریزی مقالہ بھی شامل ہے تاہم قارئین زیر نظر تحقیقی کاوش کو سندِ اعتبار عطا کرنے والی حواشی و

تعلیقات اور اسنادِ محولہ کی اُس طویل وضاحتی فہرست سے اندازہ لگا سکتے ہیں جو مصنف کے وسیع المطالعہ ہونے اور اُن کی عرق ریزی پر گواہ ہے۔ اُنھوں نے جنوبی ایشیا میں طباعت کے آغاز و ارتقاء سے قبل باقی اسلامی دنیا میں بھی اس رجحان سے متعلق حوالوں میں بتایا ہے کہ پندرھویں صدی میں قرآن حکیم عربی رسم الخط میں شائع ہو چکا تھا اور ترکی میں ۱۴۹۳ء تک اسپین سے آنے والے یہودی آبادکاروں نے اپنے مطابع قائم کر کے اپنی مذہبی اور علمی کتابیں شائع کرنا شروع کر دی تھیں اور سولھویں صدی میں شام کے عیسائی باشندے عربی کتابوں کی اشاعت کے لیے مطابع استعمال کرنے لگے تھے۔ تاہم انیسویں صدی کے اوائل میں ترکی اور ہندوستان میں مذہبی کتابوں کی اشاعت شروع ہوگئی جب کہ یہ عمل یورپ سے عربی مطبوعات کی درآمد کے ساتھ ہی۔ ۱۷۳۴ء میں لبنان میں بھی شروع ہو چکا تھا اور ایران میں مطابع کے قیام کی رفتار اس قدر تیز تھی کہ ۱۸۴۲ء میں صرف تبریز شہر میں یہ تعداد ۱۶ ہوگئی تھی۔

جنوبی ایشیا میں عربی اردو اور فارسی زبانوں میں طباعت کا عمل اٹھارہویں صدی کی تیسری دہائی میں عام ہوگیا تھا ۱۸۰۰ء میں کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج کے قیام کے بعد نصابی اور تعلیمی ضرورتوں کے تحت ۱۸۰۲ء میں "ہندوستانی پریس" کے نام سے ایک مستقل مطبع قائم ہو چکا تھا۔ فاضل مصنف نے برصغیر میں قائم ہونے والے اولین مطابع میں "مطبع شکر اللہ" اور لکھنؤ کے "مطبع سلطانی" کا ذکر کیا ہے اور طباعت کے تکنیکی ارتقا کے سلسلے میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

فاضل مصنف مطبع نول کشور کو انیسویں صدی کے ہندوستان میں طباعت کے فروغ کی مثال قرار دیتے ہیں۔ اور یہ مثال ۱۹۴۰ء تک قائم رہی اس کے ساتھ ہی فارسی طباعت کے زوال کی جانب کتاب میں واضح حوالے ملتے ہیں یہاں تک کہ تقسیم ہندوستان کے بعد یہ زوال بڑھتا ہی چلا گیا البتہ پاکستان میں فارسی متون کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں بعض علمی و ادبی اداروں کا کردار نمایاں رہا جن میں مجلس ترقی ادب (لاہور) اقبال اکیڈیمی پاکستان (لاہور) پنجابی اکیڈمی (لاہور) جامعہ پنجاب اور اس کے ذیلی ادارے۔ ادارۂ تحقیقات پاکستان (لاہور) سندھی ادبی

بورڈ (حیدر آباد۔ سندھ) اور انجمن ترقی اردو (کراچی) شامل ہیں۔

مجھے امید ہے کہ ڈاکٹر عقیل کی یہ عالمانہ سعی مشکور ملک میں اور بیرون ملک صاحب بصیرت حلقوں میں بہ نظر استحسان دیکھی جائے گی

کتاب : روزہ اور ہماری زندگی

مصنف : ڈاکٹر انیس احمد

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : منشورات۔ منصورہ ملتان روڈ۔ لاہور

قیمت : ۲۹۶ روپے

- ''رمضان الکریم کے روزوں کی حیثیت دین کے ایک ستون کی ہے۔''
- ''روزہ کے روحانی پہلوؤں پر خاص توجہ دی گئی ہے''
- ''تیس مختلف لیکن مربوط موضوعات پر قرآن و احادیث نبویؐ کی روشنی میں اظہار خیال کیا گیا ہے۔''

ہر چند کہ زیر نظر کتاب کا عنوان ہی کتاب کے موضوعی اور معنوی تعارف کے لیے کافی ہے تاہم فاضل مصنف کے اظہارِ تشکر پر مبنی کلمات سے ماخوذ مندرجہ بالا جملوں سے معتبر ترین مآخذ اور ذیلی موضوعات پر مزید روشنی پڑتی ہے جس سے قارئین کتاب کی اہمیت وافادیت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر انیس احمد ایک بلند پایہ مذہبی سکالر۔ دانشور۔ ماہر تعلیم اور بین الاقوامی سطح کی جامعہ کے صدر اور وائس چانسلر کی حیثیت سے عالمی شناخت رکھتے ہیں اور کسی تعارف کے محتاج نہیں لیکن اُن کی اس تازہ تصنیف کے مطالعہ کے بعد میں صدق دل سے محسوس کرتا ہوں کہ اُن کی معارف نگہی

اور تحقیقی بصیرت کو خراجِ تحسین پیش نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ اُن کے برادرِ بزرگ پروفیسر خورشید احمد نے بھی جو خود جہانِ دانش وحکمت کا ایک محترم ومعتبر حوالہ ہیں کتاب کے پیش لفظ میں ارشاد فرمایا:

''مجھے خوشی ہے کہ میرے عزیز بھائی ڈاکٹر انیس احمد نے ''روزہ اور ہماری زندگی'' میں روزہ کے ہمہ جہتی کردار کا بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ احاطہ کیا ہے۔ اس پہلو سے یہ کتاب مفید ہی نہیں منفرد بھی ہے۔۔۔۔ یہ ایک آئینہ ہے جس میں اسلامی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہے۔''

اسلامی موضوعات پر دنیا بھر میں بے حدو بے حساب لٹریچر تخلیق ہو چکا ہے۔ دین کے ایک رکن کی حیثیت سے روزہ کا ''ہمہ جہتی کردار'' بھی اہلِ قلم کے لیے ہمیشہ جاذبِ توجہ بنا رہا ہے۔ چنانچہ زیرِنظر کتاب کو ''مفید ومنفرد'' اور ایک ایسا ''آئینہ'' قرار دینا جس میں اسلامی زندگی کی مکمل تصویر دیکھی جاسکتی ہو اُس پر کتاب کا تمام متن گواہی دے رہا ہے۔ تحقیق ومعروضیت اور عصری آگہی بھی صاحب تصنیف کے ایسے اوصاف ہیں جنھوں نے کتاب کو علمی اعتبار سے وہ منزلت عطا کی ہے کہ جامعات کے شعبہ ہائے اسلامیات کے نصاب میں شامل کیے جانے کی توقع کسی طرح بے جانہ ہوگی۔ مثلاً ۱۰ رمضان المبارک کو یوم باب الاسلام قرار دیا جانا جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لیے انتہائی تاریخی اہمیت کا موضوع ہے جس کے متعلق فاضل مصنف کہتے ہیں کہ ''یوم باب الاسلام دراصل ایک نئی ثقافت، ایک نئی تہذیب، ایک نئے رجحان کی علامت ہے''۔ اس کثیر المعانی جملے میں اُن تمام عوامل' بشمول محمد بن قاسم کی ایک عظیم انسانی مقصد کے لیے آمد اور راجہ داہر کی شکست جو برصغیر میں دعوت اسلام بن کر اثر پذیر ہوئی نیز ایک اسلامی مملکت کی حیثیت سے پاکستان کا قیام۔ ایک نئی تہذیب وثقافت کا ظہور۔ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی۔ اُن کے صاحبزادگان شاہ رفیع الدین۔ شاہ عبدالعزیز اور عبدالحق محدث دہلوی جیسی عظیم ہستیاں جن کے سلسلہ فکر وعمل کو حضرت شاہ اسمٰعیل شہید نے نقطۂ عروج تک پہنچانے میں عہد ساز کردار ادا کیا' فاضل مصنف نے اِن تمام مراحل کا احاطہ مکمل تاریخی بصیرت کے ساتھ کیا ہے۔

کتاب کے ہر باب میں رفتارِ زمانہ کی گرد میں دھندلا جانے والے ماہِ صیام کے دوران اہم تاریخی واقعات۔ صوم وصلوۃ کے روحانی اور ایمانی پہلو۔ مغالطوں اور ابہام کی نذر ہو جانیوالے دینی احکام جامعیت اور مکمل دلائل وشواہد کے ساتھ واضح کیے گئے ہیں۔ رویت ہلال کے موضوع پر جسے متنازعہ بنادیا گیا ہے قرآن وحدیث کے احکام کی روشنی میں ہر عام قاری کو راہِ ہدایت صاف صاف دکھائی دینے لگتی ہے یعنی ''اگر ایک معتبر شخص نے بھی چاند دیکھ لیا ہے تو رمضان کا آغاز ہو جائے گا'' ورنہ ۳۰ رمضان کے بعد رمضان شروع ہوگا۔ صاحب تصنیف نے معتبر حوالوں اور ناقابلِ تردید دلائل سے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ علماء وفقہا کے درمیان ٹکراؤ اسلامی تعلیمات اور سائنسی تحقیقات میں اِس حوالے سے کوئی نظر نہیں آتا۔

'' روزہ اور انسانی نفسیات'' کے باب میں بھی فاضل مصنف نے نہایت سلیس ودلنشیں انداز میں دقیق وعمیق نکات کو بیان کر کے دینی خدمت کا فریضہ انجام دیا ہے وہ فرماتے ہیں:

''روزہ ہمیں ایک ایسا نظامِ عمل دیتا ہے جس میں نفسیاتی سکون، نفسیاتی اعتماد اور شخصیت کا وہ نشو ونما ہوتا ہے جو بہت بڑی بڑی کتابوں کے مطالعہ کے ذریعہ ہمارے اندر یہ اعتماد پیدا کرتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہمیں دیکھ رہے ہیں اور ہم اُن کو دیکھ رہے ہیں۔''

میں سمجھتا ہوں کہ وہ تمام اہم ترین موضوعات جنھیں مختلف ابواب میں تقسیم کر دیا گیا ہے اُن کی تعداد تیس (۳۰) ہونا بھی رمضان المبارک کے تیس رزوں کی نسبت ایک خوبصورت کنایہ ہے جو فاضل مصنف کی بلاغتِ فکر کا مظہر ہے۔ اس کا اندازہ صرف چند عنوانات کی افادیت واہمیت سے ہو سکتا ہے مثلاً روزہ اور تقویٰ کی روش۔ روزہ کے آداب۔ روزہ اور تعمیر سیرت۔ روزہ اور اخلاقی انقلاب۔ روزہ اور حقوق العباد۔ روزہ اور صبر۔ روزہ اور اصلاحِ نفس وغیرہ

رمضان الکریم کی تحریم وتقدیس کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام اس ماہِ مبارکہ میں نازل فرمایا۔ فاضل مصنف نے ایسے دیگر واقعات کا بھی احاطہ کیا ہے اور قارئین کو محققانہ اور نادر مواد مہیا کیا ہے ان میں، منجملہ دیگر، شہادتِ حضرت عمرؓ وحضرت علیؓ۔ یورم بدر اور یوم

فتح مکہ پر ابواب شامل کیے ہیں۔ شہادت حضرت علیؓ کے باب میں مصنف رقمطراز ہیں:

- ''حضرت علیؓ کی شہادت سے اسلامی ریاست اور اسلام کے سیاسی نظام کے خلاف سازشوں کے ایک ایسے سلسلہ کا آغاز ہوا جس کے نتیجہ میں اسلامی ریاست کے بنیادی خدوخال میں تبدیلیاں رونما ہوئیں اور دورِ رسالتمآب اور دورِ خلافتِ راشدہ کے اُس نمونے سے اُمت کا اجتماعی نظام دُور ہو گیا۔
- ''رمضان کریم میں حضرت علیؓ کی شہادت سے خلافتِ راشدہ کی شورادی روایت تھوڑے ہی عرصہ میں ملوکیت میں تبدیل ہو گئی''

یوم بدر کو ایک اہم تاریخ ساز واقعہ قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر انیس احمد لکھتے ہیں:

- ''یہ نہ صرف انسانی تہذیب کی تاریخ میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے بلکہ رمضان کریم کی برکات کے حوالے سے بہت قابلِ غور ہے''
- ''یہ بلاشبہ حق و باطل کا ایک عظیم معرکہ تھا۔ ایک جانب مشرکانہ تہذیب و ثقافت کے علمبردار ابوجہل اور عتبہ تھے تو دوسری جانب توحید کے شیدائی عمرؓ اور علیؓ تھے''
- ''یہ پہلا غزوہ ہے جو اس بات کا اعلان تھا کہ اُمتِ مسلمہ محض اپنی مدافعت نہیں کرے گی بلکہ وہ آگے بڑھ کے اس دین کے لیے جب ضرورت پیش آئے گی قوت کا استعمال بھی کرے گی''

تاریخی واقعات کا اعادہ ایسی توضیحات کے ساتھ کہ وہ عصری معنویت بھی رکھتی ہوں اور عامۃ المسلمین کو دعوتِ فکر و عمل ہی نہیں راہِ ہدایت بھی دکھاتی ہوں، کتاب کا یہ اُسلوب نگارش ازاوّل تا آخر انفرادیت کا آئینہ دار نظر آتا ہے۔ جس کی طرف پروفیسر خورشید احمد نے اپنی تقریظ میں اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ فاضل مصنف فتح مکہ کو تمام انسانیت کی تاریخ میں سنگِ میل قرار دیتے ہیں اور سچ کی فتح اور باطل کی شکست کو فتح مبین سے تعبیر کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

- ''فتح مکہ فتح مبین تھی۔ صلح حدیبیہ کے حوالے سے نازل ہونے والی آیت اس فتح پر بھی صادق آتی ہے''
- ''فاتحِ اعظمؐ نے فتح مکہ کے موقع پر بھی اس چیز کو واضح فرمادیا کہ آپؐ کا مقصد لوگوں کو قوت کا مظاہرہ کر کے زیر کرنا نہیں ہے بلکہ اپنے اخلاق، اُس عظمت کردار سے جو نبوت اور رسالت سے آپؐ کو حاصل ہوئی تھی، یہ دکھانا مقصود ہے کہ فتح سچ کی ہے حق آگیا اور باطل چلا گیا''
- ''فتح مکہ نے یہ چیز بھی واضح کر دی کہ آئندہ انقلاب اور تبدیلی کا ماڈل یا سوشل چینج کا طریقہ کیا ہوگا۔''

اس حقیقت پر شک یا وہم گمان کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں کہ فتح مکہ اپنے مقاصد، مضمرات و امکانات اور منطقی انجام کے پیش نظر ایک ایسا عظیم الشان اور سبق آموز واقعہ ہے کہ جس کی مثال عالمِ انسانیت کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں۔ یہ آنحضورؐ کے عفو و درگزر کی پالیسی کا ایسا شاہکار ہے کہ اگر پہلی جنگ عظیم کی فاتح قوتوں نے اس پالیسی کو پیش نظر رکھا ہوتا جس کا مظاہرہ فتح مکہ کے بعد بدترین دشمنوں تک کو معاف کر کے کیا گیا، تو دوسری جنگِ عظیم ہرگز برپا نہ ہوتی۔

میں ڈاکٹر انیس احمد صاحب کو ایسی پُر مغز و پُر اخلاص تصنیف کی سعادت حاصل کرنے پر ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

کتاب : سر دشتِ گماں (شعری مجموعہ)
شاعرہ : عنبرین صلاح الدین
مبصر : سید منصور عاقل
ناشر : ملٹی میڈیا افیئرز ۔ ۲۱ نند سٹریٹ شام نگر۔ چوبُرجی۔ لاہور
قیمت : ۲۵۰ روپے

تأثر اور حسنِ اظہار کے اعتبار سے چاہونگا کہ زیرِ تبصرہ شعری مجموعہ کی شاعرہ کی ایمان افروز

حمدیہ شاعری۔عقیدت ومحبت سے سرشار نعت نگاری اور والہانہ حُب وطن کے مظہر اشعار پر سب سے پہلے توجہ مرکوز کروں کہ ان میں جذبہ واحساس کا عکس اور فکر وفن کے متنوع پہلو صاف نظر آتے ہیں۔

صداؤں کے غبار بے اماں میں ساتھ ہے میرے   خدا اس خاک کے بے در مکاں میں ساتھ ہے میرے
دُکھوں کی زرد شاموں ، درد کی تپتی دوپہروں میں   مرے خالق کی رحمت اس جہاں میں ساتھ ہے میرے

حضورؐ آپ کی رحمت بھری نظر میں رہوں   گماں کے رنگ سے نکلوں، یقیں اثر میں رہوں
فقط ہو نامِ محمدؐ کی آرزو مجھ کو   کسی عذاب سے گزروں کسی بھنور میں رہوں

ہمارے پرچم سربز سی حسین نہیں   کمانِ قوسِ قزح ایسی دلنشین نہیں
مہ و نجوم بھی خورشید ساتھ لے آئیں   مرے وطن کی سی روشن کوئی زمین نہیں

غزل عجب کمال کی صنف سخن ہے کہ جس کی معنوی وسعت۔موضوعی تنوعات اور اظہار و ابلاغ کے دلفریب اُسلوب بے حدو بے شمار ہیں طبع آزمائی کسی بھی شرط سے آزاد اور خوشہ چینی کے امکانات لامحدود۔یہی سبب ہے کہ وہ آفاقیت جو اردو غزل کا نشانِ امتیاز ہے کسی اور صنفِ سخن کو میسر نہیں۔چنانچہ ''سرِ دشتِ گماں'' کے مطالعہ کے بعد محسوس ہوا کہ شاعرہ کو غزل کی نسبت سے ان تمام زاویہ ہائے فکر وفن کا نہ صرف پورا پورا شعور اور ادراک ہے بلکہ وہ اس بحرِ بیکراں کی غواصی میں گہر ہائے آبدار تک رسائی کا ایک خاص سلیقہ رکھتی ہیں جو اُن کے ریاضِ سخن سنجی اور تجربہ ومشاہدہ نیز اردو غزل کے ارتقا پر اُن کے مسلسل ارتکاز نظر کا آئینہ دار ہے۔موصوفہ کی شاعری پر مرحوم احمد ندیم قاسمی صاحب جیسی نابغۂ روزگار ہستی نے جن جچے تلے الفاظ میں اظہار خیال کیا ہے وہ بذاتِ خود ایک سندِ اعتبار سے کم نہیں۔فرماتے ہیں

''عنبرین صلاح الدین کا آغاز ہی بہت حوصلہ افزا ہے ان کی نظمیں اور غزلیں فن شعر کے مطالبات کے عین مطابق ہیں مگر مجھے ان کی منفرد خصوصیت یہ نظر آئی کہ وہ مسائل حیات

کے بارے میں سوچتی ہیں، رُک رُک کر فکر کرتی ہیں اور اپنی اس سوچ اس فکر کو اپنے کلام میں سلیقہ سے سجاتی ہیں۔ عنبریں دونوں اصناف شعر۔۔۔ نظم اور غزل کی شاعرہ ہیں۔ غزل میں انھوں نے اس صنف کی عظیم روایت کو پیش نظر رکھا ہے اور نظم کو عہد جدید کے ادراک اور وژن سے آراستہ کیا ہے مجھے ان کا فنی مستقبل بھرپور محسوس ہو رہا ہے۔''

شاعرہ کا زیر نظر مجموعہ قاسمی صاحب کی درج بالا رائے کے بعد کے کلام پر بھی مشتمل ہے۔ آیئے اسی کو بنیاد بنا کر اُن کی تخلیقات کا جائزہ لیتے ہیں۔ صرف دو شعر جو درج ذیل ہیں اُن کی سنجیدہ سوچ کو ایک نفیس ولطیف پیرایۂ اظہار کا قالب عطا کرنے کی تصدیق کے لئے کافی ہیں۔

فصیلِ ذات پہ مدھم چراغِ غم ہے ابھی	مری نگاہ میں حیرت کا عکس نم ہے ابھی
مرا وجود کئی خواہشوں کی جائے اماں	کبھی رہینِ تمنا، کبھی اسیرِ گماں

مسائل حیات کے حوالے سے شاعرہ کا عصری شعور نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے وہ حالات کی بے رحمی پر کبیدہ خاطر بھی ہیں اور نوحہ کناں بھی۔ ان کی شدتِ احساس کے اس رخ کو ان کے ان اشعار میں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ کون پہنچا اُفق تک شکستہ زینوں سے	جھپٹ رہی ہیں بلائیں کئی، زمینوں سے
خود اپنے ہاتھوں سبھی نے جلا دیئے ہیں گھر	نہ پوچھ حال مرے شہر کے مکینوں سے
زمیں ہے خشک مگر بیکراں سمندر پر	برس رہی ہیں گھٹائیں عجب قرینوں سے

کوئی نہ ظِلّ الٰہی کی بات مانے گا	نہ سر پہ تاج سلامت، نہ تخت باقی ہے

احساس کے اسی رخ کا پرتو اُن کی نظموں میں بھی موجود ہے یعنی بقول قاسمی صاحب انھوں نے نظم کو عہد جدید کے ادراک اور وژن سے آراستہ کیا ہے ان کی ایک قطعہ بند نظم ''اک روز وہ ہوگا'' کا درج ذیل قطعہ ایک خوبصورت مثال ہے:

چاہیں تو سجالیں مجھے نیزے کی انی پر　　لیکن مرے آنکھوں میں بھرے خواب تو دیکھیں

چاہیں تو اسے جلتی چتاؤں میں دھکیلیں　　لیکن مرے شعلے کی تب و تاب تو دیکھیں

اپنی غزل میں عنبرین صلاح الدین نے روایت کی پاسداری ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ غزل کو جدید صوت و آہنگ سے مرصع کر کے دو آتشہ بنا دیا ہے۔ ان کے خیالات کی روانی تھمنے کا نام نہیں لیتی اور وہ بالخصوص داخلی کیفیات کو وہ زبان عطا کرتی ہیں جو شعر کی ہیئت کو درخشاں بنا دیتی ہے۔ تخلیق شعر کا یہ عمل پختہ فنی شعور اور الفاظ کے در و بست پر مکمل گرفت کے بغیر ممکن نہیں۔

دھنک کی ساری چمک بادلوں کے نام ہوئی　　بچی جو ایک کرن راہ میں تمام ہوئی

بہت دنوں کی مسافت کے بعد یاد آیا　　تمہارے شہر سے نکلے ہی تھے کہ شام ہوئی

اُجالے ایسے اُتر آئے ہیں نگاہوں میں　　کہ اس کے بعد سفر میں کبھی نہ شام ہوئی

یہ بام و در بھی مرے ساتھ خواب دیکھیں گے　　تمام رات مرا اضطراب دیکھیں گے

وہ مرحلہ بھی سرِ راہِ عشق آئے گا　　سوال کرنے سے پہلے جواب دیکھیں گے

سحر کے بعد شمارِ نجوم شب ہوگا　　سفر کے بعد سفر کا حساب دیکھیں گے

دھنک کے رنگ میں روشن کئی اشارے ہیں　　ابھی چلو کہ ابھی دور وہ کنارے ہیں

خیال اب بھی کسی خواب کے سفر میں ہے　　نظر میں اب بھی کسی روشنی کے دھارے ہیں

بہت دن بعد آخر مل رہے ہیں　　سرِ مژگاں ستارے کھل رہے ہیں

پرندے، تتلیاں، خوشبو، صبا، گُل　　خزاں کے زخم آخر سِل رہے ہیں

عنبرین نے اپنی شاعری کے لیے زیادہ بحروں کا انتخاب نہیں کیا اور خود کو صرف چند بحروں تک ہی محدود رکھا ہے جن میں اُنھوں نے اپنی توانا فکر۔ حسیت اور حسب ضرورت معروضیت کا بھرپور انداز میں اظہار کیا ہے۔ اُن کی فکر میں 'آمد' کی گُل کاریاں زیادہ لیکن جہاں 'آورد' ہے وہ

بھی اُن کی فنی آگہی اور لفظیات کے انتخاب و استعمال پر قدرت کی آئینہ دار۔ وہ اُسلوب میں بھی تنوع کی طرف مائل نظر آتی ہیں۔ شعر میں نغمگی اور موسیقیت دیکھنا ہو تو دیکھیئے:

ریت پہ تھے موجود تمہارے جانے کے آثار بھی — ساتھ بہا کر لے گئیں لہریں پل میں نقش و نگار بھی

شوق کے جادوگر بستے ہیں دروازوں دہلیزوں میں — رہتی ہیں خوشبو کی پریاں دیواروں کے پار بھی

بات خوشبو کی چلی ہے تو ایک معطر غزل سے اقتباس:

اس برس ہی کوئی پیمان نبھائے خوشبو — اب کے آئے کوئی پیغام سنائے خوشبو

رات پھر یاد کے تارے سرِ افلاک آئے — رات پھر خواب ترے شہر سے لائے خوشبو

خوشبو کی طرح 'خواب' کی علامت کو بھی گوناں گون مضامین سے سجانا شاعرہ کے تخیل و تصور کی رعنائی کا کرشمہ ہے۔

رنگِ رُخ اور ہو گیا یا پھر — آئینے خواب کے اثر میں ہیں

عکس در عکس ڈوبتے منظر — خواب جیسے ہوا کے گھر میں ہیں

طوفانِ بلاخیز کی بے رحم ہیں موجیں — کچھ خواب بھی بہتے ہوئے ڈوبے ہیں بھنور میں

ان الفاظ کی معنویت اور تاثراتی کیفیت کو نت نئے اسالیب میں ڈھالنے کا ہنر بھی شاعرہ کو خوب آتا ہے۔ مثلاً لفظ بھنور ہی کو لیجیے

تاحدِ نظر کتنی صداؤں کے بھنور ہیں — اس گونجتی وادی میں مجھے کس نے پکارا

قدم قدم پہ مری راہ روکتے ہیں بھنور — نہ جانے کون سمندر کے پار رہتا ہے

آخر میں چند ایسی مزید مثالیں بھی جن میں کلاسیکی غزل کی روایات کو جدید غزل کا لب و لہجہ دیا گیا ہے اور یہ عمل شاعرہ کی فنی ہمہ جہتی کا منہ بولتا ثبوت ہے:

اُس کی آنکھوں میں دھڑکتا ہے غضب ایک سوال　　اُس نے باندھا مرے آنچل میں عجب ایک سوال
اس برس بام سے گزرے گا اگر موسمِ گُل　　میں بھی پوچھوں گی بصد عجز و ادب ایک سوال

وقت کی آندھیاں کس سمت اُڑا لے آئیں　　اُس نے دیکھا تھا مجھے میں نے قیامت دیکھی
گونج رہتی ہے در و بام میں تنہائی کی　　کب مرے بعد کسی جشن کی فرصت دیکھی

نگاہ میں کوئی منظر نہیں ٹھہر پاتا　　نظر میں کس کی نظر کا خمار رہتا ہے

ابھی میری نگاہوں میں زمیں کا نقش گہرا ہے　　وگرنہ آسماں کے پار بھی مہتاب ملتے ہیں

اور:

ستارے سُن رہے تھے بات میری　　یونہی مصروف گزری رات میری

کتاب　:　انداز سخن (شعری مجموعہ)

شاعرہ　:　شوکت جہاں شوکت

مُرتّب و ناشر　:　سعود الحق صدیقی، سی ۱۵۱۔ بلاک سی۔ نارتھ ناظم آباد کراچی

مبصر　:　سید منصور عاقل

قیمت　:　سرمۂ مُفتِ نظر ہوں مری قیمت یہ ہے　　کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں اپنا
(غالب)

زیرِ نظر شعری مجموعہ کی شاعرہ کو نہ عروض دانی کا دعویٰ تھا اور نہ سخن وری پر کوئی احساسِ تفاخر۔ اُن کے تقریظ نگار پروفیسر ڈاکٹر آفتاب اصغر، سابق صدر شعبۂ فارسی دانش گاہِ پنجاب لاہور فرماتے ہیں۔

''مرحومہ ایک پردہ دار اور خانہ نشین خاتون ہونے کے باوجود اپنے خاندانی ادبی ماحول کی

بدولت ایک بلند پایہ شاعرہ تھیں''

پروفیسر صاحب مزید فرماتے ہیں:

''اگر انھیں اردو اور حیدرآباد دکن کی اولین اردو شاعرہ ماہ لقا چندا بی بی سے لے کر کراچی میں آباد آج تک کی حیدرآبادی شاعرات کے طویل سلسلہ کی گمشدہ کڑی قرار دیا جائے تو یہ بات بیجا نہ ہوگی۔''

محترمہ شوکت جہاں شوکت کی حیاتِ مستعار بیسویں صدی کی کم و بیش نو دہائیوں پر مشتمل تھی۔ ان کی ولادت سہارنپور۔ یوپی (انڈیا) میں ۴ اپریل ۱۹۰۴ء۔ طویل قیام حیدرآباد (دکن) میں اور ہجرت کے بعد انتقال ۲۳ جون ۱۹۹۴ء کو کراچی میں ہوا۔ اُن کے والد گرامی قاضی شمس الحق ایک کہنہ مشق اور نامور شاعر تھے اور اپنے وقت کی ادبی محفلوں بالخصوص دہلی اور جے پور کے مشاعروں میں اُنھیں اہم مقام و مرتبہ حاصل تھا۔ چنانچہ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ 'انداز سخن' کی شاعرہ کی ادبی تربیت ونشوونما میں ماحول کی اثر پذیری کو بڑا دخل حاصل تھا جسے مزید مہمیز شادی کے بعد حیدرآباد دکن کے طویل قیام سے بھی ملی کیونکہ بقول پروفیسر ڈاکٹر آفتاب اصغر

''دبستانِ دہلی اور دبستان لکھنؤ کے بعد دبستانِ حیدرآباد معرض وجود میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلامی تہذیب وثقافت اور علوم وادبیات کا گہوارہ بن گیا''

زیرِ نظر شاعری کے اِس سیاق وسباق سے آگہی کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ کسی بھی تجزیہ نگار کے لیے محاسن ومعائبِ سخن کا جائزہ لینا کس قدر دشوار کام ہے لیکن اس مرحلہ پر برادر محترم پروفیسر سحر انصاری کا مشورہ رہنما ثابت ہوا جو خود ایک صاحب بصیرت نقاد اور بلند مرتبہ شاعر ہیں کہ:

''اُن کے کلام کو فنی، عروضی اور ہنرمندی کے پیمانے پر جانچنے کی بجائے ایک خاتون کے مخلصانہ جذبات اور شدّتِ خیالات کے ایک گل دستے کے طور پر دیکھنا چاہیئے''

چنانچہ سرسری مطالعہ کے دوران ہی بعض اشعار کی ''سادگی و پُرکاری'' نے ''بیخودی وہشیاری'' کی ملی جلی کیفیات سے دوچار کر دیا جن کے نتیجے میں شاعرہ کے اندازِ سخن نے یہ حقیقت واضح کر دی

کہ شعر کا تخلیقی عمل جس قدر ''فیضانِ نظر'' کا مرہونِ منت ہے اتنا ''مکتب کی کرامت'' کا نہیں ملاحظہ فرمایئے:

مل کے احباب بچھڑ جاتے ہیں خوابوں کی طرح ٹوٹ جاتے ہیں یہ رشتے سبھی دھاگوں کی طرح

اک دریا ہے عرفاں کا، قطرہ نظر آتا ہے اک صحرا ہے پوشیدہ، ذرہ نظر آتا ہے

ہیں شمس و مہ و انجم مظہر تری قدرت کے گلشن میں ترا ہر سُو جلوہ نظر آتا ہے

فنا کے بعد ہم سے بے کسوں کو کون پوچھے گا مگر اے بے کسی رویا کرے گی ہم کو تو برسوں

متاعِ زیست ہے شوکت فسانۂ ماضی نہ فکر حال ہے مجھ کو نہ فکر مستقبل

اہلِ ذوق قارئین کی ضیافتِ فکر کے لیے مندرجہ بالا اشعار میں جہاں حُسنِ اُسلوب اور منفرد اندازِ سخن کے نادر زاویے موجود ہیں وہیں رمزیت اور اشاریت کے ''نادانستہ'' محاسن بھی شاعرہ کا ادبی ورثہ بن کر سامنے آئے ہیں۔۔۔ یہی نہیں بلکہ اساتذہ سخن نے جہاں ''قطرہ میں دجلہ اور جزو میں کُل'' دکھائی نہ دینے کو ''بچوں کا کھیل قرار دیا ہے شاعرہ نے وہی مضمون متضاد سمت میں ڈھال کر ''قطرہ'' کو ''عرفان کے دریا'' کا مظہر اور ''ذرہ میں صحرا'' پوشیدہ قرار دیا ہے اس لطیف و دلکش ایمائیت کے فطری اُسلوب پر شاعرہ داد کی مستحق ہیں۔ شعراء نے جہاں ''یادِ ماضی کو عذاب'' ٹھہرایا ہے یا ماضی کو یہ کہہ کر کہ ''دھرا کیا ہے بھلا عہد کہن کی داستانوں میں'' ماضی پرستی سے پرہیز پر زور دیا ہے وہاں محترمہ شوکت جہاں شوکت کی کا تخلیقی حوصلہ دیکھیے کہ اُنھوں نے اسی مضمون کے برعکس ''فسانۂ ماضی'' کو ''متاعِ زیست'' قرار دے کر ''فکر حال اور فکر مستقبل'' سے آزاد ہو جانے کی نادرہ کاری کا ثبوت دیا ہے۔ یہ شعر بھی توجہ طلب ہے کہ عام روش سے ہٹ کر شاعرہ نے شمع کے لیے محرومئی سحر کو شوئی قسمت ٹھہرایا ہے۔

شمع کی زندگی ہے بس اک شب اُس کی تقدیر میں سحر نہ ہوئی

ایک خاص پہلو جو 'اندازِ سخن' میں نمایاں ہے وہ شاعرہ کا ذہنی شعور ہے جس کی جھلکیاں کلام میں جا بجا نظر آتی ہیں اور اس طرح کہ آیات قرآنی کو اشعار میں نہایت خوبصورتی سے ڈھالا گیا ہے یہ بھی اُن کا خاندانی ورثہ ہے:

دونوں عالم کا خالق ہے لاریب تُو مالک الملک لاشریک لہٗ
خوفِ عصیاں سے ترساں و لرزاں ہوں میں تیرا فرمان لیکن ہے لاتقنطو

دعا ہے ربنا فغفرلنا ورحمنا شوکت گناہوں کا ہم اپنے ہر گھڑی اقرار کرتے ہیں

غزل، قصیدہ اور قطعات جیسی اصناف سخن کے ساتھ ساتھ حمد و نعت کے اشعار بھی 'اندازِ سخن' کی زینت ہیں۔ تبرکاً چند شعر ملاحظہ ہوں جو شاعرہ کے عجز و نیاز اور خضوع و خشوع کے آئینہ دار ہیں

الٰہی میرے مقدر میں یہ سعادت ہو مری ہو خانۂ کعبہ میں سجدہ ریز جبیں
تجھی سے طالبِ بخشش ہے شوکتِ عاصی کہ تجھ سا کوئی بھی رحمان اور رحیم نہیں

الٰہی پھر مدینے کا سفر ہو وہ نورانی سماں پیشِ نظر ہو
کروں میں پھر نثار اشکوں کے موتی مرے آنسو کا ہر قطرہ گہر ہو
وہی پھر بے خودی ہو مجھ پر طاری نہ دنیا کی مجھے پھر کچھ خبر ہو
اُنہیںؐ دینا سلاموں کا یہ تحفہ صبا جب تیرا بطحا سے گزر ہو

غالب سے پہلے سہرا نگاری کا ذکر اردو شاعری میں شاید کم ہی نظر آئے جب کہ مسلماں شعراء نے بعد میں اس قدر طبع آزمائی کی کہ سہرا نگاری کو صنفِ سخن کے مقام تک پہنچا دیا گیا غیر مسلم شعراء کے ہاں یہ روایت بوجوہ موجود نہیں۔ جیسا کہ کہا گیا کہ محترمہ شوکت جہاں کا قیام شادی کے بعد ایک طویل مدت تک ریاست حیدر آباد دکن میں رہا جو مسلم ہندو مخلوط معاشرہ پر مشتمل تھی۔ اس لیے ازرہِ رواداری اور خاندانی مراسم کے پیشِ نظر ڈاکٹر کرنل این واگھرے پرنسپل میڈیکل آفیسر

(ملٹری) کی دختر دیا دیوی کی شادی پر سہرا لکھا قطع نظر اس کے کہ عموماً سہرا دلہا کے لیے لکھا جاتا ہے اور دلہن کی نسبت سے رخصتی۔ تاہم یہ سہرا مخصوص اہمیت کا حامل ہے۔ جب کہ اہلِ ہنود میں ایسا کوئی رواج نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اولاً محترمہ شوکت کو اردو شاعری کی تاریخ میں پہلی بار 'ہندو سہرا' لکھنے کا اعزاز حاصل ہوا اور ثانیاً ہندی الفاظ وتراکیب پر مشتمل سہرے کو ایک نئے آہنگ واسلوب سے مرصع کیا جس کے لیئے سہرا نگار داد وتحسین کی مستحق ہیں۔ چند شعر:

کیوں نہ ہو دوسرے سہروں سے نرالا سہرا — کہ ہے بھگوان کی کرپا کا اُجالا سہرا
ہے مدن لال جو دلہا تو دیا دیوی دلہن — رُخ پہ دنوں کے ہے ایک ایک نرالا سہرا
گرچہ واقف نہیں کچھ شعر وسخن سے شوکت — لیکن اخلاص کے سانچے میں ہے ڈھالا سہرا

ایک اور سہرا بھی مجموعہ میں شامل ہے جو غالب کی زمین میں ہے غالب کا مقطع یہ ہے

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں _____ دیکھیں کہہ دے کوئی اس سہرے سے بڑھ کر سہرا

اس مقطع کو استادِ شہ (بہادر شاہ ظفر) شیخ محمد ابراہیم ذوق نے خود پر چھپتی سمجھ کر سخت بُرا منایا اور بادشاہ سے شکایت کی چنانچہ "تلافیِ مافات" کے طور پر بارہ اشعار پر مشتمل قطعہ کہا اور اس طرح 'معذرت' پیش کی

استادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال — یہ تاب یہ مجال یہ طاقت نہیں مجھے
جامِ جہاں نما ہے شہنشاہ کا ضمیر — سوگند اور گواہ کی حاجت نہیں مجھے
سہرا لکھا گیا زرہِ امتثال امر — دیکھا کہ چارہ غیر اطاعت نہیں مجھے
مقطع میں آ پڑی ہے سخن گسترانہ بات — مقصود اس سے قطع محبت نہیں مجھے
روئے سخن کسی کی طرف ہو تو روسیاہ — سودا نہیں جنوں نہیں وحشت نہیں مجھے
قسمت بُری سہی پہ طبیعت بُری نہیں — ہے شکر کی یہ جا کہ شکایت نہیں مجھے

اس تاریخی پس منظر کے ساتھ اپنے بھائی انعام الحق کے لیے محترمہ شوکت جہاں نے جو سہرا

لکھا اُس نے کے چند اشعار:

ماہ و خورشید کی کرنوں کا ہے ہمسر سہرا	رُخِ روشن پہ ہے اک نور کی چادر سہرا
اس مسرت میں کھلی جاتی ہیں ساری کلیاں	حسن کے آج مقابل ہوئیں بن کر سہرا
لاکھوں پُرشوق نگاہوں کا بنا ہے مرکز	ناز کرتا ہے بجا اپنی پھبن پر سہرا
شاعری گرچہ نہیں کہتے ہیں اس کو پھر بھی	اپنا دل خوش کیا شوکت نے یہ لکھ کر سہرا

دونوں سہروں کے مقطعے اس لئے توجہ طلب ہیں کہ شاعرہ نے نہایت اخلاص نیت کے ساتھ اظہارِ عجز کیا ہے۔ جس کا مزید اظہار جا بجا اُن کے کلام میں ملتا ہے۔ دونوں سہروں کے اشعار اُن کی خداداد صلاحیتوں کے مظہر اور ادبی ماحول میں تربیت و پرورش کا عطیہ ہیں۔ ان کی شاعری جہاں حقیقتوں کے برملا اعتراف سے مملو ہے وہیں اس میں اُن کی حساس طبیعت نعمتوں پر تشکر و ممنونیت کے تہذیبی تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہے۔ سقوطِ حیدرآباد ان کے لیے ایک جاں گُسل صدمہ تھا جس کا بین السطور اظہار اُن کے کلام میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مثلاً

نامہرباں ہوا ہے جبؔ پاسباں ہمارا	کیونکر رہے چمن میں اب آشیاں ہمارا
وہ یارِ غار اپنے وہ غم گسار اپنے	گِن گِن کے لے رہے ہیں اب امتحاں ہمارا

نواب عثمان علی خاں آصف جاہ کی مدح پر مشتمل اشعار شاعرہ کے اظہارِ ممنونیت اور خراجِ عقیدت کا شاہکار ہیں:

ہند کے اے گوہرِ یکتا وطن کے تاجدار	عالمِ اسلام کے اے مایۂ صد افتخار
اے غریبوں کے سہارے غمگسارِ بیکساں	چارہ سازِ دردِ دل اے چارۂ بیچارگاں
مہر و مہ سے یہ جہاں جب تک درخشندہ رہے	آفتابِ دولت و اقبال تابندہ رہے

ہجرت کے بعد کی شاعری جسے 'دبستان کراچی' کا فیضان کہا جا سکتا ہے اُس نے انھیں ماضی

کی داستانیں دہرانے پر مجبور کر دیا اور حزن و یاس اُن کے بعد کے کلام میں اُن کے حُسن اُسلوب پر چھا گئے:

یاد آتے ہیں کبھی اب جو زمانے اپنے ایسا لگتا ہے کہ ہیں خواب سہانے اپنے
اب بھی احساس گلستان میں کبھی ہوتا ہے جیسے ہر گُل کی زباں پر ہیں فسانے اپنے

بتائیں کیا کہ کس حالم میں اپنے دن گزرتے ہیں یونہی بس سانس لیتے ہیں نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں

باغ دنیا میں نہ پائی کبھی راحت شوکت گردشِ چرخ نے بھی چین سے رہنے نہ دیا

کتاب : آئینے میں گلاب (شاعری)

شاعرہ : اسماء شاہ سلمیٰ

مبصر : سید منصور عاقل

ناشر : سید ذاکر شاہ بخاری

قیمت : ۲۲۵ روپے

''آئینے میں گلاب'' کی تلاش نے اسلام آباد کی شاعرہ محترمہ اسماء شاہ سلمیٰ کی شاعری سے متعارف ہونے کا موقع فراہم کیا جس کے دوران جذبات و خیالات کی متحرک اور مُشکبار پرچھائیاں دیکھنا نصیب ہوئیں اور یہ یقین مستحکم ہوا کہ شعر گوئی کی صلاحیت فکر ہر نوع کی اجارہ داری سے ماورا ہے۔ فنِ شعر اکتسابی بھی ہے اور فطری صلاحیت کا عطیہ بھی۔ بالخصوص غزل ایک ایسی صنف سخن ہے جو فکری آفاقیت پر بھی قادر ہے اور جذبہ و احساس کی بوقلمونی کی آئینہ دار بھی ہے۔ البتہ اُسلوب (Diction) کی ندرت اور اثر پذیری صاحب شعر کو تشخص یا شناخت عطا کرتے ہیں چنانچہ جب درج ذیل اشعار میری نظر سے گزرے تو نہ صرف شاعرہ کی طہارتِ فکر بلکہ حسنِ

اُسلوب نے چونکا دیا:

جاہ وحشمت حسن وثروت سب خدا کی دین ہے　　کس لیے ان نعمتوں پر اتنے اتراتے ہیں لوگ
خوبصورت کس قدر ہیں ان کے شیلے دیکھئے　　آنکھ کے رستے سے جو دل میں سماجاتے ہیں لوگ

کانٹوں کی سیج ہے یہ کوئی زندگی نہیں　　جو پھر بھی جی رہے ہیں یہ اُن کا کمال ہے

ان چاہتوں کی اور سزائیں ہمیں نہ دو　　اب روز زندگی کی دعائیں ہمیں نہ دو
مانگی ہوئی کوئی بھی نہ تو قیر لیں گے ہم　　چھینی ہوئی سروں سے ردائیں ہمیں نہ دو

زیرِ نظر شعری مجموعہ کی شاعرہ کا حُسنِ اُسلوب جہاں اُن کی پہچان متعین کرتا ہے وہیں اُن کے شعور وادراک اور فکر ونظر کی تنوعاتی توانائی کا مظہر ہے وہ شعری معنویت کو مختلف سانچوں میں ڈھالنے کا سلیقہ بھی رکھتی ہیں۔ مثلاً

وہ اک آنسو جو تیری یاد میں ٹپکا ہے پلکوں سے　　یہی آنسو تو میری زندگی بھر کی کمائی ہے

سرخ آنکھوں میں مچلتے ہوئے جو آنسو ہیں　　جیسے شبنم ہو دہکتے ہوئے انگاروں میں

دوسرے شعر میں خوبصورت تشبیہی انداز اختیار کرتے ہوئے ایک ہی کیفیت کو نئے پیرایۂ اظہار میں پیش کر دیا ہے۔ اس کو اگر عمیق فنی شعور سے بھی تعبیر کیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اسی طرح تلمیحی انداز اختیار کر کے شعر کے مفہوم کو جلا بخش دینے کی صلاحیت کا اندازہ غزل ہی کے درج ذیل شعر سے کیا جا سکتا ہے جو شاعرہ کے بحیثیت خاتون عرفانِ ذات کا بھی ایک وسیع المعانی حوالہ ہے:

اک شہنشاہ ہی بدنام ہوا ہے ورنہ　　سارے چنتے رہے عورت ہی کو دیواروں میں

اسماء شاہ سلمیٰ کا کلام جدت و روایت کا امتزاج ہے وہ غزل کے تہذیبی و ثقافتی ارتقاء کا گہرا شعور رکھتی ہیں۔ اور لطافتِ فکر کو غزل کا بنیادی عنصر سمجھتی ہیں۔ موضوعاتِ غزل کو مسلسل وسعت

دیتے رہنا ان کا شاعرانہ مسلک ہے لیکن انھیں غزل میں لطافت وطہارت پر سمجھوتہ کسی شکل میں منظور نہیں ان کا ذہن اسالیب کے نت نئے پیکر تراشنے پر قادر ہے۔ چند مثالیں:

ترے حوالے سے کتنے ہی خواب دیکھے ہیں خزاں کی رُت میں بھی کھلتے گلاب دیکھے ہیں
کسی کو ہنستے جو دیکھا تو رُو پڑی سلمیٰ کہ ان نگاہوں نے ڈھلتے شباب دیکھے ہیں

ترے در سے جو ہوآتی کہیں پر صبا کے پاؤں کب ٹکتے زمیں پر
جھکاؤں سر تمہارے در پہ ایسے نشانِ بندگی چمکے جبیں پر

جب ترکِ تعلق کی میں سرحد پہ کھڑی تھی دو پل کی گھڑی بھی وہ قیامت کی گھڑی تھی

ہزار بار تجھے بھولنے کا عہد کیا ہر ایک بار تجھے دھڑکنوں میں پایا ہے

گر مجھے میسر ہوایک دن کی سلطانی خود کو بے وفا کر کے اُس کو باوفا کر دوں

نوجوان ہی نہیں بلکہ بعض معاصر سینئر شعرا میں بھی نام نہاد جدیدیت کا جنون پایا جاتا ہے جس کے نتیجہ میں غزل کی صورت وسیرت ایسے ہنر باختہ لوگوں کے ہاتھوں بُری طرح مجروح ہوئی ہے۔ لطافتِ فکر کا جو غزل کی محبوبیت کی ضامن ہے بڑی سفاکی سے خون کیا گیا ہے لیکن یہ قلم بگوش طائفہ اُس غزل کا بال بھی بیکانہ کر کر سکے گا جو قرنوں سے حسنِ اُسلوب وافکار کی گود میں پروان چڑھی ہے جس کے سبب ایک عظیم الشان الفاظ وتراکیب کا گنج گراں مایہ وجود میں آچکا ہے۔ تشبیہ و استعارہ کا جلال و جمال تلمیحات کی معارف پروری اور محاکاتِ شعری سے مرصّع ہی نہیں مسلّح غزل اپنی موضوعاتی ہمہ گیریت کے طفیل آنے والے ہر دور پر اپنی ابدیت کا نقش ثبت کرتی رہے گی ''آئینہ میں گلاب'' کی شاعرہ کے کلام میں روایت اور جدت کے درمیان اعتدال وتوازن کا رجحان نمایاں ہے۔ مثلاً:

آ یاد دلاؤں تجھے ماضی کے فسانے   اک بند گلی میں مرا ٹوٹا ہوا گھر تھا
سوکھے ہوئے پتوں پہ ذرا دھیان سے رکھ پاؤں   جو ٹوٹ کے بکھرا مرے آنگن کا شجر تھا

شاعرہ کے مختصر سے اِس مجموعۂ کلام میں جو ستر بہتر غزلوں پر مشتمل ہے ایک توانا تر رجحان جو نظر آتا ہے وہ عالمگیر صداقتوں اور عمرانی حقیقتوں کی معنویت کا شعور ہے جسے سادہ مگر اثر انگیز اُسلوب کا جامہ پہنایا گیا ہے۔ کلام میں یہ واضح عنصر ایک روشن مستقبل کی گواہی دے رہا ہے میری دعا ہے کہ آنے والا وقت اُنھیں اُس طائفۂ گمرہاں سے محفوظ رکھے جو شہرت و رسوائی کے درمیان حدفاصل قائم کرنے کی توفیق سے محروم نظر آتے ہیں۔ اس تناظر میں سلمٰی کے کچھ اشعار ایسے بھی نظر سے گزرے جن کا حوالہ دینا ضروری ہے۔

دل درد سے خالی ہو تو کیا شخص ہے وہ بھی   کہنے کو تو انسان ہے انسان نہیں ہے

کہنا ہی اس قدر ہے ترے کبر و ناز سے   انساں بلند ہوتا ہے عجز و نیاز سے

یہاں خوشی و غمی ساتھ ساتھ رہتے ہیں   یہی خزاں ہے یہی ہے بہار کی دنیا

حرف آخر سے پہلے عہد حاضر میں شعری مجموعوں کی اشاعت کے سیلِ بیکراں میں طباعت و کتابت (کمپوزنگ) نے جو قیامتیں ڈھائی ہیں وہ صرف املا و انشاء کے تسامحات ہی تک محدود نہیں ہیں بلکہ ان میں بحور و قوانی کے قتل عام کے سانحات بھی شامل ہیں ہوسکتا ہے کہ بعض ''صاحبانِ دیوان'' کے سروں کو چھوئے بغیر یہ سیلاب گزر گیا ہو اور اُنھیں ''صاحب دیوان'' بن جانے کی سرمستی میں اس کا احساس تک نہ ہوا ہو لیکن ایسے شعراء و شاعرات جن کے کلام کو مروجہ اصنافِ سخن میں قابلِ قدر اضافہ کہا جا سکے اُنھیں اس باب میں زیادہ سنجیدگی اور احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ زیرِ نظر مجموعہ کی خوش فکر و باصلاحیت شاعرہ کو بھی میرا مشورہ یہی ہے کہ آئندہ اشاعتوں میں اِس پہلو پر

زیادہ سے زیادہ توجہ دیں کہ اُن کی تخلیقی کاوشیں اپنے جملہ محاسن کے ساتھ ادبی تاریخ کا حصہ بن سکیں۔ اور اب حرفِ آخر کے طور پر اُن کی منفرد فکر کا ترجمان ایک شعر:

یہ حسن و عشق دولت و عسرت کی جنگ ہے ہوتی ہے کس کو فتح کسے دیکھیئے شکست

مراسلات

(۱) بیرسٹر سلیم قریشی۔ لندن

الاقرباء کا شمارہ (سالنامہ) ملا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ سالنامہ کو شمارے کے بجائے میگزین کہنا زیادہ مناسب ہوگا میگزین عربی لفظ مخازن سے لیا گیا ہے جس کے معنی خزانے کے ہیں۔ یہ سالنامہ علم و ادب کا ایک خزانہ ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ہیرے جواہرات کی ایک کان الاقرباء میں لکھنے والے دانشوروں کی دسترس میں ہے جہاں سے یہ جواہرات لے کر الاقرباء کے دامن میں ڈالتے ہیں اور ایک اچھے جوہری کی طرح الاقرباء کے صفحات پر ٹانک دیتے ہیں جس سے قارئین کے دل و دماغ روشن ہو جاتے ہیں۔

گلشنِ اُردو کی آبیاری میں آپ کی کاوشیں بقول حفیظ جالندھری 'نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں'۔ آپ کا مقالۂ اِفتتاحیہ: ''لسانی مباحث اور مادری زبان۔ چند توجہ طلب حقائق'' اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ اس میں آپ نے اردو کی اچھی نمایندگی کی ہے پروفیسر اویس جعفری صاحب سیاٹل (امریکہ) میں بیٹھے ہوئے قارئین کو دنیا بھر کی سیر کراتے ہیں۔ اس دفعہ وہ ہمیں عظیم ترک صوفی شاعر یونس اُمرے کے آستانے تک لے گئے۔ طویل اور دلچسپ مضمون میں جعفری صاحب نے عظیم صوفی شاعر کی زندگی اور اُن کے صوفیانہ کلام سے روشناس کرایا۔

میگزین کے حصّہ نظم میں جعفری صاحب نے حمدیہ و نعتیہ نظم ''گریۂ شبنم'' میں یونس اُمرے کے صوفیانہ خیالات کو اپنی فنّی مہارت سے اردو میں ڈھالا ہے۔ سیّدہ نغمہ زیدی کا مضمون ''اقبال اور اتحادِ بین المسلمین'' وقت کی پکار ہے۔ محترمہ کا اقبال پر گہرا مطالعہ ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے اتحاد بین المسلمین کے حوالے سے اقبال کا پیغام بڑے سلیقے سے واضح طور پر قارئین تک پہنچایا ہے۔ سید انتخاب علی کمال کا ''ترجمہ رموزِ بے خودی'' علامہ کے فارسی کلام کو اردو داں قارئین تک پہنچانے کی کامیاب کوشش ہے۔ سید صاحب یہ سلسلہ جاری رکھیں تو فارسی ناآشنا لوگوں کو بہت

فائدہ ہوگا۔ 'یادِ رفتگاں' میں جناب محمد رضا انصاری کی تحریر ''یگانہ سے متعلق کچھ یادیں'' اور جناب شاکر کنڈان کی ''شاعرِ شباب۔ الطاف مشہدی'' پرطویل مگر دلچسپ تحریر میں اِن دونوں کی زندگی کے نشیب وفراز کا بڑے سلیقے سے جائزہ لیا گیا ہے۔

علامہ اقبال نے شاعری کو پیغام رسانی کے ذریعہ کے طور پر استعمال کیا۔ بعد میں آنے والے شعرا نے بھی شاعری کو سیاسی پیغام رسانی کے لیے استعمال کیا جناب قدرت اللہ شہزاد نے اسی حوالے سے ''علی احمد رفعت کی غزل میں سیاسی عنصر'' کے موضوع پر لکھا ہے۔ میرے بہاولپور کے قیام کے دوران رفعت صاحب سے سلام دعا تھی اور موصوف بڑے وضع دار اور ملنسار تھے۔ جناب سرور عالم راز سرور کی تحریر ''اردو زبان کے تابعات'' دلچسپ اور معلومات افزا تحریر ہے۔ حصہ نظم میں جناب سحر انصاری کا ''لکھنا پڑھنا'' دلخراش ضرور ہے لیکن اس میں حالاتِ حاضرہ کی بھرپور عکاسی ہے۔

جناب شفق ہاشمی کا سورہ رحمٰن کا منظوم ترجمہ خاصا ہے۔ صرف دو مقامات پر جناب شفق ہاشمی نے روایتی ترجمہ کو اپنایا ہے۔ ''تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!'' فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ اٰلَآءِ کے معنی روایتی ترجمہ میں نعمت کے لیے گئے ہیں۔ آیہ ۴۵۔۴۶ کا ترجمہ: 'جسے ہو خوف پیشی کا حضورِ بارگاہِ رب تو اُس کے واسطے دو جنتیں ہوں گی! تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!'، یہاں تو اٰلَآءِ کا ترجمہ نعمت ٹھیک لگتا ہے لیکن آیہ ۴۳۔۴۴ ''یہی ہے وہ جہنم مجرموں نے جس کو جھٹلایا تھا (دنیا میں) رہیں گے نارِ دوزخ، کھولتے پانی کے مابین اب وہ گردش میں تو جھٹلاؤ گے اپنے رب کی کن کن نعمتوں کو تم!'' یہاں اٰلَآءِ کا ترجمہ نعمت ٹھیک نہیں لگتا۔ عربی میں ایک لفظ کے دو یا دو سے زیادہ معنی بھی ہوتے ہیں۔ معروف عربی اسکالر ابنِ جریر☆ نے اٰلَآءِ کا ترجمہ قدرت کیا ہے یہ ترجمہ دونوں آیتوں کے ساتھ ٹھیک لگتا ہے۔ اِسی طرح آیہ ۳۳ کا ترجمہ مولانا فتح محمد خاں جالندھری 'اَلقراٰن الحکیم' (تاج کمپنی لاہور۔ کراچی) میں یوں کرتے ہیں

☆ ابنِ جریر اوران کے ترجمہ کا ذکر مولانا شبیر احمد عثمانی نے 'تفسیر عثمانی' میں کیا ہے

''اے گروہِ جن وانس اگر تمہیں قدرت ہو کہ آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ اور زور کے سوا تو تم نکل ہی نہیں سکتے (یعنی زور کے ساتھ نکل سکتے ہو)

ڈاکٹر مورس بکالے (Dr Mauric Bucaiue) نے بھی اپنی تصنیف 'دی بائیبل دی قرآن اینڈ سائنس' میں سلطان کا ترجمہ پاور یعنی زور ہی کیا ہے (اتھارٹی یا مرضیہ نہیں کیا) ڈاکٹر بکالے نے جو کنگ فیصل کے معالج تھے کنگ فیصل کے کہنے پر عربی سیکھ کر قرآن کا مطالعہ کیا کہتے ہیں کہ لَا تَنفُذُونَ کا مطلب قطعی نہیں جاسکتے نہیں بلکہ کسی کنڈیشن کے پورا کرنے پر جاسکتے ہیں۔یعنی اتنی قوت یا پاور حاصل کرلو کہ زمیں کی کششِ ثقل کو توڑ دو تو جاسکتے ہو آیہ ۳۵ ''تم پر آگ کے شعلے اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا تو پھر تم مقابلہ نہ کرسکو گے'' ڈاکٹر بکالے کے نزدیک یہ سزا کے طور پر نہیں ہوگا بلکہ خبر دار کرنا ہے (warning) کہ جو پاور زمیں کی کششِ ثقل کو توڑنے کے لیے عمل پیرا ہوگی اُس کی رگڑ (fricton) سے اس قدر حرارت پیدا ہوگی کہ اُس سے شعلے نکلیں گے جو تانبہ کو بھی پگلا دینگے پھر تم مقابلہ نہیں کرسکو گے۔

قرآن میں دو طرح کے بیان ملتے ہیں۔ایک بنیادی باتیں جن میں کسی قسم کا ابہام نہیں دوسری متشابہات جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ کہتا ہے ''یہاں عقلمندوں کے لیے اشارے ہیں'' متشابہات کے ترجمہ میں غلطی ہوسکتی ہے کیونکہ یہ ترجمہ کرنے والے کی فہم پر منحصر ہے۔ڈاکٹر بکالے کہتے ہیں کہ جن اُمور کا چودہ سو سال قبل قرآن میں ذکر کیا گیا ہے چودہ سو سال بعد سائنس اپنے تجربات اور مشاہدات کے بعد اُس کی تصدیق کررہی ہے قرآنی ارشادات اور سائنس کے تجربات اور مشاہدات میں کوئی تصادم نہیں بلکہ سائنس اِس بات کی تصدیق کررہی ہے کہ اس کائنات کی جس نے تخلیق کی ہے اُسی نے قرآن نازل کیا ہے۔مراسلہ کچھ طویل ہوگیا ہے میں اسے یہیں پر ختم کرتا ہوں

☆☆ جناب ہاشمی نے 'لاتنفذون' کا ترجمہ کیا ہے لیکن 'الا بسلطٰن' کو چھوڑ دیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر محمد زاہد۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ (انڈیا)

اللہ کے فضل سے میں خیریت سے ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ بھی بخیر وعافیت ہوں گے
جناب! آپ کا ارسال کردہ رسالہ ''الاقربا'' شمارہ جنوری۔ مارچ اپریل۔ جون ۲۰۱۴ء موصول ہوا۔ اس رسالہ کے تمام مشمولات لائق توجہ ہیں۔ بالخصوص اس کا اداریہ جو کہ لسانی مباحث اور مادری زبان سے متعلق ہے۔ وہ تمام زبانیں جو تقریباً معدوم ہوگئی ہیں ان کے متعلق ادارے کی رائے سے مکمل اتفاق رکھتے ہیں اور یہ طے شدہ ہے کہ ''تحریری و دستاویزی تحفظ سے محروم ان زبانوں کے معدوم ہو جانے کے نتیجہ میں عالم انسانیت نہ صرف تہذیبی وثقافتی ورثہ سے محروم رہ جائے گا بلکہ ان مقامی زبانوں سے وابستہ آبائی معلومات سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا اس لیے زبانوں کو زندہ رکھنے اور ان کے فروغ کے لیے ہمیں وہ تمام کوششیں کرنی چاہئیں جو ہم سے ممکن ہوسکے۔ اور اس سلسلے میں حکومت کو بھی عملی اقدامات کرنے چاہئیں۔

اداریہ کے علاوہ جناب اویس جعفری کا مضمون ''یونس امرے، عظیم ترک صوفی شاعر'' ہمیں پہلی بار ایک ترک صوفی شاعر سے آشنا کراتا ہے۔ یہ تحقیق لائق تحسین ہے۔ جس طرح سے چند صفحات میں اس عظیم شاعر کی حیات اور اس کی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے اور اس کے کلام سے مثالیں پیش کر کے دوسرے بڑے شعرا سے اس کا تقابل اور موازنہ کیا گیا ہے وہ قابل تعریف ہے۔ یونس امرے کے کلام کا کوئی نمونہ اس سے قبل ہماری نظر سے نہیں گزرا۔ لیکن جناب اویس جعفری کے اس مضمون میں ان کے اشعار پیش کیے گئے ہیں اور ان کے متعلق جعفری صاحب کی جو رائے ہے کہ ''ترکی کا کوئی بھی شاعر آج تک ایسی سادہ و پُرکار، محاورہ بندی اور روزمرہ کی دلنشیں زبان میں شعر نہیں کہہ سکا، بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ اس مضمون سے ہمیں پہلی بار یہ بھی معلوم ہوا کہ ترکی کا یہ گمنام باشندہ نہ صرف ایک بڑا شاعر بلکہ اعلیٰ پایہ کا صوفی تھا۔ اس تحقیق کے لیے جعفری صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔

اس کے علاوہ یگانہ سے متعلق محمد رضا انصاری کا مضمون بھی لائق تحسین ہے میری طرف سے مبارک باد۔ ایک مضمون بعنوان ''سردار جعفری کی غزلیہ شاعری'' ارسال کر رہا ہوں۔

(۴) قاضی محمد بشیر۔ لاہور

آپ کا عطیہ سالنامہ ''الاقرباء'' ۲۰۱۴ ملا۔ مجھے اس حلقہ قربت داری میں شمولیت پر بہت فخر ہے۔ بے حد شکریہ۔ اللہ آپ کو آپ کے مجلّہ اور اس کے اہلِ قلم کو عمر جاوداں عطا فرمائے اور مجھ پر آپ کی یہ عنایت تاابد جاری رہے۔

میں نے سالنامہ کو صفحہ نمبر ا سے لے کر ''گھریلو چٹکلے'' تک لفظ بلفظ پڑھا، سبحان اللہ ایک خزینہ علم وادب ہے اور نثر و نظم ادب عالیہ کے مظہر۔ مراسلات بھی بہت شوق سے پڑھے اس لیئے کہ ہر مراسلہ، مراسلہ نگار کی شخصیت اور اس کے ادبی ذوق کا آئینہ دار ہے اور یوں مجھے آپ کی محفل کے اہل قلم سے ملاقات کی سعادت بھی میسر آ گئی جو الاقربا کے حسنِ توسط کے بغیر ناممکن تھی۔ آج کل کے حالات میں اس قدر معیاری رسالہ شائع کرنا اور اس کے معیار کو برقرار رکھنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ آپ کا اداریہ قومی سطح پر قومی زبان سے جس ناروا سلوک کا شکوہ کر رہا ہے وہ ہم پر مسلط خواجگان کی ذہنی پس ماندگی اور دیوالیہ پن کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ اللہ انھیں بصارت اور بصیرت عطا فرمائے۔ لسانی مباحث اور مادری زبان (مقالہ افتتاحیہ) پڑھا تو یقین کیجئے بے حد صدمہ ہوا۔

رسالہ میں مندرجات نہایت عرق ریزی اور کمال تحقیق سے لکھے گئے ہیں۔ فرانسس ڈی پزی شت اردو ادب کی خدمات کے سلسلہ میں بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں اور رلف رسل پر ان کا مقالہ کمال محنت سے ترجمہ کیا ہے میں نے چونکہ الاقربا کا اکثر انٹرنیٹ پر مطالعہ کیا ہے اس لیے اس کے ظاہری حسن و جاذبیت کی دید سے محروم رہا۔ سرورق پر عظیم صوفی ترک شاعر ''یونس ایمرے'' کی تصویر اور اس پر محمد اویس جعفری صاحب کا ۱۸ صفحات پر مشتمل مضمون پڑھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی اپنے کسی گہرے دوست کے متعلق ڈرائینگ روم میں بیٹھا اظہار خیال کر رہا ہے۔ کتابیات سے مصنف کی محنت شاقہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

کاش کوئی ایک ایسا قومی ادارہ ہوتا جو ایک طرف ہماری علاقائی زبانوں کے تقابلی جائزہ کو

فروغ دیتا اور تعلیمی ادارے ایسے مقالات پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری دیتے اور دوسری طرف اسلامی دنیا کے مشاہیر پر اسی طرح کے تحقیقی اور تقابلی مضامین لکھوا کر عربی، فارسی، ترکی و دیگر زبانوں سے اردو میں ترجمہ کرائے جاتے۔ اس طرح ہمارے قومی اثاثہ میں گراں قدر اضافہ اور مسلم ممالک کے درمیان باہم ایک رشتۂ اخوت بھی استوار ہوتا۔ ساتھ ساتھ یہ خیال بھی آرہا ہے کہ جب ہم اپنے تہذیبی اور ادبی ورثہ سے اپنی نئی نسل کو روشناس کرانے کا شعور نہیں رکھتے تو بھلا دوسری زبانوں سے تراجم کرانے کی ہم کو کہاں توفیق ہوسکتی ہے۔ قومی زبان کے فروغ کے سلسلہ میں اداریوں اور مضامین سے صرف ان معاشروں میں کام چل سکتا ہے جہاں رہنما باضمیر اور باشعور ہوں، قوم سے مخلص، قومی زبان سے محبت رکھتے ہوں قوم میں شرح خواندگی کے اضافہ کے لیے کوشاں ہوں۔ جہاں اربابِ بست و کشاد کا مقصد صرف اور صرف ذاتی اغراض ہوں وہاں علم و ادب اور زبان و ثقافت پر بھلا کون توجہ دیگا۔

سابقہ شمارے جو میں نے انٹرنیٹ پر پڑھے ہیں ان میں اور حالیہ شمارہ میں بھی اقبالیات کی مختلف جہات پر بہت سیر حاصل مقالات پڑھنے کو میسر آئے اور یقیناً وہ مطالعۂ اقبال میں ایک گراں قدر اضافہ ہیں۔ مبارک باد قبول فرمائیے۔

ایک تجویز پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں اور امید ہے کہ بزمِ الاقربا میں میرے ہم خیال بھی ضرور ہونگے۔ اس مجلّہ میں کم سے کم ایک مزاحیہ مضمون، غزل یا نظم بھی شامل کردیا کیجئے تاکہ سنجیدہ ادب کے مطالعہ کے ساتھ ساتھ قارئین کو کچھ مسکرانے کا موقع مل سکے اور شاید تنوع بھی اس بات کا متقاضی ہے۔ جس طرح آپ دسترخوان پر مختلف رنگ اور ذائقوں کے کھانے دیکھنا اور کھانا پسند کرتے ہیں اسی طرح ادبی دسترخوان پر بھی قارئین کے لیے انواع و اقسام کی تخلیقات کے شانہ بہ شانہ معیاری طنز و مزاح کی گنجائش بھی ایک خوش آیند خیال ہے۔

محمد طارق غازی۔ ایسٹ پارک (کینڈا)

ایک ہفتہ قبل ہی 'رمضان مبارک' قبول فرمائیے! میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس ماہِ مبارک

میں آپ اور آپ کے اہلِ خانہ۔احباب و اعزاء اور اُمتِ مسلمہ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائے (آمین)

مجھے افسوس ہے کہ میں قبل ازیں ''الاقربا'' کی وصولی سے مطلع نہ کر سکا۔ مجھے یہ مجلّہ اپنے نئے پتہ پر موصول ہو چکا ہے جب کہ بیک وقت نئی دہلی سے بھی ایک سہ ماہی موصول ہوا جسے میرے آٹوا کے پرانے پتہ سے منتقل کیا گیا۔ میں نے ایک ہی دن اور ایک ہی وقت میں ہر دو مجلّات کی انتظامیہ کو مطلع کیا تھا۔ یہی مزید ایک لفظ کہے بغیر بہت کچھ بتا رہا ہے احترامات کے ساتھ!

سیّدہ نغمہ زیدی۔ پشاور

۲۰۱۴ء کا سالنامہ موصول ہوا۔ حسبِ سابق تمام مقالات و مضامین معیاری، دلچسپ اور معلومات افزا تھے۔ مگر اُردو زبان کے بارے میں آپ کا فرانگیز و دردانگیز مقالہ' افتتاحیہ ظاہر کر رہا ہے کہ قومی بے حسی کے اس دور میں آپ اُردو زبان کے لیے کس قدر دردمندی کے ساتھ سنجیدہ کاوشوں میں مصروف ہیں۔ جب کہ اربابِ اقتدار بین الاقوامی سازشوں کا تدارک کرنے کے بجائے خود زبان اردو کے چراغ کو گل کرنے کی مذموم کوششوں میں شریک محسوس ہوتے ہیں۔ گویا' اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے'

انفرادی و اجتماعی طور پر زبان کے معاملے میں ہماری قومی غیرت سو چکی ہے ہمارے تعلیمی نظام کی زبوں حالی کا سبب زبانِ غیر ہی ہے۔ جس سے شرحِ آرزو نہیں ہو سکتی۔ زبان کے مسائل کے حل کے لیے جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ قومی زبان کو نافذ کرنے اور ذریعہ تعلیم بنانے کے لیے باقاعدہ تحریک کا آغاز کیا جائے۔ اور خاص طور پر ٹی۔ وی چینلز کے ذریعے ایسے پروگرام نشر کیے جائیں جو اربابِ اختیار کی توجہ زبان کے مسائل کے حل کی طرف راغب کر سکیں۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں ہر مسئلے پر ٹی۔ وی۔ چینلز پر بحث و مباحثہ نظر آتا ہے۔ مگر زبان اردو کی طرف ہمارے میڈیا نے بھی ابھی تک کوئی توجہ نہیں دی ہے۔ جب تک ہم بحیثیت قوم

اپنے مسائل کا حل خود تلاش نہیں کریں گے استعماری طاقتیں ہمیں ہر لحاظ سے تباہ و برباد کرتی رہیں گی۔ علاقائی زبانوں کو غیر ضروری اہمیت دینا اور قومی زبان کا درجہ دے دینا بھی ان سازشوں کا ایک حصّہ ہے۔ آپ نے اپنے مقالے میں جو اعداد و شمار پیش کیے ہیں وہ بھی ایک عام قاری کے لیے نہایت معلومات افزا ہیں۔ آپ کی کوششیں انشاءاللہ ضرور رنگ لائیں گی اور زبان اُردو کو اس کا کھویا ہوا مقام ضرور ملے گا۔ مگر حقیقت یہ بھی ہے اس ملک میں جہاں سیاست پیچ و تاب اور انتشار کا شکار ہے اور قوم کی کشتی ہچکولے کھا رہی ہے اور بقا کی جنگ لڑی جا رہی ہے۔ ایسے میں زبان کے نازک مسائل کی طرف توجہ کون دے گا۔ صرف دُعا و امید ہی کر سکتے ہیں کہ مسائل کی نشان دہی پر ہمارے قومی ادارے حرکت میں آئیں اور اپنی پالیسیوں میں اصلاحات لائیں۔

عالمی ادب پر مبنی تمام مقالات بے حد پسند آئے۔ مگر مسلم شمیم صاحب کے مضمون حیاتِ فیض۔ جہات فیض نے دل کو چھو لیا۔ اور فیض صاحب کی نجی زندگی کے واقعات سے بھی آگاہی حاصل ہوئی میرے نزدیک فیض کی شاعری و شخصیت سے محبت ہر پاکستانی کے دل میں ایمان کی طرح موجود ہونی چاہیے۔ کیونکہ وہ ہمارا قومی ورثہ و سرمایہ ہیں۔

جناب پروفیسر لئیق احمد خاں کی وفات ایک قومی نقصان ہے اُن جیسے علم و ادب کے ستارے موجودہ زمانے میں کم یاب ہیں۔ علم و ادب کی ترویج و ترقی میں ان کا کردار نا قابلِ فراموش رہے گا۔ اللہ تعالیٰ اُن کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ میری اور اہل خانہ کی طرف سے تعزیت قبول فرمائیں۔ مرحوم کی مغفرت کے لیے دُعا گو ہوں۔ جناب نظر علی زیدی کی وفات کا پڑھ کر بھی بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اہلِ خاندان کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور ان کی مغفرت فرمائے۔ آپ کے رسالے کے توسط سے تمام اراکین الاقربا کو اُن کی خوشیوں پر مبارکباد پیش کرتی ہوں۔ اللہ تعالیٰ انھیں دائمی خوشیاں عطا فرمائے۔

آپ حقیقتاً مبارک باد کے مستحق ہیں کہ آپ کی شبانہ روز محنت کی بدولت الاقربا ایک ممتاز و منفرد مقام حاصل کر چکا ہے۔ اور اردو ادب کی تاریخی دستاویز کے طور پر کام آئے گا۔ مضمون کی

اشاعت پر شکر گزار ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو صحت و طویل عمر عطا فرمائے۔

ڈاکٹر مظہر حامد۔ کراچی

الاقرباء سالنامہ ۲۰۱۴ء جلد نمبر ۱۷ شمارہ نمبر ۱ موصول ہوا تحریر کردہ مضمون ''اقبال کے بعد طویل نظم'' ایک جائزہ اشاعت کے لمس سے آشنا ہوا۔ سراپا سپاس گزار ہوں۔

عرض یہ ہے کہ اس شمارے میں صفحہ ۱۷۴ پر ادارے کا یہ کہنا کہ مقالہ نگار ''ناقدر شناس'' ترکیب کی تصحیح فرمالیں۔ اوّل تو یہ ترکیب میری وضع کردہ نہیں جعفر طاہؔر کے مصرعہ کو ''ادبی دنیا کے شمارے میں منظوم ڈراما ''معجزۂ فن'' میں دیکھا جا سکتا ہے۔ دوسرا جملہ معترضہ: ادارے نے مصرعہ پر اصلاح بھی دے دی۔ یہ کہتے ہوئے کہ اصل مصرعہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اصل مصرعہ کچھ اس طرح ہو ''یوں قدر ناشناسوں سے ملتا نہیں طاہؔر'' میں کیونکر تصحیح کرلوں۔ جعفر طاہؔر کے مصرعہ میں ترمیم و تنسیخ کا حق مجھے حاصل نہیں۔ ☆ الاقرباء کا معیار قابل تعریف ہے تبصرہ کے لیے اپنے شعری مجموعے ''وقت کی دہلیز پر'' ارسال کی تھی۔ توجہ کا طالب !

عثمانہ اختر جمال۔ گلبرٹ، ایریزونا (امریکہ)

خوبصورت تخلیقات سے آراستہ الاقربا کا سالنامہ دستیاب ہوا۔ سید منصور عاقل صاحب، مشیرانِ اعلیٰ اور مجلس ادارت کے اراکین کو بہت بہت مبارک باد۔ سب ہی مشمولات بہت خوب ہیں۔ یہ مجلّہ آپ سب خواتین و حضرات کی محنت اور کاوش کا بہت حسین گلدستہ ہے۔ افسانے، عالمی ادب پر خیال افروز تحقیقی مضامین، متفرقات، یادرفتگاں، حمد و نعت، غزلیات، نظمیں، رباعیات، نقد و نظر، غرض سب ہی ادبِ عالیہ کا منتخب نمونہ ہیں۔ یوں تو بہت سے جرائد دعوت مطالعہ دیتے ہیں مگر میرے نزدیک ادبی افق پر صرف دو جریدے اپنی مثال آپ ہیں، ایک الاقربا'' اور دوسرا'' دیدہ ور''

☆ ہم ممنون ہیں کہ فاضل مراسلہ نگار نے اپنے نقطۂ نظر کی صراحت فرما دی جس سے ہم متفق ہیں تاہم مدیر کے یہ فرائضِ منصبی میں شامل ہے کہ مطبوعہ متن میں اغلاط یا تسامحات کی نشان دہی کردی جائے (ادارہ)

اللہ سے دعا ہے کہ یہ دونوں رسالے ہمیشہ اسی آب وتاب کے ساتھ آسمانِ ادب پر دمکتے رہیں۔آمین

مقالۂ افتتاحیہ میں یہ پڑھ کر بہت دکھ ہوا کہ پاکستان کی قومی زبان اردو صرف ۵ فیصد لوگ بولتے ہیں۔اگر یہ شرح خدانخواستہ سچ ہے تو پھر آپ ایسے حکام سے اردو کی سرپرستی کی کیسے توقع رکھ سکتے ہیں جن کی مادری زبان اردو نہ ہو، اِلّا یہ کہ حکومت کے اراکین قومی اقدار کے پاسبان ہوں۔ وہ لوگ جو ایک ملک میں متعدد قومی زبانوں کی ترویج کا نعرہ لگا رہے ہیں یا اس عظیم وشیریں زبان کے لیے دیوناگری، ہندی یا رومن رسم الخط کا راگ الاپ رہے ہیں ذہنی طور پر قطعاً کنگال ہیں۔ اللہ ان کے کاسۂ سر کو مغز انسانی سے نواز دے تو کیا ہی اچھا ہو۔آپ بھی میری طرح دستِ دعا بلند کیجئے۔

زیرِنظر شمارہ میں خصوصی طور پر عالمی ادب کا شعبہ بہت خیال افروز ہے اور قابل قدر تحقیق کا حامل ہے۔''یونس ایمرے'' جیسے صوفی شاعر پر جس کا نام میں نے پہلی مرتبہ سنا ہے اور ممکن ہے بہت سے قارئین بھی میری طرح ان سے نا آشنا ہوں۔اولیس جعفری صاحب کا مضمون بہت دلچسپ اور عالمانہ ہے۔شاعر موصوف کی حمدیہ ونعتیہ نظم کا ترجمہ ''گریۂ شبنم'' خنک وکیف آگیں ہے۔مغرب میں جو اساتذہ اردو ادب پر کام کر رہے ہیں، ان میں کولمبیا یونیورسٹی کی معروف محقق پروفیسر فرانسس پرچٹ کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں، فاضل مصنفہ نے دیارِ مغرب میں غالب شناسی پر ناقابلِ فراموش کام انجام دیا ہے۔رلف رسل کے مطالعۂ غزل پر ان کا مضمون بہت جامع ہے امید ہے آپ آئندہ بھی ان کے اور ان جیسے شہرۂ آفاق اساتذہ کے مضامین کے تراجم شریکِ اشاعت فرماتے رہیں گے۔نطشے پر ماہر لسانیات جناب شاکر کنڈان صاحب کا مضمون اچھا ہے ''کپیڈیا'' جیسے انسائکلوپیڈیا کے علاوہ نطشے پر ''انسائیکلوپیڈیا اوف فلاسوفی'' اور ''کرنٹ بایوگرافی'' میں اس ''مجذوب فرنگی'' کی زندگی اور فکر پر بے پناہ مواد موجود ہے جس سے مزید استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ولی عالم شاہین صاحب کے مضمون ''کینیڈا میں اردو'' پڑھ کر اس لیئے بھی خوشی ہوئی کہ

وہ زبان جو اپنے دیس میں پردیسی ہے، پردیس میں گُل کھلا رہی ہے۔ اسی موضوع پر کینیڈا میں مقیم جیّد عالم جناب ڈاکٹر مظفر اقبال صاحب نے بھی قابلِ قدر مضامین سپردِ قلم فرمائے ہیں۔ اقبالیات پر الاقربا بالتخصیص بہت تحقیقی مضامین فراہم کرتا ہے۔ ڈاکٹر مظہر حامد صاحب اور محترمہ نغمہ زیدی صاحبہ کے مضامین ان کی ندرتِ فکر و اسلوب کے غماز ہیں۔ موخر الذکر کا مقالہ ''اقبال اور اتحاد بین المسلمین'' مسلمانوں کی زبوں حالی، انتشار و افتراق، محکومی، ذہنی غلامی کی من و عن تصویر پیش کر رہا ہے۔ مصنفہ کا یہ جملہ ''اقبال کے نزدیک عالمِ اسلام کا انتشار اہلِ مغرب کی وجہ سے پیدا ہوا ہے اور ان کی کوشش رہی ہے کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا جائے، اور انھیں متحد نہ ہونے دیا جائے'' کس قدر صحیح تجزیہ ہے اور یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں اور قابلِ مذمت ہے کہ ہم بے حس بے ضمیر مسلمان ہی ان کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں۔ کاش ہم اپنی زندگی میں وحشت و بربریت اور ظلم و ستم پر واجب وعدۂ تعزیرِ الٰہی دیکھ سکیں۔ فیض پر مسلم شمیم صاحب کا مضمون سیر حاصل ہے اور شاید ہی کسی ایک رسالہ کے ایک مضمون میں فیض کے فکر و فن کا اس تفصیل سے احاطہ کیا گیا ہو۔ فاضل مصنف کا یہ جملہ محلِ نظر ہے کہ ''دنیا کو تبدیل کرنے کا مارکسی فلسفہ اس وقت تک ہمارے لیئے معنویت کا حامل رہے گا، جب تک انسانوں کے ہاتھوں انسان کا استحصال ہوتا رہیگا'' اور وہ اس لیئے کہ مارکسی فلسفہ خود اپنی تجربہ گاہ میں لاکھوں انسانوں کو موت کے گھاٹ اتارنے اور سائبیریا میں جلاوطن کرنے کے بعد بھی بری طرح ناکام ہوگیا۔ سرور عالم راز صاحب کا مضمون بہت خوب ہے۔ اُن کے تحریر ادبی فورمز پر پڑھتی رہی ہوں۔ ماہر تاریخ نویسی جناب سید انتخاب علی کمال صاحب نے اپنے موضوع سے ہٹ کر ایک مضمون نذرِ قارئین کیا ہے جو بہت خوش آیند ہے۔ شعبہ نظم و غزل اپنی جگہ حسبِ معمول تابناک ہے۔ اختر علی خان چھتاوری صاحب کا منظوم ترجمہ، طارق غازی صاحب، پروین شیر صاحبہ، بہادر شاہ ظفر کے رنگ میں محترمہ صوفیہ انجم تاج صاحبہ، محشر زیدی و ضامن جعفری صاحب کی غزلیں آپ اپنا جواب ہیں۔ اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ دوسرے شعراء کی تخلیقات ممتاز نہیں اس خیال سے کہ مراسلہ طویل نہ ہو جائے، اجازت

چاہوں گی۔ اللہ آپ کو، رفیقان کار اور آپ کی انجمن کے اہل قلم کو سدا شاد و آباد رکھے اور ان کے قلم کا پرچم ہمیشہ لہراتا رہے۔

نزہت اختر حنیف۔ کراچی

سالنامہ ۲۰۱۳ء نظر نواز ہوا۔ آپ کی نوازش کہ آپ نے اس کے قارئین میں مجھے بھی شریک فرمایا۔ نثر و نظم کے اس عطر بیز گل دستہ کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ لائق تعظیم و آفریں ہیں وہ عشاق و پاسبان اردو جو اس مشکل وقت میں اس قدر معیاری رسالہ نکال رہے ہیں۔ قابلِ ستائش ہیں وہ اہل قلم جو اپنی تخلیقات سے نہ صرف وطنِ عزیز میں بلکہ ملک سے باہر بھی اس کے علمی و ادبی امتیاز کو نہ صرف برقرار رکھ رہے ہیں بلکہ اس میں خوش آیند اضافہ فرما رہے ہیں اور خوش نصیب ہیں ہم جیسے قارئین جن کو اس دور میں بھی ایسا صاف ستھرا اور پاکیزہ ادب میسر ہے۔ الاقربا کے بیرونِ ملک پرستاروں کی تحریر دیکھ کر اس لیئے بھی خوشی ہوتی ہے کہ وہ زبان جو اپنے ملک میں کسمپرسی کا شکار ہے، آسٹریلیا، یورپ، امریکہ، کینیڈا اور مشرقِ وسطیٰ میں ماشااللہ پھل پھول رہی ہے۔ طارق غازی صاحب کے سلطنت عثمانیہ پر تاریخی مضامین اس موضوع پر اپنا جواب آپ ہیں۔ عرصہ سے پروفیسر غلام شبیر رانا صاحب کی تحریر نظر نہیں آئی۔ امید ہے آئندہ ان کی تحریر میسر آسکے گی۔ ان کا اسلوب نگارش پُرکشش ہے۔ ڈاکٹر آصف طارق صاحب کی محاورہ بندی اور ٹکسالی زبان ہمیں اپنی گم شدہ تہذیب کی یاد دلاتی ہے۔

ڈاکٹر خلیل طوقار صاحب کی تحریر بھی بہت عرصہ سے نظر نہیں آئی۔ الاقربا کا ہر ایک گوشہ ایک بے بہا خزانہ ہے۔ عالمی ادب پر صوفی ترک شاعر کا نام پہلی مرتبہ سنا ہے اور یہ بات کس قدر قابل فخر ہے کہ مسلم ممالک کا تہذیبی و ادبی سرمایہ ایک قوس قزح کی طرح بے حد دلفریب و خوش رنگ اور باہم مربوط ہے۔ شفق ہاشمی صاحب نے سورۂ رحمان کے ترجمہ کی ایک کامیاب کوشش کی ہے اسی طرح اختر علی خان چھتاروی صاحب نے حضرت علی کرم اللہ وجہ کے کلام کا جو منظوم ترجمہ کیا ہے اس میں عربی زبان کی بلاغت اور معنی آفرینی صاف جھلک رہی ہے۔ اویس جعفری صاحب نے

ترک صوفی شاعر سے ماخوز جو "گریۂ شبنم" نظم سپرد قلم کی ہے اس میں غضب کی روانی اور نغمگی کے علاوہ کمال کی پاکیزگی جھلکتی ہے۔ حمد ونعت کا شعبہ حسب معمول وجد آفریں ہے۔ آپ کے بیشتر غزل گو شعرا معروف وممتاز ہیں۔ مسلم شمیم صاحب کا فیض پر مضمون تفصیلی اور سیر حاصل ہے۔ سرور عالم راز صاحب کا مضمون نوعیت کے اعتبار سے دلچسپ اور منفرد ہے۔ آپ جدا ہونے والوں کا "یادرفتگاں" میں جو مقام متعین کرتے اور ان کو فراموش نہیں ہونے دیتے ہیں یہ تاریخ ادب کی تدوین کا ایک خاموش کارنامہ ہے۔ "نقد ونظر" میں معیاری کتابوں پر تبصرہ نگاروں کی تحریر سے کتاب کی جانب ایک روشندان کھل جاتا ہے اور بے ساختہ دل چاہتا ہے کہ کتاب حاصل کی جائے۔ مراسلات شریک اشاعت تحریروں پر مزید روشنی ڈالتے اور شعراء ومصنفین کے فن پر تنقید یا توصیف کے مخفی گوشوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور اس طرح مراسلہ نگار کی آنکھ سے متذکرہ تحریر کو پڑھنے اور پرکھنے کا موقع ملتا ہے اور دوسرے گوشوں کی طرح یہ بھی رسالہ کا ایک قابل قدر گوشہ ہے۔ "گھریلو چٹکلوں" کا جواب نہیں، اس لیئے کہ یہ نسلاً بعد نسلاً آزمودہ اور تیر بہدف کم خرچ بالا نشیں نسخے ہیں۔ سیدہ سارہ سلمان کو آفریں۔ میں کافی عرصہ سے آپ کی مقروض تھی آج یہ مراسلہ لکھ کر طبیعت بہت ہلکی ہوئی ہے تحسین ومبارکباد کے ساتھ اجازت دیجیے۔ ایک اور گزارش کرتی چلوں اور وہ یہ کہ الاقرباء کے معیار کا کوئی اور رسالہ آپ کی نظر میں ہو تو نشاندہی فرمایئے، اس لیے کہ اب اچھے اور منتخب رسالے پڑھنا ہی میرا شوق ومشغلہ ہے۔

کرامت بخاری۔ لاہور

الاقرباء جب سے موصول ہوا ہے زیر مطالعہ ہے، عالمی ادب میں نطشے اور رلف رسل کے حوالے سے بہت اچھی تحریریں سامنے آئی ہیں۔ سید نغمہ زیدی کا اقبال اور اتحاد بین المسلمین بہت اچھی کاوش ہے۔ برادرم مسلم شمیم کی تحریر بھی فیض شناسی کے لیے ایک اہم تحریر ہے۔ یگانہ میرے پسندیدہ شاعر ہیں احمد انصاری صاحب نے بہت اچھا کیا کہ اُن کو یاد کیا۔ منظومات اور غزلوں میں مشکور صاحب، حسن عسکری صاحب، صفدر جعفری صاحب، سحر انصاری صاحب، امین راحت

صاحب، اویس جعفری صاحب، ہمیشہ کی طرح تر و تازہ نظر آئے، اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

مراسلات کی اہمیت سے کون انکار کرسکتا ہے یہ وہ Feed Back ہے جو تاثراتی تنقید کے ذیل میں آتی ہے۔ بہت سارے ریکارڈ درست ہوتے ہیں اور بہت سے مغالطے دور ہوجاتے ہیں۔ احوال و کوائف زندگی ہیں اور زندگی سے پیار از بس ضروری ہے گھریلو چٹکلے ایک فائدہ مند اور انتہائی اہم حصہ ہے اس میں مزید اضافہ ہونا چاہیئے تاکہ صدیوں کی حکمت نئی نسل تک پہنچے۔

فرخ جمال ملیح آبادی۔ اسلام آباد

سب سے پہلے تو میں آپ کا نہائت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے الاقرباء کے تین بہترین نسخے عطا فرمائے اور مجھ کم علم کو اس قابل جانا کہ اتنے قیمتی اور علمی سہ ماہی کو میری نظر کے قابل سمجھا۔ آپ نے جن ادبی اداریوں کو کتابی شکل میں سمو دیا ہے، اُس کی نظیر نہیں ملتی۔ میری نظر سے ''حرفِ معتبر'' کے اداریئے گزرے! غالبؔ، اقبالؔ اور فیضؔ سمیت تقریباً تمام ترقی پسند شعراء اور ادباء کا احاطہ کیئے ہوئے ہیں۔ آپ کے تحریر کردہ۔ اداریئے جہاں اہلِ قلم کی پذیرائی کرتے ہیں، وہاں علم و ادب کے تمام رموز کو بھی حیطۂ خیال میں لاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کی صحت اور زندگی میں برکت دے۔ اور آپ کے قلم میں مزید تاثیر پیدا کردے۔ میں اس قدر انمول اور بیش بہا علمی و ادبی خزانوں کو اجاگر کرنے پر آپ کو مبارکباد پیش کرتا ہوں!

محمد فیصل مقبول عجز۔ لاہور

امید ہے آپ بہ خیریت ہوں گے۔ چند دن قبل ادبی و علمی جریدہ ''الاقربا'' کا تازہ شمارہ اور تنقیدی مضامین کا مجموعہ ''متاعِ فکر و نظر'' موصول ہوا۔ میں تہہ دل سے آپ کی ادب پروری اور ادبی خدمات کا معترف ہوں۔ بلا شبہ اس دور میں آپ کی علمی و ادبی شخصیت شجرِ سایہ دار ہے۔ مصروفیت کے سبب خط لکھنے میں تاخیر ہوئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دُعا گو ہوں کہ خُدا آپ کے علم اور صحت میں برکت عطا فرمائے۔ آپ کے جریدہ کے لیے دو غزلیں ارسال کر رہا ہوں امید ہے آپ اپنی مشفقانہ رائے سے آگاہ کریں گے۔ دعاؤں میں یاد رکھیں۔

صابرعظیم آبادی۔ کراچی

امید کہ مزاج عالی بخیر ہوں گے۔ الاقرباء کا سالنامہ ۲۰۱۴ موصول ہوا۔ زیرِ نظر شمارے میں تمام مشمولات جامع اور معیاری ہیں۔ خاص طور پر محمد اویس جعفری صاحب کا مضمون ''یونس اُمرے۔ عظیم ترک صوفی شاعر'' ایک عمدہ مضمون ہے انہوں نے شاعر موصوف کی شاعری کا احسن طریقے سے احاطہ کیا ہے۔ شاکر کنڈان صاحب کا مضمون ''رائد سیف وقلم نطشے'' بھی بڑی عرق ریزی سے لکھا گیا ہے۔ اس میں انہوں نے نطشے کے بہت سے پوشیدہ باب وا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ولی عالم شاہین کے مضمون سے کینیڈا کے شاعر وادیب، افسانہ نگار، مضمون نگار اور تنقید نگار حضرات کے بارے میں بہت معلومات ہوئیں۔ ایسے دُور دراز ملک میں اردو کا پھلنا پھولنا معجزہ سے کم نہیں۔ منظومات کا حصّہ بہت جاندار ہے۔

سید ابرار حسین کے شعری مجموعہ پر سید منصور عاقل صاحب کا تبصرہ پسند آیا۔ چند تخلیقات حاضرِ خدمت ہیں اور امید کہ پسندِ خاطر ہوں گی۔ باقی سب خیریت ہے تمام احباب کو میرا سلام۔

نوید سروش۔ میرپور خاص (سندھ)

''الاقربا'' کا تازہ شمارہ (سال نامہ ۲۰۱۴ء جنوری تا جون) باصرہ نواز ہوا۔ ہر شمارے کی طرح یہ شمارہ بھی بامعنی اداریے اور علمی وادبی تحریروں سے مزین ہے۔ ''لسانی مباحث اور مادری زبان'' (مقالہ افتتاحیہ) اداریہ ایک فکر انگیز تحریر ہے۔ اس مقالے سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ مغرب کس کس طرح مشرقی (خصوصاً اسلامی) ممالک اور ایشیائی زبانوں خصوصاً اردو زبان سے تعصب برت رہا ہے۔ غیر جانب داری انصاف اور حقوق کا نعرہ لگانے والے بین الاقوامی ادارے اپنی مرضی کے سروے سے گمراہ کررہے ہیں۔ ذرا ملاحظہ کیجیے

''ملک میں ۶ زبانیں سب سے زیادہ بولی جاتی ہیں۔ ۴۴ فی صد پنجابی، ۱۵ فیصد پشتو، ۱۴ فی صد سندھی، ۱۰ فی صد سرائیکی، ۵ فی صد اردو اور ۴ فی صد بلوچی' (ص۔ ۷)

''یونیسکو'' کے اس سروے سے میں بالکل متفق نہیں، ہاں یہ بات درست ہے کہ

"لسانی تقسیم کے ذریعہ پارہ پارہ کر دینے پر عالمی ادارہ کمر بستہ ہو گیا ہے۔۔۔انگریزی رابطہ کی واحد عالمی زبان ہے۔۔۔لسانی عالمگیریت کے ساتھ ساتھ ایک لسانی آمریت کی راہ بھی ہم وار ہو چکی ہے۔"

اور مندرجہ ذیل سطور "یونیسکو" کی گھٹیا اور کھلی متعصبانہ سوچ کی ترجمان ہیں۔

"کم وبیش دنیا کی چھ ارب آبادی میں جو زبان ایک ارب سے زیادہ افراد بولتے ہیں اور سمجھتے ہیں اُس کا نام ہندوستانی ہے حالانکہ اس نام کی زبان بشمول ہندوستان جہاں صرف ہندی، قومی وسرکاری زبان ہے دنیا میں کہیں نہیں پائی جاتی۔" (ص۔۱۰)

"اردو کی جگہ" ہندوستانی کا لفظ استعمال کرنے کے کیا معنیٰ ہیں۔

صدر نشین صاحب یہ مقالہ ملک وقوم اور زبان کی بقا کے حوالے سے بہت اہم ہے اسے کسی کثیر الاشاعت روزنامے کی زینت بھی بننا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ساتھ کوئی دردمند پاکستانی پمفلٹ کی صورت میں شائع کروا کر یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں کے طلبہ وطالبات میں تقسیم کروا کر اس اہم مسئلے اور سازش سے باخبر کرنے کا فریضہ انجام دے یہ قومی خدمت ہوگی۔

محمد اویس جعفری صاحب نے 'یونس اُمرے عظیم صوفی شاعر' کے حالات زندگی اور فنی تجزیے کو احتیاط سے پیش کیا ہے۔ مضمون بہت اہم اور دلچسپ ہے جعفری صاحب گہرا مطالعہ رکھنے اور مطالعے کو سلیقے سے پیش کرنیوالے ادیب ہیں۔ بہت خوب۔ "زلف رسل کا مطالعۂ غزل" میں خوشگواری، نیاپن اور فکری تازگی ہے "کینیڈا میں اردو" دلچسپ اور تحقیقی نوعیت کا مضمون ہے۔ اس مضمون سے کینیڈا میں "اردو زبان وادب" کی صورت حال کا بخوبی علم ہوتا ہے ادب کی مختلف اصناف کا جائزہ، ادبی تقریبات، کینیڈا میں مقیم اہلِ قلم اور بیروں ممالک سے جاتے یا بلائے جانے والے اہل علم وفن کی ادبی خدمات کا تجزیہ اجمالی مگر مستند حوالوں سے پیش کیا گیا ہے۔

شاکر کنڈان صاحب بحیثیت شاعر ونقاد اپنے آپ کو منوا چکے مگر اُن کا اصل میدان "تحقیق" ہے۔ شمارے میں محترم کے دو مضمون "نطشے" اور شاعرِ شباب الطاف مشہدی" ہیں شاکر کنڈان

نے نطشے کی شخصیت کے باطن میں جھانک کر اُن کے فن سے کشید کرنے کی سعی کی ہے۔ بہت خوب، الطاف مشہدی کے کلام کا ایک خاص زاویے سے جائزہ لیا ہے۔ محمد رضا انصاری ''یگانہ سے متعلق کچھ یادیں کچھ باتیں بے ترتیبی کا شکار ہیں۔

پرتو روہیلہ، سحر انصاری، امین راحت چغتائی، پروین شیر، ضامن جعفری اور سلیم زاہد صدیقی کی غزلیں قدیم و جدید آہنگ سے مزین ہیں۔ سید مشکور حسین یاد کی غزلوں کی انفرادیت یہ ہے کہ وہ کبھی ''قوافی'' اور کبھی ''ردیف'' سے مختلف معنی کشید کرتے ہیں۔ انور شعور کی سادگی متاثر کن ہے۔ ''اقبالیات'' میں صرف دو مضمون ہیں مگر دونوں لاجواب ہیں۔ خصوصاً ڈاکٹر مظہر حامد کی تحریر ''اقبال کے بعد طویل نظم ۔۔ ''ایک جائزہ'' ایک اہم اور دلچسپ موضوع ہے ڈاکٹر صاحب نے بڑی محنت اور غیر جانب داری سے قلم اُٹھایا ہے اور اس کا حق بھی ادا کیا ہے

ڈاکٹر احمد اعجاز الدین رحمت علی۔ جزیرہ ماریشس (بحرِ ہند)

الاقرباء کا سالنامہ ۲۰۱۴ء بذریعہ ڈاک نصیب ہوا۔ سرورق عظیم ترک صوفی شاعر کی تصویر دیکھ کر اچھا لگا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ یہ جریدہ حسب معمول دلکش ہی نہیں بلکہ تنوع کا مرقع ہے جس پر اہلِ اردو جتنا بھی فخر کر سکیں کم ہے۔ اس مجلّہ کا ہر شمارہ لائق مطالعہ اور معیاری رہا ہے۔ ماریشس جیسے دور افتادہ ملک میں جہاں اردو زبان ایک ثانوی زبان کی حیثیت سے بولی اور پڑھی جاتی ہے وہاں کے اردو حلقے کے لیے اس میں چھپنے والے مضامین نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں۔ مقالہ افتتاحیہ سے لے کر خبر نامہ والے حصہ تک کی تحریروں کو میں نے حرفاً حرفاً اور سوقاً سبقاً پڑھا۔ ''لسانی مباحث اور مادری زبان۔ چند توجہ طلب حقائق'' کے حوالے سے میری حقیر رائے میں اردو کو صرف پاکستان اور ہندوستان تک محدود کر دینا ایک گمراہ کن رجحان ہو سکتا ہے۔ ماریشس کے مسلمان اردو زبان کو اپنی آبائی زبان سمجھتے ہیں۔ اردو یہاں بھی بولی اور پڑھی جاتی ہے۔ اردو ایک ایسی توانا زبان ہے جو برصغیر کی فصیلوں سے باہر بھی دنیا کے متعدد ملکوں کے لوگوں کا لسانی اور تہذیبی تشخص بھی ہے۔ محمد اویس جعفری صاحب کا مقالہ ''یونس اُمرے، عظیم ترک صوفی شاعر''

دلچسپ اور قابل ستائش ہے۔ مقالہ پڑھنے کے بعد قلق ہوا کہ ایسے آفاقی شاعر سے کس طرح اتنے دنوں تک میں محروم رہا۔ نظم ''گریۂ شبنم'' پڑھ کر اس جلیل القدر شاعر کے کلام کو ترک زبان سے اردو میں منتقل کرنے کے لیے مقالہ نگار مبارک باد کے مستحق ہیں۔ شفق ہاشمی کی سورۃ رحمٰن کا منظوم ترجمہ بھی لاجواب ہے۔ حمدیہ اور نعتیہ کلام کے علاوہ غزلوں اور نظموں کا انتخاب بھی عمدہ ہے۔ میری جانب سے مجلس ادارت ومشاورت کے علاوہ اس شمارے کے تمام قلم کاروں کو نیک خواہشات۔

شمع سیّد۔ لاہور

الاقرباء باقاعدگی سے بھیجنے پر ممنون ہوں۔ موجودہ پرچے میں یونس ایمیرے پر محمد اویس جعفری کی تحریر لاجواب تھی۔ اور شاکر کنڈان کے بارے میں کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے جیسا ہے نطشے اور الطاف مشہدی پر لکھے گئے دونوں مضامین میں اُن کی تحریر و تحقیق میں اس قدر روانی تھی جو بلاشبہ ایک اعلیٰ ترین علمی وادبی شخصیت کی غمازی کرتی ہے۔ ہمیشہ کی طرح ہر تحریر علم وادب کا بہتا ہوا دھارا! اللہ تمام لکھنے والوں کو اور آپ کو طویل عمر اور صحت سے نوازے۔ اپنا ایک افسانہ ارسال کر رہی ہوں۔

خبرنامہ

الاقرباءفاؤنڈیشن

(اراکین کیلئے)

مرتبہ
شہلا احمد

احوال وکوائف

○۔شادی خانہ آبادی:

الاقرباء فاؤنڈیشن کے سابق سیکریٹری جنرل جناب سید نعیم احمد و بیگم عظمیٰ نعیم کی دختر نیک اختر سیدہ مریم احمد الحمدُ اللہ مورخہ ۸ جون ۲۰۱۴ بروز اتوار شادی کے مبارک بندھن میں بندھ گئیں۔ ان کے شریک حیات عزیزی عمر رشید، مرزا عبدالرشید صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ شادی کی پُر وقار تقریب کا اہتمام منال اسلام آباد میں کیا گیا تھا جس میں عزیز و اقارب، احباب اور مجلسِ منتظمہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے اراکین نے شرکت کی۔ اس مبارک و خوبصورت موقع پر ادارہ سہ ماہی الاقرباء جناب و بیگم سید نعیم احمد اور جملہ اہلِ خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جیون کے اس حسین سفر میں سیدہ مریم احمد اور عزیزی عمر رشید کو ہمیشہ خوش وخرم اور شادوآباد رکھے۔ آمین۔

○ مبارک بندھن:

رکن مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن جناب حسن سجاد و بیگم عالیہ حسن صاحبہ کی صاحبزادی سمیّہ حسن الحمدُ اللہ مورخہ ۲۱ جون ۲۰۱۴ بروز ہفتہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئیں۔ ان کے شریک حیات عزیزی سلیمان، ڈاکٹر محبوب احمد ملک کے صاحبزادے ہیں۔ شادی کی تقریب دی ویڈنگس مرکز اسلام آباد میں نہایت خوبصورت و پُر وقار انداز میں منعقد کی گئی تھی۔ جس میں عزیز و اقارب اور احباب کے علاوہ مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کے اراکین نے شرکت کی۔ اللہ تعالیٰ زندگی کے اس حسین سفر میں دلہا و دلہن کو ہمیشہ شادوآباد رکھے۔ آمین۔ ادارہ سہ ماہی کی طرف سے جناب و بیگم حسن سجاد اور جملہ اہلِ خانہ کو دلی مبارکباد۔

○۔ماریہ صابری صاحبہ کا دورۂ ہانگ کانگ :

ماریہ صابری صاحبہ رکنِ مجلسِ انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کافی عرصے سے پاکستان گرل گائیڈز سے منسلک ہیں۔آج کل وہ انٹرنیشنل گرل گائیڈز کمشنر کی حیثیت سے فرائض کی انجام دہی میں مصروف ہیں۔گذشتہ دنوں وہ ورلڈ گرل گائیڈز ایسوسی ایشین کے زیر اہتمام منعقدہ کانفرنس میں شرکت کے لیے ہانگ کانگ تشریف لے گئی تھیں۔یہ کانفرنس ہر تین سال بعد منعقد کی جاتی ہے۔یہ اس سلسلے کی پینتیسویں (۳۵ویں) کانفرنس تھی۔اس میں ایک سودس (۱۱۰) ممالک سے آٹھ سو پچاس (۸۵۰) ڈیلی گیٹس شریک ہوئے۔جنھوں نے اپنے اپنے ملک کی کارکردگی کے حوالے سے وہاں گفت وشنید کی۔ماریہ صاحبہ نے اس ضمن میں پاکستان کی نمائندگی کی۔۔۔وہاں ان کا قیام ایک ہفتہ رہا۔

○۔جناب جی۔اے صابری کی امریکہ روانگی:

جناب جی۔اے صابری سینیئر نائب صدر الاقرباء فاؤنڈیشن گزشتہ ماہ جولائی ۲۰۱۴ کو اپنے صاحبزادے مصعب صابری کے MCGILL یونیورسٹی مانٹریال میں داخلے کے سلسلے میں امریکہ تشریف لے گئے ہیں۔عزیزی مصعب اس یونیورسٹی سے انشاء اللہ MBA کریں گے۔اللہ تعالیٰ انہیں اپنے مقصد میں کامیاب کرے۔آمین۔۔صابری صاحب کا امریکہ میں تقریباً دو ماہ قیام رہے گا۔اس عرصہ میں وہ تہذیب الاخلاق ٹرسٹ کے لیے فنڈ ریزنگ پر بھی کام کریں گے۔صابری صاحب تہذیب الاخلاق ٹرسٹ لاہور سے منسلک ہیں۔وہ اس ادارے کو بہتر سے بہتر بنانے کے لیے کوششوں میں خود کو مصروف رکھتے ہیں۔اللہ تعالیٰ انہیں ان کے نیک مقاصد میں کامیاب کرے۔آمین

○۔انتقال پر ملال:

بیگم ناہید منصور صاحبہ اہلیہ منصور عاقل صاحب کی حقیقی خالہ زاد بہن کشور افسر الزماں صدیقی

انتقال فرما گئیں۔ اناللہ و اناالیہ راجعون ۔۔۔ وہ کافی عرصہ سے شوگر کی مریضہ تھیں جس سے ان کے گردے فیل ہو گئے تھے۔ اسی دوران وہ گر گئیں جس سے ٹانگ میں شدید چوٹ آئی۔ وہ برداشت نہ کر سکیں۔ اور ہارٹ اٹیک ہو گیا۔ جو اتنا شدید تھا کہ وہ جانبر نہ ہو سکیں اور خالق حقیقی سے جا ملیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے درجات بلند کرے اور جنت الفردوس میں جگہ دے اور جملہ لواحقین کو صبر جمیل عطاء فرمائے۔ آمین

○ دعائے صحت کے لیے درخواست:

سابق سیکریٹری جنرل الاقرباء فاؤنڈیشن جناب نعیم احمد کی خوشدامن صاحبہ و والدہ عظمیٰ نعیم عرصہ تین ماہ سے شدید علیل ہیں۔ قارئین کرام واحباب سے استدعا ہے کہ ان کی صحتِ کاملہ کے لیے دعا فرمائیں۔ آمین۔ شکریہ۔

○۔ جنرل اختر وحید کی علالت وصحت یابی:

گزشتہ دنوں ممبر مجلسِ انتظامیہ بیگم طیبہ آفتاب صاحبہ کے داماد جنرل اختر وحید کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ دل میں شدید تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ فوری طور پر ہسپتال لے جایا گیا۔ جہاں ٹیسٹ کرنے پر ڈاکٹرز نے بتایا کہ ان کے دل کی شریانیں کئی جگہ سے بلاک ہیں۔ لہٰذا فوری آپریشن کیا گیا۔ اور سات Stunts ان کے ڈالے گئے۔ کافی دن ہسپتال میں رہے۔ اب گھر آ گئے ہیں طبیعت آہستہ آہستہ بہتر ہو رہی ہے۔ تاہم کمزوری کی وجہ سے ڈاکٹرز نے انتہائی احتیاط کا مشورہ دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلد از جلد انہیں صحتِ کاملہ عطاء فرمائے۔ آمین

○۔ تعلیمی شعبہ میں بہترین کارگردی کے حامل پھول اور کلیاں:

ممبر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب اطہر اسلام احمد و بیگم مریم اطہر کی تینوں صاحبزادیاں ماشاء اللہ حسب سابق اس سال بھی سالانہ امتحانات میں سرفہرست رہیں۔ حیاء اطہر نے اس سال کلاس چہارم میں ۹۵ فی صد نمبر حاصل کیئے۔ جب کہ Maths میں بہترین کارکردگی رہی انہوں نے

۹۹ فی صد نمبر حاصل کیے اور تعریفی سرٹیفکٹ حاصل کیا۔حریم اطہر نے بھی امتحان میں اعلیٰ ترین کارکردگی دکھائی انہوں نے ۹۸ فی صد نمبر حاصل کئے۔اور تمام مضامین بہترین نمبروں کے ساتھ پاس کئے اور "All rounder" کا توصیفی سرٹیفکٹ حاصل کیا۔انہوں نے دوئم کلاس پاس کی ہے۔اب کلاس سوئم کی طالبہ ہیں۔ان ہی کی تیسری اور چھوٹی بہن ہانیہ اطہر ہیں۔یہ اپنی کلاس کی بہترین آل راؤنڈر ہیں۔تمام ٹیچرز ان کو ہاتھوں میں رکھتی ہیں۔یہ فرسٹ کلاس میں نرسری (Nursury) پاس کر کے K.G میں آئی ہیں۔یہ تینوں بہنیں IGSIS اسکول کی بہترین طالبات میں شمار ہوتی ہیں۔

☆ جناب خالد راحیل رکن الاقرباء فاؤنڈیشن کی ہونہار بیٹی طیبہ خالد نے کلاس 6th میں ۸۸،۸۸٪ فی صد نمبر حاصل کئے اور سرفہرست رہیں۔اس کے علاوہ کئی توصیفی سرٹیفکٹ بھی حاصل کئے۔ان کا شمار بھی IGSIS اسکول کی ہونہار طالبات میں ہوتا ہے۔ان کی دوسری بہن طوبیٰ خالد نے کلاس 4 th میں ۹۶ فی صد نمبر حاصل کیے اور بہترین طالبہ کے خطاب کے ساتھ کلاس 5th میں آگئیں۔اور اب ہیں ریحان جان خالد۔یہ کلاس دوئم میں ۹۲ فی صدی نمبر لے کر پاس ہوئے اور کلاس سوئم کے طالب علم بن گئے۔انہوں نے بھی Maths میں فل نمبر حاصل کئے۔۔۔ادارہ سہ ماہی تمام بچوں کی امتحان میں شاندار کامیابی پر جناب و بیگم اطہر اسلام احمد اور جناب و بیگم خالد راحیل کو دلی مبارکباد پیش کرتے ہوئے بچوں کی مستقبل میں بھی بہترین کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

☆ ثمر فاطمہ سالاری، جناب مدثر اللہ سالاری و بیگم ڈاکٹر لبنیٰ سالاری اراکین مجلس انتظامیہ الاقرباء فاؤنڈیشن کی صاحبزادی ہیں۔اسلام آباد کانونٹ اسکول کی بہترین طالبات میں ان کا شمار ہوتا ہے۔اس سال بھی انہوں نے اپنا سابقہ ریکارڈ قائم رکھا اور کلاس 4th میں ۹۵ فی صد نمبروں کے ساتھ پاس کر کے کلاس 5th میں پہنچ گئیں۔ادارہ سہ ماہی الاقربا شاندار کامیابی پر انہیں اور جناب مدثر سالاری و بیگم لبنیٰ سالاری کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے۔اللہ تعالیٰ ثمر فاطمہ کو مستقبل میں

بھی کامیابیوں سے نوازے۔ آمین

O۔ نصابی و ہم نصابی سرگرمیوں پر اعلیٰ اعزازات

صدر الاقرباء فاؤنڈیشن جناب منصور عاقل کے خانوادے کی تیسری نسل یعنی اولاد در اولاد بھی ماشاء اللہ اپنی ذہانت اور قابلیت سے اپنے بڑوں کی روایات کو روشن تر بنا رہے ہیں۔ اس بار عزیزی حارث منصور نے جن اعزازات کے ساتھ چوتھی جماعت کا امتحان پاس کیا ہے اُس نے اُن کے ہم جماعتوں میں اُن کا سکہ جما دیا ہے انھوں نے تقریباً تمام ہی مضامین میں حسب سابق +A اور A گریڈ لے کر کامیابی کا ریکارڈ قائم رکھا جن میں اسلامیات۔ انگریزی ادب۔ انگریزی زبان۔ اردو ادب اور اردو زبان۔ میتھامیٹکس۔ لازمی مطالعات۔ سائنس۔ پاکستان سٹڈیز بھی شامل ہیں۔ بلکہ دیگر اعزازات مثلاً بہترین مقرر ایوارڈ (Best Speaker Award) لیڈرشپ ایوارڈ اور تقریبات میں گرمجوشی سے شرکت کا سرٹیفکیٹ۔ اس کے علاوہ اُنھیں اپنی کلاس میں ذہین ترین۔ مہذب اور گفتگو میں اپنے خیالات کے اظہار پر مکمل طور پر خود اعتمادی کا حامل قرار دیا گیا۔ ادارہ سہ ماہی 'الاقرباء' اس غیر معمولی کامیابی پر عزیزی حارث منصور اور اہلِ خانہ کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہے اور مستقبل میں مزید کامیابیوں کے لیے دعا گو ہے۔

عزیزی حارث نے اپنے والدین کے ہمراہ حالیہ بیرونِ ملک سفر کے دوران دنیا کے عظیم ترین آبشار Niagara. Fall کی سیر سے متعلق جو مختصر رپورٹ بھیجی تھی وہ ہم نذرِ قارئین کر رہے ہیں۔

MY VISIT TO NIAGRA FALLS

On 23rd June,2014. I mama and baba went to visit the Niagra Falls. We had so much fun. On our way to Niagra, we were lost in the start because mama was driving the car. Then we opened the Google Maps on mama's cell phone. We wrote

the address on mama's cell phone and then, after 15 minutes, we finally reached the Nagra. First, we went to the Niagra centre. Then we went to get tickets for the boat ride in Niagra water but we could not get them because mama and baba said that it was too late. So we went to Niagra city. We had fun there. After 2 hours, we came back home and the story finishes here HARIS

بیگم طیبہ آفتاب

گھریلو چٹکلے

O میتھی کے بیج کے فائدے

میتھی کے بیجوں کو پانی میں پیس کر ہفتہ میں کم از کم دو بار ایک گھنٹہ سر پر لگانے سے بال لمبے اور گھنے ہوتے ہیں ایک گھنٹہ لگانے کے بعد سر دھولیں۔

O شوگر کے مرض میں میتھی کے فائدے

میتھی کے بیج دل اور ذیابیطس کے مرض میں مفید ہیں روزانہ ۲۰ گرام میتھی کے بیج پیس کر کھانے سے صرف ۱۰ دن میں پیشاب اور خون میں شوگر کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ (دس دن کے بعد مریض کو اپنا شوگر کا ٹیسٹ ضرور کرالینا چاہیئے۔)

O گرم پانی سے غسل

گھبراہٹ اور بے چینی میں انسان نیم گرم پانی سے غسل کرے تو اُسے سکون ملتا ہے۔ پانی کی حرارت ہمارے تنے ہوئے اعصاب کو اعتدال پر لے آتی ہے مزید برآں ہمارے اعصابی نظام کو بھی سکون مہیا کرتی ہے

O دل کی نالیاں کھولنے کا آزمودہ نسخہ

اگر آپ کے دل کی نالیاں بند ہیں تو اس نسخہ پر عمل کریں۔ (۱) ایک پیالی لہسن چھلا ہوا (۲) ایک پیالی سیب کا سرکہ (۳) ایک پیالی ادرک چھلا ہوا ان کو پانی میں ڈال کر گرائنڈ کرلیں۔ (پانی اتنا ڈالیں کہ گرائنڈر چل جائے) جب یہ باریک پس جائے تو دیگچی میں ڈال کر اس کو اتنا پکائیں کہ یہ آدھا رہ جائے۔ پھر ٹھنڈا کر کے اس میں ایک پیالی شہد شامل کرلیں روز صبح ایک چمچ (Table spoon) نہار منہ لیں۔ انشاءاللہ فائدہ ہوگا۔

○ بلڈ پریشر کے لیے

انگور کے سرکے میں لہسن چھیل کر ڈال لیں جس بوتل میں ڈالیں گے اُسے بند کر کے سات دن رکھ دیں سات دن کے بعد ایک لہسن کی توری صبح نہار منہ لیں انشااللہ فائدہ ہوگا۔

○ آم کے اچار کے تیل کا فائدہ

آم کا اچار جتنا پرانا ہوگا اس کا تیل اتنا ہی فائدے مند ہوگا یہ تیل اگر آپ ان لوگوں کے سروں پر لگائیں جن کو گنج ہے تو انشاءاللہ بال نکل آئیں گے۔

○ آم کی گٹھلی کے فائدے

آم کی گٹھلی مسواک کے طور پر استعمال کریں اس سے منہ کی بدبو جاتی رہے گی اور دانت مضبوط اور چمک دار ہو جائیں گے۔

○ آم کی جڑ کا فائدہ

آم کی جڑ کا چھلکا اور برگِ شیشم ایک ایک تولہ لیں اور انہیں ایک سیر پانی میں جوش دیں جب پانی کا تیسرا حصہ رہ جائے تو اس میں تھوڑی سی چینی ملا یئے۔اور نوش کیجئے یہ پیشاب کی بندش کو ختم کرتا ہے۔

○ آم کے پھول کے فائدے

آم کے پھول سائے میں سوکھائیں جب یہ سوکھ جائیں تو ان کا سفوف بنالیں یہ سفوف جب کبھی کسی کو نکسیر آئے تو اس کو نسوار کی طرح ناک میں ڈالیں انشااللہ فائدہ ہوگا۔

○ ادرک کے فائدے

ادرک شریانوں میں خون جمنے یا گاڑھا ہونے سے روکنے والی قدرتی دوا ہے یہی وجہ ہے کہ دل کے مریضوں کے لیے بھی ادرک موثر علاج ہے۔استعمال کا طریقہ یہ ہے کہ تیسرا حصہ

چائے کا چمچہ پسی ہوئی ادرک کھانے کے درمیان دن میں دو مرتبہ لیں۔ انشاءاللہ شیریانوں میں خون کی روانی میں بہتری آئے گی۔

○ سر درد کی صورت میں ادرک کا فائدہ

اس مقصد کے لیے ادرک تھوڑے پانی کے ساتھ سل پر پیس لیں اس کا پیسٹ مریض کی پیشانی پر لگائیں انشاءاللہ فائدہ ہوگا۔

○ نماز کے فائدے اور ورزشیں

نماز پڑھنے سے جہاں بیرونی اعضاء کو خوبصورتی ملتی ہے۔ وہاں دل گردے۔ پھیپھڑے۔ دماغ۔ آنتیں۔ معدہ۔ ریڑھ کی ہڈی۔ گردن اور تمام گلینڈ نشوونما پاتے ہیں۔ بلکہ جسم بھی سڈول ہو جاتا ہے۔

○ ذیابیطس کنٹرول کرنے کے لیے موثر نسخہ (بشکریہ عائشہ فرحان)

اجزاء :

(۱) بادام۔ ۱۰۰ عدد (ایک بھی کڑوانہ ہو) (۲) چھوٹی الائچی ۱۰۰ عدد (۳) کالی مرچ ۱۰۰ عدد (۴) نیم کے پتے ۱۰۰ عدد (سکھالیں) (۵) کالے چنے بھنے ہوئے چھلکے سمیت ایک پاؤ

ترکیب: مندرجہ بالا تمام اشیاء کو باریک پیس کر سفوف بنا کر محفوظ کر لیں اور روزانہ کسی وقت بھی آدھی چمچی چائے کی کھائیں۔ انشاءاللہ فائدہ ہوگا۔